Registered No. L. 4186

جلد ۲۷ } عدد ۱، ۲

محرم
صفر } ۱۳۶۴

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

دارالاسلام جمال پور - پٹھانکوٹ

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قیمت سالانہ ۵ روپے

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اُن مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جنکے تعلق آجکل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً توحید، ہدایت وضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسُول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔ حصّہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد (عہ) علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب وتمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۰۴۲ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/۲/۸ علاوہ محصول ڈاک

فہرست مضامین

جلد ۲۷	رجب، شعبان ۱۳۶۴ھ مطابق جولائی، اگست ۱۹۴۵ء	عدد ۱، ۲

سید ابو الاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دار الاسلام پٹھانکوٹ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن کی پچھلی اشاعت میں تقویٰ پر ہم نے جو مضمون لکھا ہے اس سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ تقویٰ در اصل حدودِ الٰہی کی نگرانی و حفاظت کا نام ہے۔ جو شخص زندگی کے سفر میں، ہر مرحلہ پر، یہ جاننے کی کوشش کرے کہ خدا نے اس کے بڑھنے اور رکنے کے لیے کیا حدود قائم کیے ہیں اور پھر خدا اور روزِ آخرت کے ڈر سے خلوت و جلوت میں ان حدود کی نگرانی کرے اور دیدہ و دانستہ کسی حد کو توڑنے کی جرأت نہ کرے وہ متقی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ بات کس طرح حاصل ہو کہ آدمی اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں، خواہ اس کا تعلق پرائیوٹ زندگی سے ہو یا پبلک سے، مسجد سے ہو یا بازار سے، اخلاق سے ہو یا سیاست سے۔ اسی طرح اپنے سارے معاملات میں، خواہ ان کا تعلق غریب سے ہو یا امیر سے، دوست سے ہو یا دشمن سے، عزیز سے ہو یا بیگانہ سے، علیٰ ہذا القیاس ہر حال میں خواہ غصہ میں ہو یا محبت میں، تنگی میں ہو یا فراخی میں، خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کا اس طرح پابند ہو جائے کہ اگر کبھی جہالت سے بال برابر بھی اس کی پابندی میں فرق آجائے تو ہوش آتے ہی اس وقت تک کے لیے اس پر کھانے اور سونے کی لذت حرام ہو جائے۔ جب تک وہ اپنے غلط سمت میں اٹھائے ہوئے قدم کو واپس نہ لے اور استغفار و توبہ کے ذریعہ سے اصلاح مافات نہ کرلے؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال نہایت اہم ہے۔ اسی سوال کا صحیح جواب دین کے خزانہ کی اصلی کلید ہے۔ اور اسی سوال کے جواب سے یہ بات واضح ہوگی کہ ہماری خانقاہیں، جو تقویٰ پیدا کرنے کا واحد ذریعہ خیال کی جاتی ہیں، اس مقصد کے لیے کس حد تک مفید ہیں؟

دنیا میں انبیاء علیہم السلام کا گروہ وہ گروہ ہے جس کا مخصوص کام ہی تقویٰ کی دعوت اور اس کی تعلیم ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کو ابتدائے وحی میں حکم ہوا کہ یَا اَیُّھَا المُدَّثِّر قُم فَاَنذِر (اے چادر لپیٹنے والے کھڑا ہو اور لوگوں کو ڈرا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذمہ پہلے روز جو کام سپرد کیا گیا یہی تھا کہ وہ فرعون کی قوم کو تقویٰ کی دعوت دیں [اِذ نَادٰی رَبُّکَ مُوسٰی اَنِ ائتِ القَومَ الظّٰلِمِینَ، قَومَ فِرعَونَ اَلَا یَتَّقُونَ] (جب کہ تیرے رب نے پکارا موسیٰ کو کہ ظالم قوم کے پاس جاؤ، فرعون کی قوم کے پاس کیا وہ تقویٰ نہیں اختیار کریں گے۔) حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ ہوا ہے [کَذَّبَت قَومُ نُوحِ المُرسَلِینَ۔ اِذ قَالَ لَھُم اَخُوھُم نُوحٌ اَلَا تَتَّقُونَ۔ اِنِّی لَکُم رَسُولٌ

امین فاتقوا اللہ واطیعون] (نوح کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا، جب کہا ان کے بھائی نوح نے کہ تم تقویٰ نہیں اختیار کرتے، میں تمہارے لیے ایک امین رسول ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو) بعینہٖ یہی بات حضرت ہودؑ کی دعوت میں دو مرتبہ، صالحؑ کی دعوت میں دو مرتبہ اور لوط و شعیب علیہم السلام کی دعوت میں دو دو مرتبہ بیان ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کا بالکل ابتدائی نقطہ ہے۔ ہر نبی جو آتا ہے وہ اپنی قوم کو جس بات کی سب سے پہلے دعوت دیتا ہے وہ یہی ہے کہ اے لوگو تقویٰ اختیار کرو۔ پس تقویٰ کی تعلیم کا صحیح طریقہ معلوم کرنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرات انبیائے کرام لوگوں میں کس طرح تقویٰ پیدا کرتے ہیں۔

ہم نے جہاں تک حضرات انبیاء کے طریقہ تعلیم تقویٰ کو قرآن مجید سے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے زمانہ کی فسق و فجور سے بھری ہوئی دنیا پر جب نظر ڈالتے ہیں اور انسان کی خدا سے بغاوت و سرکشی اور شہوات نفس کی پیروی میں آزادی و بے قیدی کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر یہ حقیقت واضح فرماتا ہے کہ انسان کی ان تمام سرکشیوں اور تعدیوں کی تہ میں تین چیزیں کام کر رہی ہیں پہلی یہ ہے کہ لوگوں میں خدا اور اس کی صفات کا تصور بالکل غلط ہو کے رہ گیا ہے۔ دوسری یہ کہ لوگوں میں اس زندگی کے بعد کسی زندگی کا یا تو سرے سے تصور ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو اس تصور میں ایسی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ اس کی گرفت انسان کی عملی زندگی پر بالکل باقی نہیں رہی ہے۔ تیسری یہ کہ لوگوں میں سرے سے اللہ تعالیٰ کے حدود و احکام کا علم ہی مٹ گیا ہے۔ لوگ جانتے ہی نہیں کہ ان کے نفس کی خواہشوں اور دل کی چاہتوں پر کوئی روک بھی ہے۔ پس حضرات انبیائے کرام اپنی ساری قوت ان تینوں چیزوں کی اصلاح پر صرف کرتے ہیں اور جس رفتار سے وہ خدا اور اس کی صفات آخرت اور اس کے نتائج، احکام الٰہی اور اس کے مصالح لوگوں پر واضح کرتے جاتے ہیں اسی رفتار سے لوگوں میں تقویٰ پیدا ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ جب انبیائے کرام اپنے کام سے فارغ ہو کر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو اپنے پیچھے متقیوں کا ایک ایسا گروہ چھوڑ جاتے ہیں جو مدتوں تک اس تقویٰ کی حرارت کو لوگوں میں باقی رکھتا ہے۔

یہاں ہم ان تینوں چیزوں کی کسی قدر تفصیل کر دینا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ خدا، آخرت اور حدود الٰہی کے علم میں کس طرح کی غلطیاں ہیں جن کی حضرات انبیائے کرام کو اصلاح کرنی پڑتی ہے اور جن کی اصلاح کے بغیر تقویٰ کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔

۱۔ پہلی چیز یعنی خدا کے تصور کا جب یہ حضرات اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈال کر جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یا تو لوگ سرے سے خدا کو مان ہی نہیں رہے ہیں۔ یا مان رہے ہیں تو اس طرح مان رہے کہ اس طرح ماننے اور نہ ماننے میں نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ مثلاً جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ صرف اس حد تک مانتے ہیں کہ وہ آسمان و زمین کا خالق ہے۔ یہ نہیں مانتے کہ وہی تناسب کا مالک اور حاکم بھی ہے۔ یا یہ تو مانتے ہیں کہ ہر چیز کو وجود اسی نے بخشا ہے لیکن یہ نہیں مانتے کہ وہی تناسب کا محافظ و نگراں بھی ہے۔ ان کے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہیں کہ آسمان کے عرش حکومت

بیٹھا ہو اور زمین کا انتظام وہ اپنے دوسرے مقربین کے حوالہ کر کے اس سے بالکل غیر متعلق ہو جائے۔ اسی طرح وہ خدا کو بھی مانتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کے دوسرے سیکڑوں شریکوں کو بھی مانتے ہیں جن کو اس کے دربار میں ایسی رسائی اور تقرب حاصل ہے کہ جس کو چاہیں معاف کرا دیں اور جس کو چاہیں سزا دلا دیں۔ اس کی عبادت کا حق ان کے نزدیک اس سے ادا ہو جاتا ہے کہ مخصوص اوقات میں اس کی پوجا کر لی جائے یا اس کو خوش کرنے کے لیے اس کے حضور میں کوئی نذر گذران دی جائے یا کوئی قربانی پیش کر دی جائے۔ اس عبادت کے مقتضیات میں سے نہ تو یہ بات ہے کہ تنہا اسی کی اطاعت اور غلامی کی جائے اور نہ وہ خدا کی صفات کا یہ کوئی لازمی تقاضا سمجھتے کہ وہ خلق کی ہدایت کے لیے کوئی قانون و کتاب اور کوئی نبی و رسول بھیجے اور انسانوں پر اس کی اطاعت لازمی ہو۔ علیٰ ہذا القیاس وہ خدا کو خالق مانتے ہیں لیکن یہ نہیں مانتے کہ وہ مارنے کے بعد دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ یا انسان کے تمام کھلے اور چھپے سے واقف ہے۔ یا اس کے ہر کام میں حکمت ہے یا وہ عادل اور قسط کو قائم کرنے والا ہے یا دوسروں کے خوف و لحاظ اور ان کی مدد و اعانت سے بالکل مستغنی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کو نہ ماننے والے اور اس طرح ماننے والے نتیجہ کے لحاظ سے، یعنی خدا سے بے خوفی میں، دونوں برابر ہیں۔ پہلا گروہ اس وجہ سے بے پروا ہے کہ وہ خدا کو مان ہی نہیں رہا ہے اور دوسرا اس وجہ سے مستغنی ہے کہ اس نے خدا سے بچنے کے لیے صدہا راستے پیدا کر لیے ہیں اس وجہ سے انبیائے کرام پہلے گروہ میں خدا کا اعتقاد پیدا کرتے ہیں اور دوسرے گروہ کے عقیدہ کی اصلاح کرتے ہیں کیونکہ جب تک خدا پر سچا اور پکا ایمان نہ ہو اور وہ ایمان شرک کی تمام آلائشوں سے بالکل پاک نہ ہو اس وقت تک خدا سے تقویٰ ایک بالکل بے معنی لفظ ہے۔ جو شخص خدا کو تنہا مالک اور حاکم مان ہی نہیں رہا ہے آخر وہ اس کی اطاعت و بندگی کیوں کرے؟ جو شخص اس کو علیم و خبیر یقین ہی نہیں کر رہا ہے وہ خلوت و جلوت میں اس سے اس طرح ڈرتا کیوں رہے کہ اس کے کسی حکم کی ادنیٰ خلاف ورزی بھی نہ ہونے پائے؟ اور بالفرض وہ پبلک میں کسی مصلحت سے کوئی کھلی ہوئی نافرمانی نہ کرے لیکن آخر تنہائی میں اس کا خوف اپنے اوپر کیوں مسلط رہنے دے؟ جو شخص اس بات پر عقیدہ رکھتا ہی نہیں کہ خدا عادل اور قسط کو قائم کرنے والا ہے وہ ظلم و ناانصافی سے کیوں ڈرے؟ جو شخص اس بات کا قائل ہی نہیں کہ خدا کو ہماری روزمرہ زندگی سے کوئی تعلق ہے، اور اس نے ہماری اس زندگی کو حدود کے اندر پابند رکھنے کے لیے کچھ قوانین اتارے ہیں، آخر وہ خدا سے ہر قدم پر کانپتا کیوں رہے؟ جس شخص کا اس بات پر ایمان ہی نہیں کہ خدا ہی حاکم علی الاطلاق، بادشاہ اور قانون ساز ہے۔ آخر وہ اپنی یا دوسروں کی حکومت اور قانون سازی کو بغاوت کیوں سمجھے؟ اس وجہ سے تقویٰ پیدا کرنے کے لیے سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق کا صحیح صحیح علم پیدا کیا جائے اس کے بغیر تقویٰ پیدا کرنے کی ساری تدبیریں بالکل اوپری ہوں گی جن سے ممکن ہے خانقاہی قسم کا ایک بالکل غیر متوازن تقشف تو پیدا ہو جائے لیکن وہ تقویٰ ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا جو حدود اللہ کی کامل محافظت سے عبارت ہے اور جس کو پیدا کرنے کے لیے حضرات انبیائے کرام تشریف لائے تھے۔

(۲) دوسری چیز یعنی عقیدۂ آخرت کا، جب انبیائے کرام جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ یا تو سرے سے موت کے بعد کسی زندگی اور روزِ حساب کے قائل ہی نہیں رہے ہیں اور اگر قائل ہیں تو صرف ایک مفروضہ کے درجہ میں قائل ہیں اور یہ مفروضہ بھی ان کے اندر خدا اور اس کے حدود کا احترام اور خوف پیدا کرنے میں بالکل بے اثر ہے کیونکہ اگر ایک طرف وہ یہ مانتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ہے جس میں اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی تو دوسری طرف سفارش اور امداد کی شفاعت کے بھی قائل ہیں جن کی نسبت ان کا اعتقاد ہے کہ وہ خدا کے ہاں اس قدر زور و اثر رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پرستاروں کو بہرحال خدا سے بخشوا لیں گے۔ دوسرے بعض ایسے ہیں جو اپنے نسب ہی کو اپنی نجات کے لیے بالکل کافی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے آباء و اجداد خدا کے محبوب تھے اس وجہ سے وہ بھی اللہ کے محبوب اور چہیتے بن گئے ہیں اس وجہ سے اولاً تو خدا کی جہنم کے وہ سزاوار نہیں اور اگر سزاوار ٹھیرے بھی تو زیادہ سے زیادہ چند دنوں کے لیے۔ بعض دوسرے اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ انسان فطری گنہگار ہے۔ اس کے پاک اور متقی ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ عدل کا معاملہ نہیں کیا ہے بلکہ رحم کا معاملہ کیا ہے اور اس کی نجات کے لیے اس نے اپنے محبوب بیٹے کو بھیجا جو سولی پر چڑھ کر تمام انسانوں کے لیے کفارہ ہو گیا۔ اب انسانوں کی نجات کے لیے کسی پرہیزگاری اور تقویٰ، کسی بندگی و اطاعت کی ضرورت نہیں ہے، صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگ خدا کے بیٹے پر ایمان لائیں۔ جو اس پر ایمان لائیگا نجات پائیگا اگرچہ اس سے ایک نیکی بھی صادر نہ ہوئی ہو اور جو شخص اس پر ایمان نہیں لائے گا وہ نجات سے محروم رہے گا اگرچہ اس سے ایک برائی بھی سرزد نہ ہوئی ہو۔ دوسرے بعض ایسے ہیں جو اگرچہ آخرت کے قائل ہیں لیکن اس کو اس قدر دور سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے کسی تقویٰ اور پرہیزگاری کا اہتمام بالکل فضول سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو نجات اپنے گروہ کا حق سمجھتے ہیں۔ جو ان کے اندر شامل ہے اس کی نجات ہوگی خواہ اس کے اعمال کچھ ہوں۔ جو ان سے باہر ہے وہ نجات سے محروم ہے اگرچہ وہ کتنا ہی نیک ہو۔ ظاہر ہے کہ جو شخص آخرت کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے اور اپنے آپ کو بالکل غیر مسئول اور مطلق العنان سمجھ رہا ہے اس سے تقویٰ کا مطالبہ بالکل بے معنی ہے اور اگر آخرت کا تو قائل ہے لیکن غلط شفاعت کے چکر میں پڑا ہوا ہے یا نسب کے غرور اور گروہ کی عصبیت میں مبتلا ہے یا خدا کے رحم اور عدل کا تصور اس کے دماغ میں غلط ہو کے رہ گیا ہے تو اس کو بھی تقویٰ کی دعوت دینا بالکل بے معنی ہے۔ ان میں سے ہر واہمہ تقویٰ کی جڑ اکھاڑ دینے کے لیے کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ایک ایسی شفاعت کا یقین لیے بیٹھا ہے جو باطل کو حق اور حق کو باطل بنا دے گی اس کو خدا سے ڈرنے کی کیا ضرورت؟ جو شخص اس خبط میں مبتلا ہے کہ اسے جو کچھ حاصل ہے اس کے نسب اور اس کے استحقاقِ ذاتی کا کرشمہ ہے۔ دنیا میں بھی حاصل ہے اور آخرت میں بھی حاصل رہے گا اسے خدا کی پرسش کی کیا پروا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اگر کسی کے دماغ میں خدا کے رحم کا ایک غلط تصور پیدا ہو گیا ہے اور وہ خدا کے عدل کو اس کے رحم ہی کا مظہر نہیں سمجھ رہا ہے تو وہ خدا سے ڈرے گا کیوں؟ ایسے لوگوں کے اندر تقویٰ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر اول تو عقیدۂ آخرت کو راسخ کیا جائے ثانیاً ان تمام رخنوں کو بند کیا جائے جو اس عقیدے کے تمام اثر کو بالکل باطل کر دینے والے ہیں۔ چنانچہ حضرات انبیائے کرام ان لوگوں کو پہلے ایمان بالآخرت کی دعوت دیتے ہیں اور آخرت کے

قطعی ہونے پر آفاق و انفس سے ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جن کا انکار صرف ایک ہٹ دھرم ہی کر سکتا ہے اور ساتھ ہی ان تمام غلط توہمات کی ایک ایک کر کے بیخ کنی کرتے ہیں جو انسان میں غلط قسم کی بے پروائی اور جسارت پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً شفاعت کے غلط تصور کی پوری وضاحت کے ساتھ تردید کر دیتے ہیں کہ خدا کے ہاں کوئی آدمی یا فرشتہ بغیر اس کی اجازت کے کسی کی شفاعت نہیں کر سکے گا اور جس کو شفاعت کی اجازت دی جائے گی وہ صرف سچی بات کہہ سکے گا کوئی بات خلاف حقیقت نہ کہے گا۔ اور کوئی شفاعت نہ حق کو باطل کر سکے گی نہ باطل کو حق، علیٰ ہذا القیاس نسب و حسب خدا کے یہاں کچھ کام نہ آئے گا وہاں صرف عمل و اطاعت کی پوچھ ہوگی۔ جو لوگ عمل کے لحاظ سے بھرپور ہوں گے وہ خدا کے یہاں اسی لحاظ سے اونچے سے اونچا درجہ پائیں گے اگرچہ نسب و خاندان کے اعتبار سے نیچے درجہ میں گنے جاتے ہوں۔ اور جو لوگ عمل سے خالی ہوں گے وہ خدا کے ہاں محروم و نامراد ہوں گے اگرچہ انھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر ہی کی اولاد میں ہونے کا شرف حاصل ہو۔ نیز وہ یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ایک انصاف کا دن لائے جس میں مظلوموں کی دادرسی کرے اور ظالموں کو ان کے کیے کا بدلہ دے۔ اس کی رحمت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ ظالموں اور سرکشوں کو معاف کر دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو نہ وہ عادل ہے نہ رحیم ہے۔

---

(۳) ان دونوں کاموں سے فارغ ہونے کے بعد حضرات انبیائے کرام جب اللہ تعالیٰ کے حدود کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حدود و قوانین شریعت کا بڑا حصہ بالکل مٹ چکا ہے۔ اللہ کا حرام کیا ہو حلال ہے۔ اس کا حلال کیا ہوا حرام ہے۔ جو بات اس کی نظروں میں مبغوض تھی وہ محبوب بن گئی ہے، جو محبوب تھی مبغوض بن چکی ہے۔ زندگی کے ہر گوشہ میں معروف منکر بن چکا ہے اور منکر نے معروف کی جگہ لے رکھی ہے۔ معاش میں، معیشت میں، عدل میں، سیاست میں، تہذیب میں، معاشرت میں، تعلیم میں، تربیت میں، عادات و اخلاق میں، اٹھنے بیٹھنے میں، چلنے پھرنے میں، ہنسنے بولنے میں ہر جگہ شیطان نے گھس کر انڈے بچے دیدیے ہیں اور سارا نظام زندگی فاطر اور فطرت کے منشا کے بالکل خلاف ہو کے رہ گیا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندگی کے ایک ایک گوشہ کی چھان بین کرتے ہیں اور ہر گوشہ کو غیر فطری اور غیر الٰہی عادات و رسوم سے بالکل پاک کر کے فطرت اور شریعت کے بالکل مطابق کرتے ہیں۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے یہاں تقویٰ پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے۔ آنحضرت صلعم کی بعثت کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈال کر آدمی اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔ مکہ کی زندگی میں آپ نے جس طرح لوگوں کو تقویٰ کی تعلیم دی مکی سورتوں میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ہر آدمی ان سورتوں کو سرسری طور پر پڑھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ یہ سرتا سر خدا، اس کی توحید، اس کی صفات حسنیٰ اور آخرت کے دلائل و احوال سے لبریز ہیں۔ اور اتنی قوت و شدت اور اتنی گوناگوں شکلوں میں ان سورتوں کے اندر یہ مطالب بیان ہوئے ہیں کہ جن لوگوں کو اول اول یہ سورتیں سنائی گئیں ان کے لیے اس دعوت سے بے پروا رہنا اور اپنی طفل تسلیوں کے فریب میں بدستور غافل پڑے رہنا ناممکن ہو گیا۔ ان کے لیے صرف دو ہی صورتیں

کھلی رہ گئی تھیں یا تو داعی کی دعوت پر لبیک کہیں اور غفلت کے بستروں کو چھوڑ کر خدا کی طرف بھاگیں یا پھر پوری قوت سے اس پُر اثر دعوت کو دبا دیں جس نے ان کے لیے چین کی نیند حرام کر دی ہے۔ چنانچہ ان سورتوں کے نزول کے بعد پورے عرب میں ایک شخص بھی اسلامی دعوت کے بارہ میں غیر جانبدار نہیں رہ گیا تھا یا تو اس کا جان و دل سے حامی بن کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کو مٹائے بغیر اس کے لیے خواب و خور حرام تھا یا اتنا شدید حامی کہ سب کچھ گوارا تھا لیکن اگر نہیں گوارا تھی تو یہ بات کہ کوئی قدم بھی تقویٰ کے خلاف اٹھے تقویٰ کا اس درجہ شدید احساس کہ خدا کے حکم کی تعمیل کی راہ میں ہر جوکھم آسان ہو گئی، صرف اس چیز کا نتیجہ تھا کہ خدا اور آخرت کے بارے میں ان کا علم بالکل صاف ہو گیا تھا۔ اتنا صاف کہ اس کے بعد ان کے لیے خدا کی طرف بھاگ کھڑے ہونے کے سوا کوئی صورت باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ جس جنت الحمقاء میں اب تک پڑے سو رہے تھے، انھیں دفعۃً نظر آیا کہ اس کے گوشہ گوشہ میں آگ لگ چکی ہے اب اگر جان بچانے کی کوئی شکل ہے تو صرف یہی کہ جس دروازہ پر پیغمبر کھڑا بلا رہا ہے اس کا رخ کیا جائے۔ جو لوگ علانیہ مخالفت پر کمربستہ تھے ان کی مخالفت بھی ان گھبرائے ہوئے اور بدحواس لوگوں کی دوڑ دھوپ کے مانند تھی جو آگ کے خطرہ سے تو بچنا چاہتے ہوں لیکن نجات کے جس راستہ کی طرف نبی دعوت دے رہا ہو اس کی طرف جانے سے اس وجہ سے گھبراتے ہوں کہ اس راستہ سے ان کو اس بات کی اجازت تو ہے کہ وہ اپنی جانیں بچالے جائیں لیکن اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ اپنے سارے اثاث البیت کے ساتھ نکل سکیں۔ چونکہ دنیا کی محبت ان پر غالب تھی اس وجہ سے باوجودیکہ حق ان پر واضح تھا لیکن وہ حق کا ساتھ نہ دے سکے۔

اس ساری تفصیل سے دو باتیں واضح ہوئیں۔ پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور آخرت کا صحیح علم آدمی کے اندر وہ بے چینی پیدا کرتا ہے جس سے وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے جو تقویٰ کی اصل حقیقت ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور آخرت کا صحیح علم ہی وہ پاسبان ہے جو آدمی کے دل کے اندر بیٹھ کر اس کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے احکام و قوانین کی پوری پابندی کرے اور کسی جگہ بھی سرِ مو اس کے حدود سے تجاوز نہ کرے۔ اگرچہ یہ باتیں بالکل واضح ہیں لیکن قرآن مجید سے یہاں ہم بعض آیتیں نقل کیے دیتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کے پیدا ہونے اور باقی رہنے کا انحصار سرتاسر اللہ تعالیٰ کی صفات اور آخرت کے صحیح علم و یقین پر ہے۔

پہلے ہم بعض وہ آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ تقویٰ کا پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کی صحیح صفات کے علم پر منحصر ہے۔ سورہ بقرہ میں طلاق کے احکام و قوانین کے بیان کے بعد فرمایا:-

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (بقرہ ۲۳۱) اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ ہر بات کو جاننے والا ہے۔

اس آیت میں تقویٰ کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی صفت علم کی یاد دہانی کی گئی ہے۔ کیونکہ خدا کے حدود کی پوری حفاظت وہی کر سکتا ہے جو یہ جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر بات سے باخبر ہے۔ یہ چیز دو مختلف پہلوؤں سے آدمی کے اندر تقویٰ پیدا کرتی ہے۔ جہاں کہیں انسان کا نفس کسی خیانت یا جسارت پر اکساتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا تذکرہ آدمی میں خدا

خوف پیدا کرتا ہے اور جہاں کہیں آدمی اللہ تعالیٰ کے حدود کی پابندی کے لیے بازیاں کھیلتا ہے، مصائب جھیلتا ہے، نقصانات گوارا کرتا ہے وہاں یہ یقین کہ اللہ تعالیٰ اس کی ان جاں بازیوں کو دیکھ رہا ہے اس میں اعتماد و قوت پیدا کرتا ہے۔

پھر احکام رضاعت کے ذکر کے بعد فرمایا:-

اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا اَعْطَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (بقرہ ۲۳۳)

اگر تم چاہو کہ اپنے بچوں کو دودھ پلواؤ تو تم پر کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ ادا کرو جو تم نے دیا ہے دستور کے مطابق اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں، تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے بصیر ہونے کی یاد دہانی کی گئی ہے۔ اس صفت کا علم بھی آدمی میں ان ہی دو پہلوؤں سے تقویٰ پیدا کرتا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ

اور چاہیے کہ وہ شخص لکھوائے جس پر حق عاید ہوتا ہے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے

اس آیت میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت یعنی اس کے مالک و حاکم ہونے کو یاد دلایا گیا ہے۔

فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ (۲۸۳ - بقرہ)

پس چاہیے کہ جس شخص کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ امانت ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۷۶ - آل عمران)

ہاں جس نے اپنے عہد کو پورا کیا اور تقویٰ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ متقیوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت میں اہل تقویٰ کی حوصلہ افزائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ متقین سے محبت کرتا ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ (۱۱۴ - ۱۱۵ آل عمران)

اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں، بھلائی کے کاموں میں مسابقت کرتے ہیں، وہی لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں اور جو بھلائی کے کام وہ کریں گے اس کا انکار نہ کیا جائے گا اور اللہ متقیوں سے باخبر ہے۔

یہاں تقویٰ کے اصلی کام بھی بتا دیے ہیں اور ان کاموں میں جو جوکھم ہے اس کو برداشت کرنے کے لیے جس اعتماد اور قوت کی ضرورت ہے وہ بھی دو لفظوں میں بخش دی کہ "اللہ متقین سے باخبر ہے" یعنی جو لوگ تقویٰ کی خاطر قربانیاں کریں گے اللہ تعالیٰ ان سے اچھی طرح باخبر ہے ان کی محنتوں کا پورا صلہ دے گا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا

اے لوگو اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور بنایا اسی سے اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت مرد اور بہت سی عورتیں اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے ہو اور رحم سے بے شک اللہ تم پر نگراں ہے۔

یہاں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت "رقیب" کو یاد دلایا ہے یعنی وہ ہر شخص کی اور اس کے ہر قول

وشکل کی نہایت کڑی نگرانی کر رہا ہے۔

وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۲۹ - النساء)

اور اگر تم احسان کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تمھارے اعمال کی خبر رکھنے والا ہے

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ اتَّقُوا اللَّهَ وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

اور ہم نے وصیت کی ان لوگوں کو جن کو کتاب دی گئی تم سے پہلے اور تم کو کہ اللہ سے ڈرو، اور اگر تم کفر کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

اس آیت میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اس بات کی یاد دہانی کی گئی ہے کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق)

اور جو اللہ سے ڈرے گا اس کے لیے راہ پیدا کرے گا اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔

تقویٰ پر قائم رہنے کے لیے، بالخصوص ایسے مواقع میں جہاں آدمی کو مالی و معاشی مشکلات کا سامنا ہو، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ وہاں سے روزی کا سامان کرتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

اب ان آیات پر غور فرمایئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ پیدا کرنے اور تقویٰ پر قائم رکھنے کے لیے آخرت کا صحیح علم و یقین اور اس کا تذکر ضروری ہے۔

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (۲۲۳ بقرہ)

اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو کہ تمھیں اس سے ملنا ہے اور مومنین کو خوشخبری دو۔

وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۲۰۳

اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند دنوں میں تو جس نے عجلت کی دو دنوں میں تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے تاخیر کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ یہ اجازت اس کے لیے ہے جو تقویٰ پر قائم ہے اور تقویٰ اختیار کرو اور یاد رکھو کہ تم خدا کے پاس اکٹھے کیے جاؤ گے۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۲ - مائدہ)

اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو اور حق تلفی اور زیادتی کی باتوں میں تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ شدید پاداش والا ہے۔

فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ

پس کھاؤ اس میں سے جو تمھارے لیے روک رکھیں اور اس پر اللہ کا نام لو اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔

ان تمام آیات میں تقویٰ کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ ہی یاد دہانی کی ہے کہ "خدا سے ملنا ہے" "اس کے پاس اکٹھے ہونا ہے" "وہ سخت پاداش والا ہے" "جلد حساب چکانے والا ہے" کیونکہ انھی صفات کے یقین اور ان کی یاد داشت سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ حضرات انبیائے کرام جن کا اصلی کام ہی لوگوں میں تقویٰ پیدا کرنا تھا، انھوں نے اپنے اپنے زمانوں میں لوگوں کو جس تقویٰ کی دعوت دی وہ تقویٰ یہی تھا کہ لوگ اللہ کے حدود و احکام کے پابند ہو جائیں، اس کی نافرمانی و بغاوت سے توبہ کریں۔ نہ اپنی خواہشوں کی پیروی کریں نہ ان لوگوں کے پیچھے چلیں جو اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں۔ زندگی کے تمام گوشوں میں اس قانون کی پیروی کریں جو اللہ نے اتارا ہے اور اس بات سے ڈرتے رہیں کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہے جس میں ہر شخص کو خدا کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی اور ہر شخص کی نیکی یا بدی اس کے سامنے آئے گی۔

اس تقویٰ کو پیدا کرنے کے لیے انھوں نے لوگوں میں اللہ اور روز آخرت کا سچا یقین پیدا کیا، خدا اور اس کے اسماء و صفات کی تعلیم دی۔ جو منکر تھے ان کے انکار کو توڑا۔ جو متردد تھے ان کے تردد کو دور کیا، جو مشرک تھے ان کے شرک کا ابطال کیا۔ [illegible] جو خدا عرش آسمان پر براجمان تھا العیاذ باللہ زمین کے معاملات کی اسے کوئی خبر تھی، نہ ان سے اس کو کوئی دلچسپی [illegible] سمیع و بصیر، حفیظ و رقیب اور عزیز و حکیم خدا بن کر آسمان و زمین کے سارے معاملات کی نگرانی کرنے لگا۔ جس [illegible] لوگ صرف یہ سمجھتے تھے کہ اس نے پیدا کیا اور پیدا کر کے اس دنیا کے نیک و بد سے بے تعلق ہو گیا ہے اس کو اس حیثیت سے ماننے لگے کہ وہی تنہا اس کائنات پر ہر آن متصرف ہے۔ اس نے جس طرح لوگوں کو پیدا کیا ہے اور ان کی زندگی کے وسائل مہیا کیے ہیں، اسی طرح ان کی ہدایت کے لیے انبیا بھی بھیجے ہیں، اور رہنمائی کے لیے قانون بھی نازل کیا ہے اور جس طرح وہ سب کا معبود ہے اس طرح وہ سب کا رب، مالک اور بادشاہ بھی ہے۔ اور جس طرح اس نے یہ زندگی بخشی ہے اس طرح مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا اور اس زندگی کا حساب لے گا اور وہ دن ایسا ہوگا کہ خدا کے عدل سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی، نہ کسی کی دوستی، نہ کسی کی سفارش، نہ کسی کا فدیہ اور معاوضہ۔ وہ تنہا مالک ہوگا اور سب مملوک و محکوم ہوں گے وہی بادشاہ ہوگا اور سب تابعدار اور رعیت ہوں گے۔

ان باتوں کو دلوں میں راسخ کرنے کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ ایک طرف تو کمال درجہ علمی و استدلالی تھا یعنی ہر دعویٰ کا ثبوت، ہر شبہہ کا جواب، ہر اعتراض کی تردید، عقل کی رو سے، تاریخ کے پہلو سے، آفاق [illegible] جہت سے، انفس کی طرف سے اور دوسری طرف کمال درجہ عملی تھا یعنی توحید، معاد، رسالت کے جو حقائق سامنے آئے اور ان کو جن لوگوں نے قبول کر لیا ان کی ساری زندگی انہی اصولوں پر ڈھل گئی۔ اب ان کی زندگی کا کوئی قول و فعل ان اصولوں سے متناقض نہیں رہ گیا۔ وہ اپنی زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل سے لے کر حقیر سے حقیر جزئیات تک میں مومن باللہ، مومن بالآخرت اور مومن بالرسول تھے۔ اگر کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ان کی زندگی کے اندر ان حقائق سے متناقض ہوتی تو وہ [illegible] ان کے دلوں میں کھٹکتی جب تک کہ وہ نکل نہ جاتی۔ اور کوئی معمولی سے معمولی بات بھی اگر ان کے سامنے [illegible] ان اصولوں سے مطابق ہوتی تو وہ اس کو اس طرح لپک کے قبول کرتے گویا وہ اسی متاع گم شدہ کی [illegible] تھے۔

ہمارے سامنے بھی ایک دنیا ہے جو فسق و فجور سے بھری ہوئی ہے۔ جس کے افکار و نظریات کھلے باطل اور اعمال افعال کھلے فسق پرستانہ ہیں۔ خدا پر ایمان یا تو سرے سے موجود ہی نہیں ہے یا موجود ہے تو اس میں صدہا رخنے ہیں۔ آخرت کو لوگ یا تو سرے سے مانتے ہی نہیں رہے ہیں یا مانتے ہیں تو اس طرح کہ اس کا ماننا نہ ماننا دونوں برابر ہے۔ اللہ رسول، اور آخرت کا اقرار نہیں بلکہ انکار دین بن چکا ہے، اور یہ دین انکار اپنی پشت پر نہایت زبردست فلسفے رکھتا ہے، اس کی ترویج و اشاعت کے لیے بڑے بڑے کالج اور بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم ہیں، نہایت دلچسپ ادب پر ہیں ہے، اور پھر اس کے پیچھے نہایت ہی طاقتور سیاسی اقتدار ہے جو تمام امور دنیا کا مالک، تمام وسائل و ذرائع پر متصرف، تمام نفع و ضرر کا خداوند ہے۔ اس دنیا کے اندر کچھ تھوڑے سے مسلمان بھی رہتے ہیں جو، اس میں شبہ نہیں کہ اللہ کا نام بھی لیتے ہیں، رسول کا دم بھی بھرتے ہیں اور آخرت کا بھی ذکر کرتے ہیں لیکن اس اعتبار سے وہ دونوں برابر ہیں کہ عملی زندگی سے خدا اور رسول کو دونوں نے الگ کر رکھا ہے۔ مسلمان نام خدا اور رسول کا لیتا ہے لیکن پیروی انہی کی کرتا ہے جو اللہ اور رسول کے باغی ہیں۔ علم انہی کا پڑھتا ہے، فلسفہ انہی کا سیکھتا ہے، تہذیب میں، آداب میں، معاشرت میں تقلید انہی کی کرتا ہے، اپنا مال، اپنا وقت، اپنی قابلیت سب کچھ انہی پر نثار کرتا ہے اور جبراً نہیں بلکہ طوعاً کرتا ہے۔ صرف کرتا ہی نہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتا ہے اور صرف خود ہی نہیں اس فخر کو سینے رکھنا چاہتا بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی آئندہ نسلیں بھی اس فخر میں سے حصہ پائیں۔ یہ خدا کو ماننے کا حق صرف اس طرح ادا کر دیتا ہے کہ مسجد میں اس کی نماز پڑھ دیتا ہے، اس کے نام پر کچھ زکوٰۃ دے دیتا ہے، مہینہ بھر کے روزے رکھ دیتا ہے، باقی اس کے سوا سارے معاملات زندگی میں وہ جس خدائی کی بھی اطاعت کرے اس سے اس کے خدا کو کوئی واسطہ نہیں۔ رسول کے ماننے کا حق یہ صرف اسی طرح ادا کرتا ہے کہ نمازوں میں ان کی ذات پر درود بھیج دیتا ہے، سال میں عید میلاد کے جلسے کر دیتا ہے۔ اگر ان کی شان میں کوئی ادنیٰ گستاخی کسی سے صادر ہو جائے تو اخباروں میں اور جلسوں میں ہنگامے برپا کر دیتا ہے باقی رہی یہ بات کہ زندگی کے تمام شعبوں میں وہی واجب الاطاعت اور انہی کا بتایا ہوا طریقہ واجب الاتباع ہے اور ان کے طریقے کے سوا سارے طریقے فسق اور کفر ہیں، یہ اس کے ایمان بالرسول میں داخل نہیں ہے۔ یہ آخرت کو مانتا ہے لیکن اس اطمینان قلب کے ساتھ کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً جہنم کی آگ اسے چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ یہ جتنی بداعمالیاں بھی کرے اور کتنے ہی ٹھنڈے دل سے چاہے کرے، یہاں تک کہ اگر ان نافرمانیوں ہی کو وہ اپنا اور اپنی آل و اولاد کا دین بنا لے اور اسی دین پر وہ اور اس کی نسلیں جئیں اور مریں جب بھی وہ نجات کا حقدار ہے۔ نجات اس کا پیدائشی اور قومی حق ہے۔ یہاں تک کہ کتنے مسلمان ہیں جو شائد اسلام کا نام بھی نہیں جانتے اور دین کے واجبات میں سے شائد ایک فرض کو بھی کبھی ادا کرنے کی انھیں توفیق نہیں ہوئی تاہم وہ مسلمان ہیں ——— ایک ایسی دنیا میں اگر آپ تقویٰ کی تعلیم دینا چاہیں تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

ایک طریقہ تو وہ ہے جو ہماری خانقاہوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ اس طریقہ کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ———

اس کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لیے چند باتیں ہم یہاں عرض کریں گے۔ اس طریقہ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ارباب خانقاہ اس بات کے قائل ہیں کہ چاہے وقت کا سیاسی نظام کچھ ہو، خدائی ہو یا شیطانی، آدمی اس کا دل و جان سے مطیع و فرمانبردار اور خدمت گزار رہ کر تقویٰ حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ ان کے سکھائے ہوئے طریقہ پر کچھ اعمال و وظائف کا پابند ہو جائے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ لوگ تقویٰ کا یہ مفہوم نہیں سمجھتے کہ آدمی زندگی کے تمام شعبوں میں حدود الٰہی کا پابند ہو بلکہ ان کے یہاں تقویٰ کچھ خاص اعمال ہیں اگر آدمی ان کا پابند ہے تو باقی امور میں اس کا جو حال بھی ہو اس سے اس کے تقویٰ میں کچھ فرق نہیں پیدا ہوتا۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ حضرات تقویٰ کی تعلیم کے لیے عقل و استدلال کے راستہ کے قائل نہیں ہیں بلکہ توجہ اور صرف قلوب کے قائل ہیں۔ شیخ کا باطنی تصرف ان کے یہاں تقویٰ پیدا کرنے میں اصلی عامل ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حضرات تقویٰ پیدا کرنے کے لیے کتاب و سنت کے طریقہ کے پابند نہیں ہیں بلکہ ان کا زیادہ تر اعتماد اپنے اور اپنے ہم پیشہ حضرات کے تجربات پر ہے۔ جو کچھ انھوں نے سینہ بسینہ ورثہ میں پایا ہے یا جو بات ان کے دل میں خطور کر جائے اس کو تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اصلی چیز سمجھتے ہیں۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے تقویٰ میں مقدم و موخر کی ترتیب وہی نہیں ہے جو شریعت میں ہے۔ یہ لوگ بعض چیزوں کو بسا اوقات کوئی اہمیت نہیں دیتے جو دین میں نہایت بنیادی اور اصولی حیثیت رکھتی ہیں اور بعض دوسری چیزوں کو جو اصل دین میں بالکل ثانوی درجہ کی چیزیں ہیں اصل الاصول قرار دیدیتے ہیں۔ ہماری بہتر سے بہتر خانقاہوں میں تقویٰ کی تعلیم انہی خصوصیات کے ساتھ جاری ہے۔ اسی پر ان خانقاہوں کو قیاس کر لیجیے جو عام طور پر ہر شہر میں پائی جاتی ہیں اور ہر قسم کی بدعات و لغویات کا مرکز ہیں۔

اس کے بالکل برعکس ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اصلی کارفرما طاقت وقت کا سیاسی نظام ہے جب تک اس کی اساس تقویٰ پر نہ ہو اس وقت تک لوگوں میں اولاً تو تقویٰ پیدا ہونا ناممکن ہے اور اگر کسی طرح پیدا ہو جائے تو اس کا قائم رکھنا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے ہم سب سے پہلے اس نظام فکر سے پنجہ آزمائی کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس پر وقت کا سیاسی نظام قائم ہے۔ اور اس کو توڑ پھوڑ کر ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کی اساس پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کام کے لیے ہم نے عقل و استدلال کی راہ اختیار کی ہے اور اسی ترتیب کے ساتھ جس پر اللہ کا دین اترا ہے دین کی حجت لوگوں پر قائم کر رہے ہیں۔ جن لوگوں پر توحید، معاد اور رسالت کے صحیح مقتضیات واضح ہوتے جاتے ہیں ان لوگوں کو ہم ایک نظام میں منسلک ہونے کی دعوت دے رہے ہیں تاکہ یہ سب مل کر اس اجتماعی تقویٰ کی طرف مارچ کریں جو اصلی تقویٰ ہے اور جس کے لیے جدوجہد کیے بغیر کوئی فرد اپنے تقویٰ میں کامل نہیں ہو سکتا۔ اس طریقہ میں مقدم وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے مقدم کیا ہے اور موخر وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے موخر کیا ہے۔ ہماری جدوجہد یہ ہے کہ وقت کی عقلیت پر اسلام کے عقائد اور اعمال کی برتری کا ہر پہلو سے اس طرح چھا جائے کہ لوگ اسلام کو وقت کی ساری بیماریوں کا علاج سمجھ کر اس کی طرف بڑھنے

لگیں اور تمام انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کے قائم کیے ہوئے حدود کے اندر بسر ہونے لگے۔ ہر شخص اللہ کو حاکم و بادشاہ مانے، ہر شخص اس کے رسول کے طریقہ کو نجات کا طریقہ سمجھے، ہر شخص اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ یقین کرے۔ ہمارے نزدیک تقویٰ پیدا کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ یہی طریقہ ہم نے حضرات انبیائے کرام کی زندگیوں سے سمجھا ہے۔ اور اپنی طاقت کے مطابق اسی پر چل رہے ہیں۔ جو لوگ ہمارے اس طریقہ کو انبیائے کرام کے طریقہ کے مطابق پائیں وہ ہمارے اس کام میں ہماری مدد کریں باقی جو لوگ خانقاہی طریقہ کو طریق انبیاء کے موافق پاتے ہیں وہ اس کو اختیار کر سکتے ہیں۔

ایک ضروری گذارش

ہمارے ہاں جو شعبۂ استفسارات قائم ہے اس کا مقصد دراصل یہ ہے کہ جو لوگ تحریک اسلامی کو سمجھنے اور اس کے نصب العین اور طریق کار کے متعلق اپنے شبہات دور کرانے کے لیے مرکز سے خط و کتابت کریں، ان کے خطوط کے جوابات دیے جاتے رہیں، نیز اسلامی نظام حیات کے ان اہم اصولی مسائل کے متعلق لوگوں کو صحیح واقفیت بہم پہنچائی جائے جنھیں بالعموم غلط طریق سے سمجھا سمجھایا جاتا ہے۔ رہے چھوٹے چھوٹے فقہی مسائل تو ان میں سے صرف ایسے مسائل کا جواب یہاں سے دیا جا سکتا ہے جنھیں صحیح اسلامی نظریہ سے عام طور پر حل نہ کیا جا رہا ہو۔

لیکن قارئین ترجمان القرآن اور جماعت اسلامی کے متاثرین کی طرف سے جو خطوط روزانہ ڈاک میں موصول ہوتے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ شاید شعبۂ استفسارات کو کوئی "دارالافتا" سمجھ لیا گیا ہے۔ بس ایک تسلسل سے استفتے پر استفتے چلے آ رہے ہیں جن پر ادنیٰ سے ادنیٰ جزئیات پر سوال کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ مسائل مقامی علماء بلکہ معمولی ائمۂ مساجد سے بھی حل کرائے جا سکتے ہیں۔ پھر بعض لوگوں کو سوال کرنے کا جنون ہو گیا ہے کہ ایک ایک خط میں بیس بیس اور تیس تیس سوالات لکھ بھیجتے ہیں، حالانکہ شریعت میں کثرت سوال کو ناپسند کیا گیا ہے، کیونکہ یہ پریشان دماغی کی علامت ہے۔

بہرحال ہم اپنے ہر کرمفرما سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ استفسارات بھیجتے وقت حسب ذیل امور کا لحاظ رکھیں۔

(۱) سوالات لکھنے سے پہلے یہ بات ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ ہمارے یہاں کوئی اصطلاحی دارالافتا نہیں ہے۔

(۲) پوچھنے کے قابل صرف وہ سوالات ہوتے ہیں جو عملی زندگی میں یا دین حق کی دعوت و تبلیغ کے دوران میں واقعۃً پیش آئیں۔ تصنیف کردہ سوالات لکھ بھیجنا ایک فضول حرکت ہے۔

(۳) سرسری سوالات مقامی اہل علم سے، کسی دارالافتاء سے یا کسی علمی ادارے سے پوچھ لیجیے۔ اس کے بعد اگر کوئی اہم اور اصولی مسئلہ یا کوئی پیچیدہ فقہی جزئیہ حل طلب رہ جائے تو اس کا جواب اول تو جماعت کے لٹریچر اور ترجمان القرآن کے فائل سے دریافت کیجیے۔ لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو ہمیں لکھیے۔ ایسے ہی سوالات کا جواب دینے کے لیے شعبۂ استفسارات قائم کیا گیا ہے۔

(شعبۂ استفسارات)

امامتِ حکمیہ[۱] کی حقیقت

اور

اس کی اقسام

(ماخوذ از منصب امامت مؤلفہ شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ)

ترجمہ جناب نعیم صاحب صدیقی

امامتِ حکمیہ میں بظاہر وہ سارے کمالات موجود ہوتے ہیں جو امامتِ تامہ (خلافتِ راشدہ) کے سلسلہ میں بیان کیے جا چکے ہیں لیکن امامتِ حکمیہ ان کمالات کی معنوی روح گنوا دیتی ہے۔ اس لحاظ سے اس کا ڈھانچہ دیکھ کے تو کسی کو بیحد خوش فہمی نہ ہو کیونکہ اس ڈھانچہ میں حقیقتِ امامت کا خون ہرگز گردش نہیں کر رہا ہوگا۔ یہ درست کہ ظاہری کمالات کا حول بلا دینی تنہا آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے موجود ہو، مگر انبیاء اللہ سے مشابہت رکھنے کے مرکزی کمال میں نقص آ جاتا ہے۔ غالباً ان چند الفاظ سے امامتِ حکمیہ کا ایک سرسری تصور اخذ کیا جا سکے گا۔

گذشتہ باب[۲] میں امامتِ حقیقی کی جو قسمیں بیان کی گئی ہیں، امامتِ حکمیہ کی بھی ویسی ہی متعدد قسمیں ہیں۔ اس موقع پر ان سب کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ یہاں مقصود صرف اس کی سیاسی حیثیت کو بیان کرنا ہے۔ چنانچہ میدانِ سیاست میں امامت

---

۱ حکومتِ الٰہیہ کا نظام عام دنیوی حکومتوں کی طرح سے محض قانونی نظام نہیں ہے بلکہ اس کی اصل اساس اخلاقیت پر رکھی گئی ہے۔ یعنی ان کے جذبۂ خدا پرستی پر احساسِ ذمہ داری پر دیانت و امانت پر ذوقِ صداقتِ حق پر۔ ایسی حکومتِ الٰہیہ کو چلانے والوں کے اندر جب یہ روح اخلاقیت معنویہ سے گر جاتی ہے اور زیادہ تر یا تمام تر قانونیت ہی باقی رہ جاتی ہے تو اس قانونی نظام سیاست کو بلحاظ حیثیت حکومتِ الٰہیہ قرار نہیں دیا جا سکتا، لیکن خلیفہ یا اربابِ شوریٰ یا امرائے ریاست کے اندر قانونی اسلام کو حائل رکھتے ہوئے جو اخلاقی زوال واقع ہو جاتا ہے وہ کسی دنیوی عدالت میں نہ ثابت کرنا ممکن ہے، نہ اس کا ناپ تول انسان کے بس میں ہے۔ اس وجہ سے یہ نظام "قانونی حکومتِ الٰہیہ" ہو کر رہا۔ یہاں اصطلاحاً "امامتِ حکمیہ" کا عنوان دیا گیا ہے۔ اخلاقی ضعف کی وجہ سے خود یہ قانونی نظام بھی زوال پذیر ہوتا ہے اور خدا اور رسول کے احکام کی جگہ امیرِ وقت کے شخصی اوامر و نواہی رعایا پر نفاذ پذیر ہونے لگتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اس باب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ "قانونی خلافت" کے زوال کی وہ کونسی حد ہے جس پر پہنچنے سے پہلے اسے امامتِ حکمیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ شاہ صاحب کی بعض آراء سے مترجم کو یا قارئین کو اختلاف ہو۔

۲ یہ باب تمام تر ابھی تک ترجمان القرآن میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ گذشتہ نمبر میں اس کی صرف ایک فصل چھپی ہے۔ اس وجہ سے شاید امامتِ حقیقی کی اقسام کا قارئین کو علم نہ ہو۔ انشاء اللہ کتابی شکل میں یہ تمام مباحث یکجا شائع ہو جائیں گے۔ (ن۔ص)

حقیقیہ تو معدوم ہوتے چلے جانا اور امامت حکمیہ کا ابھرتے چلے جانا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ سیاستِ[ب] ایمانی" میں ...... جتنا جتنا دخل سیاستِ سلطانی[ط] کا بڑھتا جاتا ہے، اسی تناسب سے امامت حکمیہ غالب ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس امر کو سمجھنے کے لیے سیاستِ ایمانی کو آبِ شیریں اور سیاستِ سلطانی کو آبِ شور فرض کر لو۔ ظاہر ہے کہ آبِ شور کی جتنی مقدار آبِ شیریں میں ملائی جائے گی، اسی قدر آبِ شیریں کی لطافت زائل ہوگی اور آبِ شور کی تلخی ابھرے گی، بالفاظِ دیگر دونوں پانیوں کی مقدار کے تناسب کے ساتھ ساتھ لطافت و تلخی کے مدارج بدلتے جائیں گے۔ بالکل اسی طرح سیاستِ ایمانی و سیاستِ سلطانی کی آمیزش مختلف تناسبوں اور مختلف درجوں کی ہو سکتی ہے اور اس کے تناسبوں اور درجوں کے بدلنے سے خلافتِ راشدہ کے مدارج میں فرق آتا جائے گا۔ اسی معنی کی تفصیل کے لیے ہم آبِ شیریں اور آبِ شور کی آمیزش کو حسبِ ذیل چار موٹے موٹے درجوں میں رکھتے ہیں:۔

(۱) پہلی صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ صاف اور ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی کثیر مقدار میں ایک ذرا سا کھاری پانی مل جائے، اس صورت میں ذائقہ میں کوئی خاص تلخی اور تیزی محسوس نہیں ہوگی۔ بس ذرا پانی کی نفاست و لطافت میں نقص آ جائے گا۔ ایسے پانی کو لطیف طبع اور نازک مزاج لوگ تو پسند نہ کریں گے۔ لیکن پیاسے اس سے سیراب ہو سکیں گے۔ نباتات کو اس سے شادابی ملے گی، ہر طرح کے کھانے اس سے پک سکیں گے اور مختلف اقسام کے پارچہ جات کی دھلائی اس سے ہو سکے گی۔ ان وجوہ سے یہ پانی حقیقتاً آبِ خالص نہ ہوتے ہوئے بھی آثار کے لحاظ سے آبِ خالص سے مشابہ اور فوائد کے لحاظ سے اس کی برابری کرتا ہے۔

(۲) دوسرے درجہ کی آمیزش ایسی ہوگی کہ پانی کے ذائقہ میں تیزی و تلخی خوب اچھی طرح نمایاں ہو اور ہر کس و ناکس کے لیے اس کا پینا ناگوار ہو۔ اسے چکھتے ہی کراہت ہونے لگے۔ ایسے پانی سے پیاس کی جلن کم ہونے کی جگہ اور زیادہ بھڑکے گی، اور دوسرے فوائد میں بھی فرق آئے گا۔ یعنی جو کھانا اس میں پکے گا، اسے کھاتے ہوئے تھوڑی سی تلخی محسوس ہوگی۔ کپڑے اس سے دھلیں گے تو ان سے میل کچیل پوری طرح زائل نہ ہوگا۔ اسی طرح اس سے سیراب ہونے والے پودوں کی سرسبزی میں بھی نکھار نہ آئے گا۔

(۳) تیسرے درجے کے مرکب میں میٹھے اور کھاری پانی کا تناسب ایسا ہوگا کہ کھاری پانی کی تلخی و حدت خوب زور سے نمایاں ہوگی۔ اور مزہ اتنا بگڑ جائے گا کہ اس مرکب پانی کو بول چال میں آبِ شور ہی کہا جائے گا۔ اسے اگرچہ ضرورت پوری کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ لیکن جس حد تک ممکن ہوگا، اس سے اجتناب بھی کریں گے، یعنی کھدر اور گاڑھے کو اس میں دھو لیں گے مگر دیبا و حریر اور پشمینہ کے لباس نہ دھوئیں گے۔ ادنیٰ درجہ کی نباتات مثلاً تمباکو وغیرہ کی فصل کو اس سے سیراب کر لیں گے مگر پھل پھول لانے والے نازک پودوں کی ایسے پانی سے پرورش نہ کی جائے گی۔

(۴) چوتھے درجہ کے مرکب میں میٹھے پانی کی مقدار اتنی کم اور کھاری پانی کی مقدار اتنی زیادہ ہوگی کہ شیرینی و لطافت

ط من سعدت [illegible] گذشتہ بحث ... وحشی [illegible]۔ ب سیاستِ ایمانی کی ضد، یعنی ریاست کا نظم چلانے کے لیے خود ساختہ [illegible] دنیاوی حکمت سیاسی کا استعمال [illegible] جب تک [illegible] موقع ملتا ہے۔

کا کوئی شائبہ قطعاً اس میں محسوس نہ کیا جا سکے گا۔ یہاں تک کہ اس سے پانی کا کوئی فائدہ بھی حاصل نہ ہوگا اور اگر کوئی شخص مجبوری کی حالت میں اسے استعمال کرے گا بھی تو اس سے ہرگز حاجت پوری نہ ہوگی۔ مثلاً اگر وہ پیاس بجھانے کے لیے اسے پیے تو پیاس کی آگ دگنی بھڑکے گی، اگر درختوں کو یہ پانی دیا جائے گا تو وہ مرجھا کے رہ جائیں گے اور اگر اس میں کھانا پکایا جائے گا تو وہ ناپختہ اور بدمزہ رہے گا، بلکہ مضر صحت بھی! پھر کیسے ان باتوں کے ہوتے ہوئے اس مرکب پانی کو کسی درجہ میں بھی آب شیریں کہا جا سکتا ہے؟ —— اسے آپ شیریں تو کیا کہیں گے، اس کی بڑی سے بڑی مقدار کے ہوتے ہوئے پانی کے ضرورت مندوں کو کہا جا سکتا ہے کہ یہاں پانی بالکل ہے ہی نہیں! دشت بے آب میں ایسے پانی سے اگر کسی مسافر کا کوزہ لبالب بھرا ہوا ہو تو بھی وہ اپنے آپ کو تشنگی کی موت مرنے سے نہیں بچا سکتا۔

اب تمثیلی انداز بیان کو چھوڑ کر ہم اصل مدعا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور امامتِ حکمیہ کے مختلف درجوں پر بحث شروع کرتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ اس خوفناک بیماری کی جڑ یا اس خاردار جھاڑی کا بیج فقط جذبۂ عبدیت کا زوال ہے۔[۵]

خود "امام حقیقی (خلیفۂ راشد) کی خاص حیثیت کی بنیاد جذبۂ عبودیت ہی ہوتا ہے، اور اسی جذبہ کے صدقے میں اس میں صفاتِ نبوت کا پرتو ڈالا جاتا ہے۔ اس کی ساری مساعی کا قبلۂ مقصود رضائے الٰہی ہوتا ہے جس کی طلب میں وہ اپنی ساری لذتوں کو قربان کر دیتا ہے۔ اس کی ساری چیتیاں اور سرگرمیاں اپنے آقا و مولا کی خوشنودی کے لیے ہوتی ہیں اور وہ اپنے نفس کے تقاضوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اتباع ہوا و ہوس کا اس کے ہاں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ وہ حق و عدل کی راہ کو پوری استقامت سے طے کرتا ہے۔ اس کے قدم دوسری راہوں پر حرکت نہیں کر سکتے اور اس کی آنکھیں کسی دوسری منزلِ مقصود پر نہیں جم سکتیں۔ ماسوا اللہ کی ساری محبتوں کے جال توڑ کر وہ بارگاہِ حق تعالیٰ کی دہلیز پر ایسا بیٹھتا ہے کہ مر کر ہی اٹھتا ہے۔ اس کے بلند منصب کا احاطہ ان چند مقدس الفاظ سے ہو سکتا ہے:-

مَن احب للّٰہ وابغض للّٰہ واعطی للّٰہ ومنع للّٰہ فقد استکمل الایمان۔	جس نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ کے لیے عداوت کی اور اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روکا تو اس نے ایمان کی تکمیل کر لی۔

یا ان الفاظ سے:-

مَنْ کَانَ اللّٰہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما	وہ جس کے لیے اللہ اور اس کا رسول محبوب تر ہیں، اس سے جو کچھ ان کے سوا ہے

ایسی ہستی جب منصبِ خلافت پر متمکن ہوتی ہے تو سیاسی میدان میں اس کے مدنظر فقط خدا کے بندوں کی اصلاح کا کام ہوتا ہے اور نیابت رسول اللہ کا حق ادا کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ اپنے ذاتی فائدوں کا لالچ اس کے دل کو رام کر سکتا ہے، نہ نقصانات کا اندیشہ اس کی ہمت توڑ سکتا ہے۔ اس کے نزدیک تو اطاعت ربانی کے ساتھ

---

۵ یعنی جب اربابِ حکومت میں خدا کی آقائی اور اس کے سامنے اپنی عاجزانہ غلامی کا احساس کمزور ہونے لگتا ہے تو "خلافت الٰہی متغیر ہو کر امامت حکمیہ بننے لگتی ہے۔ (ن۔ص)

خواہشاتِ نفسانی کا شریک ہو جانا شرک کا درجہ رکھتا ہے[1] اور رضائے حق کے سوا کسی اور مقصود کی آرزو کو وہ دل کے لیے خلاف تصور کرتا ہے۔ بندگانِ الٰہی کی صحیح تربیت کے سوا نہ ظاہراً اس کا کوئی اور مدعا ہوتا ہے، نہ اس کے دل کے گوشوں میں کوئی اور تمنا چھپی ہوئی ہوتی ہے! اس وجہ سے کوئی ایسی حرکت اس سے صادر نہیں ہوتی جو سیاستِ ایمانی سے انحراف کرنے اور سیاستِ سلطانی کی طرف جھک جانے کا ذریعہ بن جائے، صادر ہونا تو دور رہا، ایسی مکروہ حرکت کا خیال تک اس کے دل میں نہیں گزرتا۔ خلاصہ مطلب یہ کہ فریبِ نفس کی یہ مجال نہیں کہ اسے صراطِ مستقیم سے ہٹا سکے۔

بخلاف اس کے "امامِ حکمی" نہ نفس کے تقاضوں سے پوری طرح بے نیاز ہوتا ہے، نہ ماسوا اللہ کی گرفت سے آزاد — چنانچہ مال و منال اور جاہ و جلال کی حرص، معاصرین پر تفوق کی اور اقوام و ممالک پر تسلط کی خواہش، عزیزوں دوستوں کی پاسداری اور مخالف دشمنوں کی بدخواہی، لذتِ جسمانی اور خواہشاتِ نفسانی کی غلامی، یہ سارے فتنے اس کے دل میں ابھرتے رہتے ہیں۔ بات دل ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ دل میں جو کچھ ہے وہ امڈ کے باہر آتا ہے اور اس کی حرکات سے نفس پرستی کا صاف صاف اظہار ہونے لگتا ہے۔ اپنے ان ذاتی مقاصد کے لیے امامِ حکمی سیاست کی مشین سے خوب مدد لیتا ہے اور نظامِ حکومت کو حکمتِ عملی سے کام لے کر اپنی نفسانیت کے ڈھب پر لے آتا ہے۔ اسی طرزِ سیاست کا نام ہے "سیاستِ سلطانی"۔ اگر ہم اس اصطلاح کی مجمل تعریف کرنا چاہیں تو اس کے لیے یہ الفاظ کافی ہوں گے:

"سیاسی اختیارات کو ذاتی فوائد حاصل کرنے اور ذاتی تکالیف دور کرنے میں استعمال کا نام سیاستِ سلطانی ہے۔"[2]

یہ ذاتی لذات کی ہوس جب سیاستِ ایمانی میں دخیل ہو جاتی ہے تو خلافتِ راشدہ کا زوال شروع ہو جاتا ہے

[1] کس حقیقت نما انداز میں یہ بات کہی گئی ہے۔ کاش کہ اسے قارئین اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ دین کی ساری منزلوں میں مسلمان کو اس کی فکر رہنی چاہیے کہ کہیں خدا کی حکومت کے نظام جماعتِ اسلامی کو یا دوسرے الٰہی اداروں کو چلاتے ہوئے وسیع یا محدود پیمانے پر جو نیابتی اقتدار اس کے سپرد کیا گیا ہے، اس سے وہ شخصی و ذاتی انتفاع تو نہیں کر رہا۔ کہیں اس اقتدار کے بل پر کچھ آمدنی تو نہیں بڑھ رہی، کہیں دوسروں سے خدمت تو نہیں لی جا رہی، کہیں ہم چو ما دیگرے نیست کا اعلان تو نہیں ہو رہا، وغیرہ۔ اگر ایسا ہے تو یہ خدا کی سب سے بڑی امانت یعنی نیابتی اقتدار میں خیانت ہے جس کے ڈانڈے شرک سے جا ملتے ہیں کیونکہ حکم و اقتدار کو خدا کیلئے خالص رکھنے کے بجائے جب اس میں اپنا حصہ بھی لگا لیا تو یہ گویا اس امر کا اعلان ہے کہ ہم بھی کچھ تھوڑے سے خدا ہیں۔

[2] دنیا کے "دار الامان" اور "دار السلام" بننے میں اگر کوئی چیز حائل ہے تو وہ یہی ہے کہ انسان انسان سے مختلف قوتوں کے ذریعہ ناجائز فائدے اٹھانا چاہتا ہے اور ان قوتوں میں سب سے بڑی قوت غالباً حکومت ہی کی ہے۔ اس ادارے کی گرفت زندگی کے ایک ایک کونے اور گوشے کو محیط ہوتی ہے، پس اسی کو شخصی اور گروہی نفع اندوزی کا قوی تر ذریعہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سیاستِ سلطانی کہ نظامِ سیاسی کی باگ ڈور جو عوام الناس کی مشترکہ متاع ہے بلکہ ان کو بھی اللہ کی طرف سے امانت کے طور پر ملی ہے، اسے ہاتھ میں لینے کے بعد کوئی شخص عوام الناس کے فائدے کے بجائے اپنی خواہشات کے ماتحت حرکت دے۔ یہ بندوں کی خداوندی قصرِ حکومت میں نمودار ہو یا عدالت میں، دکان میں یا کارخانے میں، مدرسے میں یا ہسپتال میں، شدید نفرت کے قابل ہے — سور کے گوشت اور شراب سے بھی زیادہ نفرت کے قابل۔ کیونکہ ایک دفعہ اگر سوئی کی نوک جتنا راستہ مل جائے تو پھر یہ اپنا راستہ خود بناتی ہے، حتیٰ کہ سیل بنکر اسلام کے پورے نظامِ حق و عدل کو

ور سلطنتِ ظاہرہ ابھرنے لگتی ہے، مگر چونکہ یہ ہوس مختلف اشخاص میں کم و بیش ہو سکتی ہے، یعنی بعض اس کے زور کرنے سے دین و ایمان کے دائرہ سے باہر نکل کھڑے ہوتے ہیں، بعض صرف فسق و فجور کی حد تک پہنچ کے رک جاتے ہیں، بعض پر اس سے کم اثر ہوتا ہے، صرف اتنا کہ آرام طلب بن جائیں۔ پس سیاستِ ربانی میں ہوا و ہوس کی آمیزش کے حسب ذیل مختلف مراتب ہو سکتے ہیں:-

مرتبۂ اول:- امام لذاتِ نفس سے مغلوب تو ہو مگر اس کے ساتھ ظاہر شریعت کا پابند بھی رہے، یعنی فسق و فجور اور ظلم و جور پہ نہ اتر آئے۔ اس کی آرام طلبی شریعت کے اوامر و نواہی سے ظاہراً کوئی تعرض نہ کرے بلکہ وہ صرف گنجائشوں اور رخصتوں کی تلاش میں رہے اور ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ اس صورت کو "سلطنتِ عادلہ" کہا جائے گا۔

مرتبۂ دوم:- امام پر نفسانیت کا اتنا غلبہ ہو کہ وہ کبھی کبھی مطلب برآری کے لیے ظاہر شریعت کے حلقہ کو بھی پھاند جائے اور فاسقانہ بے باکیوں اور ظالمانہ دراز دستیوں کا مظاہرہ کر گذرے۔ مزید یہ کہ ان حرکات پر اس کی جبینِ عرقِ ندامت سے آلودہ نہ ہو اور دل توبہ کی طرف مائل نہ ہونے پائے۔ ایسے شخص کا نظامِ حکومت سلطنتِ جابرہ کہلائے گا۔

مرتبہ سوم:- امام پر نفس پرستیوں کا غلبہ اتنا بڑھ جائے کہ اسے فسق اور عیاشی میں یکتائے روزگار بنا کے چھوڑے، وہ استکبار و استبداد کی جی کھول کر داد دے۔ دین حق اور سنت نبوی کے مقابلہ میں ظالمانہ اور جابرانہ قوانین گھڑ گھڑ کے لائے اور اپنے اس کرتوت کو ہنر و کمال سمجھ کر اس پہ فخر کرے۔ ایسے حاکم کی حکومت کو ہم "سلطنت ضلالت" کا عنوان دیتے ہیں۔

مرتبہ چہارم:- نفس پرست امیر خود ساختہ احکام و قوانین کو ضوابط شرعی پر ترجیح دے اور کتاب و سنت کی پیروی کا مضحکہ اڑائے، اس کی اہانت کرے اور اس پہ طرح طرح کے اعتراضات اٹھائے۔ اپنے قوانین کے حق میں تو قصیدہ خوانی کرتا ہو لیکن شرع شریف کو محض لغویت اور ہرزہ گردی قرار دے۔ اس کے نزدیک بادشاہ کائنات کے احکام اور نبی کریم کے ارشادات (نعوذ باللہ) مزخرفات سے زیادہ وزن نہ رکھتے ہوں جن سے اس کے زعم کے مطابق صرف جہلا اور احمق فریب کھاتے ہیں۔ ایسی امارت الحاد و زندقہ کی عمارت کھڑی کرتی ہے اور ہم اسے اصطلاحاً "سلطنتِ کفر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اب امامت حکمیہ کی ان چار قسموں کی تفصیل و توضیح کی جاتی ہے۔

ا- سلطنت عادلہ

سلطانِ عادل سے ایک ایسا سیاسی امیر مراد ہے جو ترقیٔ جاہ و جلال اور زیادتِ عزّ و اقبال کا طلبگار ہو، دوستوں آشناؤں میں ممتاز رہنا چاہے، شہروں اور علاقوں پر ذاتی تسلط رکھنے کا خواہشمند ہو، ملک فتح کرنے اور حکم چلانے کا تمنائی ہو، عوام و خواص کے درمیان اپنا تفوق قائم کرنے کا حریص ہو۔ پھر لشکر اور فوجیں جمع کرنے کا، خزانوں اور دفینوں کی کثرت کا اور اعزہ پروری اور دشمن کشی کا دلدادہ ہو۔ پھر اسے جسمانی لذات کی ایسی چاٹ

پڑتی ہو کر پر شوکت محلوں اور دلربا چمن زاروں اور لذیذ کھانوں اور بھڑکیلے لباسوں اور تیز رو گھوڑوں اور چمکتے ہتھیاروں اور خوش رنگ پھلوں اور طرحدار معشوقوں اور سرود کے حلقوں اور شراب کی محفلوں اور بذلہ سنج رفیقوں کے پیچھے پڑا رہے۔ اس کی شدید خواہش یہ ہو کہ زندگی کا دامن کلفت و رنج کے داغوں سے پاک رہے اور اس خواہش کی گود میں ہوا و ہوس کے گوناگوں فتنے پل پل کے جوان ہوتے رہیں۔ اس کے نزدیک فضائی فتنوں کی خدمت گذاری ثمرۂ سلطنت ہے اور ان کی خاطر وہ ہر گلی کی خاک چھاننے کے لیے پابرکاب کھڑا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے ـــــ مگر ـــــ اس کے ساتھ ساتھ اور کسی نہ کسی طرح وہ ظاہر شریعت کا احترام بھی ملحوظ رکھتا ہے، اور انتہائی پریشان روی کے باوجود قوانین کتاب و سنت کے دائرہ کو پھاندنے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہ اس وجہ سے کہ شریعت کی ظاہری پابندی تک کو ختم کرا دینے کے لیے نفس امارہ کا جتنا زور ضروری ہے وہ اس کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس شریعت کی پابندی کے باوجود امام عادل کو نفس کے تقاضے پورے کرنے کا موقع کیسے ملتا ہے۔

نظام قانونی میں رخنے یہ بات تو واضح ہے کہ بہت سے ایسے مالی (Finnancial) اور انتظامی (Executive) معاملات امام کی رائے پر چھوڑے گئے ہیں جن پر شرع شریف نے تصریح سے حکم نہیں لگایا ہے۔ ایسے مسائل میں وقت کا امام جو فیصلہ دے گا اسی کو شریعت قرار دیا جائے گا۔ مثلاً انتظامی معاملات میں سے ایک معاملہ تعزیر کی مقدار متعین کرنے کا ہے، یعنی جن جرائم کے لیے شریعت نے قطعی حد مقرر نہیں کی ہے، ان کے لیے سزا تجویز کرنا امام وقت کا کام ہے۔ چنانچہ فرض کیجیے کہ ایک ہی جرم مختلف اشخاص سے صادر ہوتا ہے اور یہ سب امام کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ اب یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ امام ان سب کے لیے ایک ہی سزا تجویز کرے، بلکہ وہ مختار ہے کہ کسی کو قید کر دے کسی کو تازیانہ لگائے، کسی کے لیے تحقیر و تذلیل کی کوئی شکل تجویز کرے، کسی سے عہدہ چھین[1] لینے کو مفید مطلب جانے اور کسی سے صرف بے رخی اور بے اعتنائی کا سلوک کرنے پر اکتفا کرے۔ یہ سب صورتیں جائز اور صحیح ہوں گی، یعنی ظاہر شریعت کے اعتبار سے اس طرح کے جائز فیصلے مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل ہوں گے اور ان کی اطاعت سے گریز کرنا ایمان سے محروم کر دے گا۔ پھر اسی سلسلہ میں تفویض خدمات و مناصب کا معاملہ لیجیے، ادھر بھی امام کے اختیار تمیزی کو بہت کچھ دخل حاصل ہے۔ وہ کسی کو مرتبہ بلند پر پہنچاتا ہے اور کسی کو ادنیٰ مقام پر چھوڑ دیتا ہے[2]، ایک

---

[1] جس نظام عدلیہ کا مقصود بندوں کی اخلاقی اصلاح ہو وہ اپنے امراء اور حکام کو اختیار تمیزی کے استعمال کی گنجائش دے گا کیونکہ مختلف اشخاص کی اصلاح کے لیے مختلف مراتب و مدارج کی سزائیں کارگر ہو سکتی ہیں ـــــ الا وہ جرائم مستثنیٰ ہیں جن سے سوسائٹی میں کوئی بہت بڑا بگاڑ اور بہت بڑا فساد رونما ہوتا ہے، مثلاً قتل، چوری، زنا وغیرہ۔ [2] یہاں بھی وہی صورت ہے، یعنی اگر کسی نظام میں سلطنت کے کارکن "سندات" کی بنا پر چھانٹے جاتے ہوں، تو وہاں ہر قسم کا بے وقوف حکومت کی مشین میں نصب ہو سکتا ہے، جیسا کہ موجودہ نظام میں آپ کسی منصب پر اس شخص کو متمکن پاتے ہیں جو اس منصب کے لیے پوری طرح نا اہل ہوتا ہے۔ آخر علمی قابلیت ہی دیکھنے کی چیز نہیں ہے آدمی کا تقویٰ، آدمی کی دیانت اور اس کا پورا کیرکٹر، اس کا ذوق، اس کا جبلی رجحان، اس کے خاندانی اور وراثتی تاثرات یہ سب کچھ قابل لحاظ ہوتا ہے اور یہ چیزیں کبھی بھی سند سے نہیں تولی جا سکتیں۔ اسی وجہ سے شریعت اسلام صاحب امر کو اختیار تمیزی دیتی ہے۔ (ن - س)

ایک کو اپنے پہلو میں جگہ دیتا ہے اور دوسرے کو اپنے سے دور رکھتا ہے، کوئی اس کے اشارہ سے افسر ہو کے رہتا ہے اور کوئی ادنیٰ درجہ کے چوبداروں اور چپراسیوں کے حلقہ سے آگے نہیں نکل سکتا۔ ان مختلف صورتوں میں قانون شریعت کی طرف سے امام پر کوئی حرف نہیں آتا، بلکہ اُلٹا جو شخص ایسے معاملات میں امام پر اعتراض کرتا اور اسے برا بھلا کہتا ہے، وہ عاصی و باغی اور مردود و مطرود قرار پائے گا۔

پھر ایسا ہی معاملہ قتل سیاسی کا ہے، یعنی جرائم کی بعض ایسی قسمیں ہیں کہ ان میں سے اگر کوئی جرم کسی شخص سے صادر ہو تو اگرچہ شرعاً وہ مجرم کے قتل کو مقتضی نہیں ہے، لیکن اگر امام کی رائے اس کے قتل کا فیصلہ دے دے تو یہ قتل بالکل جائز ہوگا۔ ایسے ہی جنگ و صلح کے مسائل و معاملات ہیں[1] کہ امام بعض اوقات جابر و سرکش کفار کی سرکوبی میں تساہل سے کام لیتا ہے اور کبھی مومن و مسلم باغیوں اور مجرموں کے خلاف یکدم برسرپیکار ہو جاتا ہے۔ ان حدود میں امام اپنے اختیارات کو جیسے چاہے استعمال کرے، کسی کو اس سے قیل و قال کی مجال نہیں ہوگی۔

اب رہے وہ شرعی معاملات جو مالیات سے متعلق ہیں[2]، وہ بڑی لمبی چوڑی بحث کے محتاج ہیں، مگر یہاں خلاصۃً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اموال غنیمت کے سوا بیت المال کے دوسرے اموال کی تقسیم میں تمام مسلمانوں سے مساوات کا سلوک کرنا امام پر واجب نہیں ہے۔ وہ چاہے تو کسی کو ہزار ہا روپے یک مشت عطا کر سکتا ہے اور کسی دوسرے کو چاہے تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دے۔ اس پر بھی محروم کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کوئی چون و چرا کرے۔ اگر وہ چون و چرا کرتا ہے اور اعتراض اٹھاتا ہے اور اطاعت امیر کے دائرہ سے قدم باہر نکالتا ہے تو وہ بارگاہ حق میں نامقبول اور قرب الٰہی سے محروم ٹھہرتا ہے۔ بہرحال اس نوعیت کے معاملات و مسائل جو امام وقت کی رائے پر چھوڑے گئے ہیں، بے شمار ہیں، ان میں نمونہ کے طور پر بعض کا ذکر کر دیا گیا ہے اور بقیہ مثالوں میں سے بیشتر کا تذکرہ آئندہ ابواب میں دلائل و شواہد کے ساتھ آئے گا۔ انشاء اللہ۔

یہاں مدعائے بیان صرف یہ ہے کہ ان اختیاری معاملات میں خلیفۂ راشد بھی حکم لگاتا ہے اور سلطان عادل بھی، لیکن دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ خلیفہ راشد کے تصرفات کا مقصود احکام الٰہی کی اطاعت، دنیا کی اصلاح اور نوع انسانی کی صحیح تربیت ہوتا ہے۔ یعنی جتنے گوناگوں معاملات، بوقلموں مقدمات اور رنگا رنگ احکام اس کی طرف سے صادر ہوتے ہیں

[1] یہاں بھی امام کے وسیع اختیارات تیزی کا تذکرہ ہے اور یہاں بھی ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ نفاذ عدل اور تقسیم مناصب کے مسائل کے مقابلہ میں امور سیاسیہ و مسائل صلح و جنگ کے لیے کوئی مستقل حکم متعین کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے، کیونکہ ان امور کے متعلق کوئی حکم لگاتے ہوئے بدلنے والے حالات کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ پس ان مسائل میں بھی امام کو اپنی بصیرت سے کام لینے کے لیے جائز حد تک گنجائش دی گئی ہے۔ (ن-ص)

[2] بیت المال کے صرف میں بھی بڑی حد تک امیرالمومنین کو اپنی حکیمانہ نظر سے کام لینے کا حق حاصل ہے، کیونکہ یہ باتیں ہمیشہ کے لیے طے نہیں کی جا سکتیں کہ کیسے شخص کو کیسے حالات میں کتنا دینا اس شخص کیلیے اور سوسائٹی کے لیے مفید ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خلیفہ کی وسعت اختیار مضر بھی ہو سکتی ہے مگر جہاں یہ نہیں ہوتی وہاں نظام "مشینی" اور "دفتری" ہوتا ہے، "انسانی" نہیں ہوتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مشینی اور دفتری نظاموں کے تحت سوسائٹی کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کتنی ہی جاذب نظر ہو انسان کو حقیقی امن اور مسرت نہ حاصل ہو گی۔

وہ صرف مفادِ ملت اور انتظامِ امت کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ کسی پر نگاہِ کرم سے متوجہ ہوتا ہے تو دوستی اور قرابت کی پاسداری سے نہیں ہوتا، اسی طرح اگر کسی کی تذلیل کرتا ہے تو کسی ذاتی مخالفت و عداوت کے ماتحت انتقاماً نہیں کرتا، بلکہ جب اس کو نظامِ امت اور مفادِ ملت کے لیے مناسب سمجھتا ہے صرف اس کو اختیار کرتا ہے، اور دل و جان سے اختیار کرتا ہے وہ جس شخص کو کسی خدمت کے لیے موزوں سمجھے گا ضرور اسی کو وہ خدمت سونپے گا، چاہے وہ اس کا دلی دوست ہو یا جانی دشمن! ــــ بخلاف اس کے سلطانِ عادل کا معاملہ دوسرا ہے، یعنی اگرچہ وہ احکامِ دین اور آثارِ سنت میں کوئی مداخلت نہیں کرتا، بلکہ صرف مذکورہ بالا اختیاری امور ہی میں تصرف کرتا ہے، لیکن اس تصرف کی مختلف صورتوں میں وہ اپنے نفس کے تقاضوں کی رعایت ضرور کرتا ہے۔ مثلاً دو آدمیوں سے ایک ہی جرم سرزد ہوتا ہے، ایسا جرم جس کے لیے حدِ شرعی متعین نہیں ہے، بلکہ اس پر امام کو تعزیر اپنی رائے سے قائم کرنی ہے۔ اب یہ ممکن ہے کہ ایک کے لیے قید و تازیانہ کی سزا نافذ ہو جائے اور دوسرے کے لیے صرف نگاہِ لطف کا پھیر لینا مناسب قرار پائے۔ اس امتیازی رویہ میں خلیفۂ راشد تو یہ ملحوظ رکھے گا کہ مجرموں کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے، (پھر جس کے متعلق اسے یقین ہو جائے گا کہ یہ قید و تازیانہ کے بغیر راہِ راست پر نہیں آ سکتا، اس پر سخت تعزیر عائد کرے گا اور جس کے متعلق وہ یہ اندازہ کرے گا کہ یہ صرف اظہارِ تغافل سے درست ہو سکتا ہے اور اگر اس کی زیادہ تذلیل کی گئی تو حمیتِ جاہلیہ اس کے اندر اس حد تک ابھرے گی کہ خودکشی کی نوبت آ سکتی ہے تو اس کے لیے ہلکی سزا مقرر کرے گا۔) مگر سلطانِ عادل ایسے موقع پر جو فیصلے دے گا ان میں نفسانیت بھی سرایت کر سکے گی۔ مثلاً اس کے سامنے ایک مجرم آتا ہے جس کے خلاف اس کے دل میں پہلے سے[۱] کینہ بھرا ہوا ہے، مگر شرعاً کسی جرم کے اثبات کے بغیر سلطان بے بس تھا اور انتقام کی آگ نہ بجھا سکا مگر اب جرم ثابت ہوتے ہی نفس کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ادھر حالات سازگار ہوئے اور ادھر وہ مجرم پر جھپٹ پڑا اور کسی سخت سزا کا حکم دے دیا۔

سطورِ بالا میں خلافتِ راشدہ اور سلطنتِ عادلہ کا نازک فرق ضروری حد تک بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اگرچہ سلطنتِ عادلہ[۲] کے نظام سے بظاہر شرعِ شریف کو فائدہ پہنچتا ہے مگر درحقیقت یہ نظام اس کے لیے مضر ہے۔ اکابرِ امت کو خصوصیت کے ساتھ اس سے ضرر پہنچتا ہے اور تزکیۂ نفس، حسنِ خلق، اخلاصِ عمل، خیر خواہیِ خلق اور تربیتِ عباد اللہ میں سیرتِ پیغمبر اور سنتِ رسول کو جو دخل ہوتا ہے وہ دھیرے دھیرے ختم ہونے لگتا ہے اور علماء و زعمائے امت جو فضائلِ دینی کے لحاظ سے واجب التعظیم ہوتے ہیں، ان کا کوئی وقر نہیں رہتا! کیونکہ سلطنتِ عادلہ کے

۱؎ ایسے مفاسد کی روک تھام کے لیے دنیا کا کوئی قانونی نظام کامیاب تدابیر نہیں اختیار کر سکا ہے، مگر اسلام نے تو انسانی زندگی کو اخلاقیت کی اساس پر کھڑا کر کے بڑی حد تک رخنہ بندی کر دی ہے۔ اب اگر کوئی اکا دکا قانون پرست اس کی سوسائٹی میں ابھرتا ہے تو اس کا کیا علاج؟ ــــ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ اجتہادی تدابیر نظامِ حکومت اور نظامِ عدالت کے خارجی ڈھانچہ کی تعمیر میں ایسی اختیار کی جائیں جن سے ایسے مفاسد کا ظہور اور بھی بعید از امکان ہو جائے۔ (ن-ص)

۲؎ ذرا غور کیجیے کہ "سلطنتِ عادلہ" جو خلافتِ راشدہ سے ایک ہی درجہ فروتر ہوتی ہے وہ تک شریعت کے لیے مضر اور اصلاح و تربیتِ انسانی میں غیر سود مند ہے ــــ تو کجا یہ حال کہ خالص طاغوت کی حکومت، شیطان کی سیاست، فرعون اور نمرود کا اقتدار بھلا قوم کے ہاں سے سندِ جواز حاصل کر لیتا ہے۔ (ن-ص)

دور میں بڑے سے بڑے تیس مار خانوں کا دینی کارنامہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ چند مسائل فقہ کو رٹ لیں[1] اور انہیں ڈھال بنا کر سلطان وقت کے گزند سے محفوظ رہیں یا اگر ضرورت پڑے تو کسی دشمن کو اپنے علم فقہ کے زور سے عدالت کے سامنے مجرم ثابت کر دکھائیں۔ یہ چیزیں روح شریعت کو بری طرح مجروح کر دیتی ہیں، درانحالیکہ اس کا ظاہر فریب ڈھانچہ جوں کا توں کھڑا نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے ایسے نظام کو حدیث میں "ملک عضوض" (سلطنت مستبد) کی اصطلاح سے موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً خلافت راشدہ کے بعد نمودار ہونے والے نظام کی طرف حسب ذیل اشارہ ملاحظہ ہو:۔

هذا الامر بدأ نبوة ورحمة ثم يكون خلافة ورحمة. ثم يكون ملكا عضوضا

یہ نظام نبوت و رحمت کی صورت میں شروع ہوا، پھر خلافت و رحمت کی شکل اختیار کرے گا، پھر مستبد بادشاہی بنے گا۔

اس موقع پر واضح کر دینا ضروری ہے کہ سلطنت عادلہ اعلیٰ اور ادنیٰ دو قسم کی ہوتی ہے۔ اس تقسیم کا راز یہ ہے کہ ظاہر شرع کی پاسداری جو سلطنت عادلہ کی لازمی علامت ہے، دو وجوہ سے برقرار رہتی ہے، یعنی یا تو خوف خدا اس کا سبب ہوتا ہے یا پاس مخلوق۔ پس اگر خوف خدا والی صورت ہو تو سلطنت عادلہ اعلیٰ ہوگی اور اگر بندوں کے خوف کی صورت ہو تو ادنیٰ۔

<u>سلطنت کاملہ</u>: اعلیٰ قسم کی سلطنت عادلہ میں سلطان شریعت کی پاسداری ایمان کی وجہ سے کرتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا تعالیٰ بادشاہ مطلق اور مالک برحق ہے اور وہ ناتوانوں، عاجزوں کا سہارا اور کثیر و قلیل پر قادر اور اعلیٰ و ادنیٰ پر غالب ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کے پنجۂ قدرت میں بے بس محسوس کرتا ہے۔ اس صداقت پر بھی اسے یقین ہوتا ہے کہ ایک دن رب الارباب کی بارگاہ میں محکمۂ احتساب کے سامنے پیش ہونا ہے اور وہاں سے ہر گستاخی و شوخ چشمی کا پورا پورا بدلہ ملنا ہے، نیز یہ کہ اس بارگاہ میں بادشاہ مقتدر اور مسکین بے بس یکساں مسئول ہوں گے اور انصاف سب پر یکساں نافذ ہوگا۔ پھر وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ وہاں چل کر جبر اور کبر، ظلم اور جور، فسق و فجور وبال جان ہو جائیں گے اور ان کا مرتکب لعنت و عذاب کا مستحق ہوگا۔ وہاں ستم توڑنے والے آگ کے شکنجہ میں کسے جائیں گے اور خود پسند سرکشوں کو ذلت کا طوق پہنایا جائے گا۔

اس حالت میں اگرچہ سلطان کو نفس امارہ گمراہی کی طرف کھینچتا ہے، مگر دوسری طرف سے خوف خدا اسے شتر بے مہار نہیں بننے دیتا۔ چنانچہ اگر بہ تقاضائے بشریت وہ راہ حق سے ذرا ادھر ادھر ہو بھی جاتا ہے تو یہی خوف خدا گھسیٹ کر اسے پھر راہ راست پر لے آتا ہے۔ پس وہ لذات نفسانی کو پورا کرنے کے لیے شریعت کی دی ہوئی رخصتوں اور گنجائشوں کی حد تک ہی ترکتازیاں دکھاتا ہے۔ مثلاً اس کی چشم حسد لاکھ مطالبہ کرے کہ فلاں عاجز پر دست تعدی دراز

[1] کیا بصیرت افروز بات کہی ہے! سبحان اللہ! "لیکن مسائل فقہ کی رٹائی" آغاز انحطاط میں اتنی کہاں ہوگی، جتنی آجکل ہے۔ آج تعلیم یافتہ علماء کا کمال یہ ہے کہ صرف پائجاموں اور داڑھیوں کے طول ناپنے کا فن رٹتے رٹتے عمریں گذار دیتے ہیں اور اس کے ذریعہ اپنے تقدس کی دھاک بٹھاتے ہیں اور پھر اس تقدس سے امامت و امارت اور خطابت و صدارت اور کچھ نہ کچھ "آب و نان" بھی حاصل کرتے پھرتے ہیں۔ (ص۔ م)

کرنا چاہیے۔ لیکن وہ اس عاجز کے متعینہ شرعی حقوق کی پاسداری میں طوعاً و کرہاً اپنے پنجۂ اقتدار کو سمیٹے رہتا ہے، تاوقتیکہ اس پر شرعاً کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے۔ جرم اگر ثابت ہو گیا تو اس کا کینۂ دیرینہ کھولے گا اور اس کے فیصلہ کو متاثر کریگا اسی طرح کسی حسینۂ دلربا کے اشتیاق میں اسکا دل کتنا ہی پیچ و تاب کیوں نہ کھائے اور شوق وصال اسے کتنا ہی بے حال کیوں نہ کر دے، لیکن تاوقتیکہ نکاح منعقد نہ ہو جائے، وہ جام وصال کو ہونٹوں سے نہ لگائے گا۔ ہاں نکاح کی سعی میں ضرور اپنے قیمتی اوقات اور اپنے بیش بہا اموال صرف کرکے سرگرداں رہے گا۔

اسی طرح اس کا نفس اگرچہ بزور یہ مطالبہ کرے گا کہ مطلب برآری کے لیے ارباب کبر و جفا کے ہتھکنڈے استعمال کرنے چاہئیں۔ لیکن وہ حدیث الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری (یعنی خدا نبی کے ذریعے سے فرماتا ہے کہ کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میرا تہ بند ہے) کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مطالبہ کو رد کر دے گا اور اپنے آپ کو نشست و برخاست اور رفتار و گفتار میں صرف اتنے ہی امتیاز کا مستحق سمجھے گا جتنے امتیاز کے لیے شرعاً اجازت ثابت ہو۔ اس کو یہ کبھی گوارا نہیں ہوگا کہ قیصروں اور کسراؤں اور دوسرے جبابرہ کے طور طریقے جو شرعاً حرام ہیں، اختیار کرے۔

ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگرچہ سلطان عادل کی زندگی پر سیرت انبیاء و خلفاء کی قبا درست نہیں بیٹھتی، مگر پھر بھی شریعت کے قانونی نظام کی طرف سے اس پر کوئی الزام وارد نہ ہوگا۔ دراصل اس کے دل میں ایمان کا شعلہ ضرور بھڑک رہا ہوتا ہے مگر ہوا و ہوس کا دھواں اس کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ اس کی روح میں یقین کی بجلی ضرور چمکتی ہے لیکن فساد نیت کی تاریکیاں اسے ڈھانپ لیتی ہیں۔ ملاحظہ ہو حذیفہؓ کی روایت:۔

قال:۔ قلت یا رسول اللہ! ھل بعد ھذا الخیر من الشر؟ قال نعم! قلت وھل بعد ذلک الشر من الخیر؟ قال نعم، وفیہ دخن! قلت وما دخنہ؟ قال یستنون بغیر سنتی ویھدون بغیر ھدی!

حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے سوال کیا یا رسول اللہ! کیا اس "خیر" کے بعد کوئی "شر" ہوگا؟ فرمایا ہاں! پھر میں نے پوچھا کہ کیا اس "شر" کے بعد کوئی "خیر" ہوگا؟ فرمایا ہاں اور اس کے ساتھ تیرگی ہوگی۔ میں نے پوچھا کہ اس کی تیرگی کیا ہوگی؟ فرمایا کہ (امرا و سلاطین) میری سنت سے ہٹ کر چلیں گے اور میری ہدایت سے ہٹ کر قیادت کریں گے۔

اس روایت میں اول الذکر "خیر" سے مراد نبوت اور خلافت راشدہ کا دور رحمت ہے، ثانی الذکر "خیر" اشارہ ہے سلطنت عادلہ کے قیام کی طرف اور لفظ "دخن" اور اس کے بعد کا توضیحی جملہ یہ واضح کرتا ہے کہ جس دور کی خبر دی جا رہی ہے وہ نظام سلطنت کا دور ہوگا، نہ کہ خلافت راشدہ کا! یہ خاص طرز کا نظام حکومت جس میں خوف خدا کی وجہ سے ظاہر شرع کا لحاظ کیا جاتا ہے، ہماری اصطلاح میں "سلطنت کاملہ" ہے۔

سلطنت ناقصہ اب لیجیے دوسرا پہلو، یعنی سلطان عادل کے دل میں خوف خدا اس حد تک پہنچا ہوا نہیں ہوتا کہ اس کے نفس امارہ کا راستہ روک سکے لیکن بندوں کی شرم اس کا دامن پکڑ لیتی ہے اور نفسانیت کے زور میں اسے احاطۂ شریعت سے باہر نکلنے نہیں دیتی۔ خود اس شرم کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً کبھی تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جس ملک میں سلطنت عادلہ قائم ہوتی ہے اس کے خواص و اکابر دیندار اور مطیع شریعت ہوتے ہیں یا کم از کم عادۃً

لوگوں کے اندر اتباعِ شریعت برقرار رہتا ہے اور ہر کس و ناکس اور مومن و منافق دین کے بندھن میں کسا رہتا ہے۔ ایسے حالات میں سلطان خوب سمجھتا ہے کہ اگر ظاہر شریعت کی مخالفت کرے گا تو جمہور میں بدنام ہوگا، جس کے نتیجہ میں عین ممکن ہے کہ اس کے خلاف شورش برپا ہو جائے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سلطان کے لیے اس کے پیش رو "سلاطین کامل" اتباع شریعت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ وہ اگر اس کے آباد و اجداد تھے تو وہ اچھی طرح محسوس کرتا ہے کہ ان کا خلف الرشید اور جائز جانشین قرار پانے کے لیے انہی کے دستور پر چلنا ہوگا ورنہ وہ ان کا ناخلف سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر سلطان ان کی نسل سے نہ ہو تو بھی وہ یہ کوشش کرے گا کہ ان کے برابر بلکہ ان سے کچھ زیادہ نیک نامی حاصل کرے، پھر کہیں یہ صورت پائی جاتی ہے کہ سلطان عادل کا دور خلافتِ راشدہ کے دور سے بالکل متصل ہوتا ہے، اس وجہ سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اس کی روش سیرت خلفائے راشدین کے بالکل خلاف ہوگی تو چھوٹے بڑے سبھی اس سے نفرت کریں گے اور اپنی زمام اختیار اس کے قبضہ میں نہ رہنے دیں گے، پس وہ شریعت کی نمائشی پاسداری کرتا ہے اور اس کی حدود کو کھلم کھلا نہیں پھاندجاتا۔

مگر ان ساری صورتوں میں بیا ننے والے جان جاتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے[1] کیونکہ اہل صدق واخلاص اور ارباب تصنع و تکلف کے اعمال میں بہت فرق ہوتا ہے۔ معمولی فراست رکھنے والا بھی یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس شخص کا کردار ایک کھوکھلا قالب ہے، جس میں مطلقاً جان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان عادل کی دیانت اور اس کا تشرع سچے مسلمانوں کے نزدیک ایک لحاظ سے مرغوب ہوتا ہے اور ایک لحاظ سے نا مرغوب! مرغوب اس لحاظ سے کہ اس کا ڈھانچہ شریعت کے مطابق ہے اور نامرغوب اس وجہ سے کہ اس دیانت و تشرع کا ظہور ایک مکار و ریاکار شخص سے ہو رہا ہے۔ اس کے افعال ایک مومنِ مخلص کی نگاہ میں بیک وقت معروف کی تعریف میں بھی آتے ہیں اور منکر کی تعریف میں بھی۔ یہ صورت ذیل کے فرمودۂ نبوت کے عین مطابق ہے:-

یکون علیکم امراء تعرفون و تنکرون — تم پر ایسے امیر ہوں گے جو معروف و منکر دونوں پر چلیں گے۔

سلطنتِ عادلہ کی یہ شکل جس میں خوف خدا کی جگہ بندوں کا پاس سلطان کو ظاہر شریعت کا پابند رکھتا ہے، ہماری اصطلاح میں سلطنت ناقصہ کہلاتا ہے۔

چند اہم اشارات | ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر گذشتہ بحث (سلطنت کاملہ) سے تعلق رکھنے والے چند اہم نکات کا تذکرہ کر دیا جائے۔

---

[1] یہ درست ہے کہ احترام قانون کے ہوتے ہوئے جو اخلاقی زوال کسی شخص کی سیرت میں آجاتا ہے، اسے قانون کے کانٹے پر تولا نہیں جا سکتا اور نہ اس پر کوئی سزا نافذ ہو سکتی ہے۔ مگر یہ زوال بالکل غیر محسوس بھی نہیں ہوتا۔ عقل عامہ تھوڑے سے غور کے بعد معلوم کر سکتی ہے کہ کسی شخص کی حرکات میں اخلاقی جان ہے یا نہیں۔ چنانچہ قانون سے فائدہ اٹھانے والے قانونی "امیر" سے اصحاب شوریٰ قدم قدم پر تصریح طلب کر سکتے ہیں، پریس اس پر تنقید کرے گا اور محراب و منبر سے اس کی تذکیر کی جائے گی اور اس طرح کے مستقل دباؤ سے اس کی اصلاح کا امکان بھی ہوگا اور رعایا کی سیاسی تربیت بھی ہوتی رہے گی۔ (ن، ص)

اشارہ (۱)۔ سلطان کامل حکماً خلیفۂ راشد ہے!

مدعا یہ ہے کہ اگرچہ درحقیقت وہ خلافتِ راشدہ کے منصب سے محروم ہے۔ لیکن چونکہ اس کے نظم میں خلافتِ راشدہ کا ایک اعلیٰ ترین وصف موجود ہوتا ہے، یعنی ظاہرِ شرع کی خدمت جسے صدق و اخلاص کے ساتھ سلطان سرانجام دیتا ہے، اس لیے اگر اس کے معاصرین میں کوئی ایسا امام[51] موجود ہو جو خلافتِ راشدہ کا نظم چلانے کی لیاقت رکھتا ہو تو اس کے لیے بھی مناسب یہی ہے کہ وہ اپنی غیر سیاسی امامت پر قانع رہے اور اپنی ساری کوششیں ہدایت کو پھیلانے میں صرف کر دے۔ وہ میدانِ سیاست میں سلطان کامل سے دست و گریباں نہ ہو اور رعیت و سپاہ کو جنگ و جدال کے لیے اکسا کر خستہ حال نہ کر دے۔ یہ صحیح ہے کہ اس طرح خلافتِ راشدہ کا عالی قدر منصب اس کے ہاتھ سے جاتا ہے، لیکن بندگانِ خدا کی خیر خواہی میں بطور رضا بہ قضا اسے یہ نقصان گوارا کرنا چاہیے اور اپنے اس صبر کو جمہور مسلمین کے لیے ویسی ہی قربانی قرار دینا چاہیے جیسی حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے دی تھی کہ آپ نے سلطان شام کی مزاحمت سے اپنے آپ کو روک لیا۔ اسی قربانی کے پیش نظر حضرت موصوف کے لیے رسول مقبول کی زبان سے پیشگی کلماتِ ستائش وارد ہوئے تھے کہ:۔

ان ابنی ھذا سید لعل اللہ ان یصلح بہ فئتین عظیمتین من المسلمین

میرا یہ بچہ سردار ہوگا، بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی کھل گئی کہ خدا اور رسول کے نزدیک[52] سلطان کامل کے حق میں "اجتماعِ کلمہ" پسندیدہ ہے اور اس کی اطاعت بارگاہ حق تعالیٰ میں مقبول ہے۔

اشارہ (۲) سلطان کامل خلفائے راشدین اور عام سلاطین کے درمیان برزخ ہے۔

یعنی اگر بادشاہوں کے حالات کو دیکھا جائے تو ان کے مقابلہ میں سلطان کامل خلیفۂ راشد قرار پاتا ہے۔ لیکن خلفائے راشدین کی طرف نظر کی جائے تو وہ ان کے مقابلہ میں محض ایک بادشاہ سمجھا جائے گا۔ چنانچہ سلطان شام نے خوب کہا تھا کہ:۔

لست فیکم مثل ابی بکر و عمر ولکن سترون امراء بعدی

میں تمہارے اندر ابی بکر و عمر کی طرح نہیں، مگر امراء کو تم میرے بعد دیکھو گے۔

بہرحال سلطان کامل کا دورِ اقتدار چونکہ دورِ نبوت اور دورِ خلافت راشدہ کے ساتھ ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آغازِ دورِ نبوت سے لے کر سلطنت کاملہ کے اختتام تک ترقی اسلام کا زمانہ ہے۔ اس مدعا کو یہ حدیث مؤکد کرتی ہے:۔

تدور رحی الاسلام بخمس وثلاثین او ست وثلاثین او سبع وثلاثین فان یھلکو

اسلام کی چکی چلتی رہیگی ۳۵، ۳۶ یا ۳۷ سال تک۔ پس اگر ہلاک ہو گئے تو ان لوگوں کے طریقہ پر ہلاک ہوں گے جو ہلاک ہو گئے اور اگر ان کا

[51] امام کی اصطلاح بہت وسیع الاستعمال ہے یعنی "مقتدر سیاسی امامت" کی طرف بھی اس کا اشارہ ہو سکتا ہے اور غیر سیاسی ذہنی امامت کی طرف بھی، جیسا کہ شاہ صاحب نے کتاب کے ابتدائی حصہ میں وضاحت سے حقیقت امامت پر بحث فرمائی ہے۔ پس یہاں "امام" سے مراد ایسی ہستی ہے جو وجاہت، سیادت، ہدایت وغیرہ کے مناصب پر فائز ہو مگر سیاست کے نظم میں اسے براہ راست کوئی دخل نہ ہو۔ (ن۔ص)

[52] "اجتماعِ کلمہ" سے مراد یہ ہے کہ جمہور مسلمین کو اس کی اطاعت پر متفق ہو جانا چاہیے (ن۔ص)

فسبیل من هلك وان یقم لهم دینهم یقم لهم دین ان کے لیے قائم رہا تو ۷۰ سال تک قائم رہے گا.....
سبعین عاماً ....

کلمہ "ان یهلکوا" سے انتظام خلافت کی برہمی اور دورِ خلافت کے آخر میں ظہورِ فتنہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
کلمہ "ان یقم لهم دینهم" سے دورِ نبوت، دورِ خلافت اور دورِ سلطنت کاملہ کے مجموعی زمانہ کی ترقیٔ اسلام مراد ہے۔
ایک اور حدیث میں وارد ہے کہ:-

تعوذوا باللہ من رأس السبعین ستر کے سرے سے اللہ کی پناہ مانگو۔

یہاں اشارہ ہے سلطنت کاملہ کے خاتمہ کی طرف، جس کو ملحوظ رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تینوں دور مل کر ایک زمانۂ برکت قرار پاتے ہیں اور وہ عظیم الشان شر و فساد (ملوکیت) جس سے خدا کی پناہ طلب کرنی چاہیے، اس مجموعی زمانہ کے خاتمہ پر ظہور پائے گا۔

اشارہ (۳) سلطان کامل کو ایک حد تک نیابت پیغمبری بھی حاصل ہے۔
یہ صحیح ہے کہ اس کی ریاست کو خلافتِ نبوت نہیں کہہ سکتے، لیکن وہ سلطنتِ نبوت ضرور ہے۔ بعثتِ محمدیؐ کے متعلق ایک الہامی پیشگوئی کے یہ الفاظ اس مدعا کی طرف اشارہ کرتے ہیں:-

مهاجره طیبة وملكه بالشام اس کا دار الہجرت طیبہ (مدینہ) اور دار السلطنت شام ہوگا۔

پس جس طرح کی اطاعت[۵۱] کامل نبی کے لیے مطلوب ہے، اسی طرح کی اطاعت کامل کا حق دار سلطان کامل بھی ہے، باوجودیکہ سیرت کی تکمیل، تقرب الی اللہ کے حصول، خلقِ خدا سے حسنِ معاملہ اور بندگانِ خدا کی تربیت کے لیے صرورِ دیانت کی جو پابندی اور نورِ ہدایت کی جیسی پیروی ناگزیر ہے اس کا درس اس سے قطعاً نہیں لیا جا سکتا۔

اشارہ (۴) سلطان کامل حسنِ ظن کا مستحق ہے۔
سلطان کامل کے متعلق یہ تو طے ہے کہ وہ حقیقۃً ایمان و اخلاص کا مالک ہے، پھر بعض قابلِ قدر کارنامے بھی اس کے ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں، نیز یہ کہ اس کے اقتدار سے ظاہرِ شریعت کو ترقی ملتی ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ اگر بشری تقاضوں کے ماتحت اصلاحِ اخلاق کے شعبے میں اس سے کوئی کوتاہی رہ جاتی ہے یا کوئی چیز سنت کے

---

[۵۱] اطاعت کامل سے غیر محدود اور غیر مشروط اطاعت ہرگز متصور نہ ہونی چاہیے۔ مدعا یہ ہے کہ لا طاعة للمخلوق فی معصیة الخالق کی اٹل شرط کے ساتھ اس کے احکام کی پوری طرح پیروی کرنی چاہیے۔ علاوہ بریں اطاعت کامل تنقید و تذکیر کے حق کو ہرگز سلب نہیں کرتی۔ آپ سلطانِ کامل کے تمام جائز احکام کی پابندی بھی کریں اور اس کے ساتھ وہ اخلاقیت و روحانیت کی کمزوری کا جہاں جہاں مظاہرہ کرے اور نفس پرستی کے لیے شریعت کی گنجائشوں کو ناپسندیدہ طریق سے استعمال کرے تو اسے رُودررو ہو کے نصیحت کیجیے، پریس اور منبر و محراب کی طاقت کو تنقید و تذکیر کے لیے استعمال کیجیے اور ارباب شوریٰ کو بھی اس مقصد میں اپنا ہم نوا بنایئے۔ بس بغاوت برپا نہ کیجیے، تاوقتیکہ آپ کو ضابطۂ شریعت اس کا حق نہ دیتا ہو۔ (ان۔م)

خلافت[1] سرزد ہوجاتی ہے تو اس سے چشم پوشی ہی مناسب ہے۔ جہاں تک ہوسکے، دل و جان سے اس کی خیر خواہی کی جائے اور اس کے تھوڑے عمل کو بہت اور اس کی چھوٹی نیکی کو بڑا سمجھا جائے۔ اس رعایت کی وجہ یہ ہے کہ لذتِ نفسانی کی وارفتگی کے باوجود اس کے دل میں دینِ رب العالمین کی خدمت کا جذبہ کام کر رہا ہے ؎

کمالِ صدق و محبت بہ بیں، نہ نقصِ گناہ — کہ ہر کہ بے ہنر افتد، نظر بہ عیب کند

۲۔ سلطنت جابرہ

سلطان جابر اس آمر کو کہیں گے جس پر نفسِ امارہ کا اتنا زیادہ غلبہ ہو چکا ہو کہ نہ خوفِ خدا اسے مانع ہو، نہ شرمِ مخلوق! نہ شرع کی پروا ہو، نہ عرف کا لحاظ! بس نفس کی طرف سے کوئی فرمان صادر ہوا تو جھٹ سے اس کی تعمیل ہو گئی، چاہے شریعت موافق ہو چاہے مخالف۔ اس کے نزدیک تو اپنی خواہشات کا پورا کر لینا ہی سلطنت کا منتہائے مقصود ہے۔ ایسے لوگوں کا "نظامِ حکومت" سلطنت جابرہ کہلاتا ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ سلاطین جابرہ شرع کی مخالفت میں مزاج کی افتاد کے مطابق مختلف مدارج پر فائز ہوتے ہیں کوئی سرشارِ کبر و نخوت ہوتا ہے تو کسی دوسرے کو ناز و تبختر کے مظاہرہ کا خاص ذوق ہوتا ہے، کسی کو جور و تعدی سے اور کسی کو فسق و فجور سے خاص مناسبت ہوتی ہے، کوئی صنفی لذات میں سرمست ہے تو کوئی شراب گلگوں کا رسیا ہے ایک چٹ پٹے کھانوں کا شیدا ہے اور دوسرا نفیس پوشاکوں پر فریفتہ۔ کہیں کھیل تماشہ سے زیادہ دلچسپی ہے اور کہیں نغمہ و سرود سے خاص وابستگی ہے۔ بہرحال ہوا و ہوس کے راستے بے شمار ہیں اور نفس پرستی کی شکلیں لاتعداد اور اگر ان کی تفصیل شروع کر دی جائے تو اسے پورا کرنے کے لیے کئی صفحے چاہئیں۔ یہاں اس شجرِ خبیثہ کی چند بڑی بڑی شاخوں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے، جن سے آگے بے شمار فروع نکلتی ہیں۔

۱۔ سفاہت | مخالفتِ شرع کی ایک وجہ سلطان جابر کی سفاہت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نعمتِ عقل و خرد سے جو شخص محروم اور دور اندیشی کے فن سے کورا ہو، وہ کسی اصول و مسلک کی پیروی میں استقامت کیا دکھائے گا اور اس سے متانت کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے! اس کے نزدیک وفا و استقلال کی صفت کو کوئی قیمت حاصل نہ ہوگی۔ نہ ننگ و عار کا اسے ذرہ بھر پاس ہوگا۔ اپنی سفاہت کی وجہ سے وہ ہر خواہش کو، جس کا گذر آدمی کے دل میں ہو سکتا ہے

[1] سلطان کامل کو جو سب سے بڑی رعایت دی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ مسلمان اس کی اطاعت کریں مگر یہ کہ اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کی جائے اور اس کے معمولی اعمال کو اصل سے دگنا چوگنا تصور کیا جائے، ایسی رعایت ہمارے نزدیک مضر مقصد ہے۔ امرا کے متعلق یہ صورت اختیار کرنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ ہر اگلا قدم زوال کی طرف اٹھے، جیسا کہ خلافتِ راشدہ کے بعد کی سیاسی تاریخ میں ہوا ہے۔ جس نظامِ سیاسی میں فردِ واحد کے بگاڑ پر پوری ریاست کا بگڑ جانا منحصر ہو، اس میں یہ کبھی بھی مناسب نہیں ہے کہ اس فردِ واحد کی ہر حرکت کو حسنِ ظن کی عینک لگا کر خوشنما بنا لیا جائے اور اس کے رائی کے دانے جتنے کارناموں کو عقیدت کی خورد بین سے "ہزار گنا" کر کے دیکھا جائے۔ جی نہیں! اگر ریاست اور رعایا اور دنیا کے عظیم الشان مفاد کا ہمیں پاس ہوگا تو ہم ادنیٰ سے (بقیہ صفحہ ۲۸ پر)

فوراً پوری کرنے کی فکر کرے گا۔ یہ ہرگز نہ دیکھے گا کہ اس سے کیا نفع و نقصان ہو سکتا ہے اور اس کا آخری نتیجہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ جو کچھ کرے گا، بالکل بچوں کی طرح دیوانہ وار کرے گا اور جہاں جہاں منہ مارے گا ٹھیک شتر بے مہار کی طرح مارے گا۔

اس طرز کا آدمی جب منصب سلطنت پر براجمان ہوتا ہے تو سیاست کا سارا کاروبار چوپٹ ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کے کرتوت نہ قوانین شریعت کے پابند ہوتے ہیں، نہ آئین عرفی کے مطابق۔ ایسے شخص کی سلطنت میں کون ہے جو نالاں نہ ہوگا، چھوٹے بڑے اور خواص و عوام سبھی دکھ پا پا کر فریاد کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بلائے عظیم ہے جس کی گرفت سے نادان و دانا اور غافل و ہشیار سبھی چھوٹ بھاگنا چاہتے ہیں۔ ذیل کی حدیث میں اسی بلائے عظیم کی طرف اشارہ ہے

اعیذک باللہ من امارۃ السفھاء وقال — میں تمھارے لیے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں بے وقوفوں کی امارت سے اور فرمایا

تعوذوا باللہ من رأس السبعین وامارۃ الصبیان — کہ اللہ کی پناہ مانگو سنہ ۷۰ھ سے اور لونڈوں کی حکومت سے۔

یوں بھی فرمایا کہ:-

ھلاک امتی علی ایدی غلمۃ من قریش — میری امت قریش کے چند چھوکروں کے ہاتھوں تباہ ہوگی۔

ب۔ **عیش پرستی** آپ جانتے ہیں کہ بعض لوگ کسی جبلی سبب کے تحت اپنی قوت شہوانیہ سے مغلوب ہو جاتے ہیں ایسے لوگوں کی ساری قوتیں لذتوں اور راحتوں کے حصول میں صرف ہوتی ہیں اور ان کی عقل عیاشی کی بھول بھلیاں میں گم رہتی ہے۔ دن رات چٹ پٹی غذاؤں، دلفریب لباسوں اور سرور بخش شرابوں کے موضوع پر کاوشیں ہوں گی، شطرنج بازی اور نرد بازی کا مشغلہ ہوگا، رقص و سرود کے چرچے ہوں گے، عورتوں اور لونڈوں میں انہماک ہوگا، محلات تعمیر کرنے اور دلکش باغات لگانے میں خاص توجہ رہے گی وغیرہ۔ فکر و تدبر کے گھوڑے ان میدانوں میں خوب دوڑائے جائیں گے اور دل کھول کر داد فسق دی جائے گی۔

اس قماش کے لوگ جب منصب سلطنت پر قابض ہو جاتے ہیں تو بذلہ سنج لوگ ان کے درباروں میں جمع ہونے لگتے ہیں اور خوب اچھی طرح بھانپ لیتے ہیں کہ یہاں رغبت صرف لذتوں اور راحتوں کی طرف ہے۔ پس وہ سب کھیل تماشے اور رنگ رنگ کے نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرنے میں لگ جاتے ہیں اور ایک ایک مشغلہ کو بڑا لمبا چوڑا فن لطیف بنا کر چھوڑتے ہیں۔ پھر مدتوں محنت کر کر کے اسے کمال کو پہنچاتے ہیں۔ عیش پسند سلاطین بھی ایسے ہی فنوں کے ماہرین کو اپنا مقرب اور خیرخواہ شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ جو کوئی مانا ہوا عیاش ہو یا بے حیا بھانڈ ہو یا چالباز دیوث ہو یا طبلہ سارنگی کا استاد ہو، وہی دربار سلطانی میں مسند آرا ہوگا۔

لیکن فسق و فجور کی یہ گرم بازاری دولت کو پھونکے بغیر کمال کو نہیں پہنچ سکتی، اسے جاری رکھنے کے لیے خزانے

(بقیہ حاشیہ صفحہ) ادنی بگاڑ پر ٹوکیں گے اور اس کے ایک ایک فیصلہ پر زبان اور قلم سے بحثیں ہوں گی تاکہ رائے عامہ بھی اپنے ساربان کی روش سے پوری طرح خبردار رہے اور ہر صاحب امر بھی چوکنا رہے کہ وہ چاروں طرف سے دیکھنے والی بیدار آنکھوں کے درمیان گھرا ہے۔ ہاں البتہ اس امر کا پاس کرتے ہوئے کہ صاحب امر ایمان و اخلاص کا مالک ہے، برضا و رغبت اس کی اطاعت کی جائے گی۔

(ن-م)

بھرپور ہونے چاہئیں۔ چنانچہ سلاطین جابرہ مجبور ہوتے ہیں کہ مال جمع کرنے کے لیے رعایا پر ہر قسم کے جور و ستم روا رکھیں اور بے دھڑک دست درازی کا مظاہرہ کریں۔ اس سے لازماً ملک میں تباہی پھیلتی ہے، مفلس اور کمزور لوگ لٹ جاتے ہیں اور تاجر و زمیندار بدحال۔ اتنا ہی نہیں، یہ طوفان فسق و فجور بعض صورتوں میں آبرومندوں کی بے آبروئی اور پردہ داروں کی پردہ دری پر منتج ہوتا ہے۔ اور یہ حالت بھی سلطنت کی تباہی کا سامان بنتی ہے۔ پھر یہ کہ سلطان جب کھیل تماشوں اور نغموں شرابوں میں مستغرق ہو گیا، تو نظام حفاظت و عدالت کا بگڑ جانا لازمی ہے جس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ رعایا میں باہم جور و ستم کا بازار گرم رہے۔ الغرض سلاطین کا فسق و فجور رعایا کی بدحالی اور ملک کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے :-

ان ھذا الامر بدء نبوۃ و رحمۃ ثم یکون خلافۃ و رحمۃ ثم ملکا عضوضا ثم ملکا جبریۃ و عتوا و فسادا فی الارض یستحلون الحریر والفروج والخمور یرزقون علی ذلک وینصرون حتی یلقوا اللہ

یہ نظام نبوت و رحمت سے شروع ہوا، پھر خلافت و رحمت بنے گا، پھر سلطنت مستبد کی شکل اختیار کرے گا، پھر جبر و سرکشی اور فساد فی الارض کی علامت بن جائے گا (اس وقت کے امرا و سلاطین) ریشم، عورت اور شراب کو بالکل حلال کرلیں گے اور اسی قسم کی کارروائیوں پر لوگوں کو عطیے دیں گے اور ان کی مدد کریں گے، یہاں تک کہ اللہ سے جا ملیں گے۔

اس حدیث میں سلطنت جبر کی مکمل تعریف آگئی ہے جس سے اس کی ماہیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

فسق و ظلم کی یہ بادشاہت پوری امت کے لیے ایک خوفناک مصیبت ہوتی ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ اہل دین و دانش سلاطین وقت سے دور بھاگتے ہیں اور ان کی مجالس سے کنارہ کشی کرتے ہیں، اور ان کا تقرب نہیں چاہتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی معاش میں خلل آجاتا ہے اور اطمینان قلب سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس حال میں وہ اصلاح معاد کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکتے، اور نہ ان کی پوری مساعی جستجوئے راہ حق پر صرف ہو سکتی ہیں۔

لیکن اگر وہ سلاطین وقت کے تقرب کو پسند کریں اور وہی ڈھنگ سیکھ لیں جو ان کے تقرب کا لازمہ ہیں تو اس صورت میں انھیں سب سے پہلے دین و ایمان سے دست بردار ہونا پڑے گا، پھر عزت و آبرو کو چھوڑنا ہو گا، پھر فحش گوئی کو اپنا خاص کمال اور نغمہ سرائی کو اپنا خاص ہنر قرار دینا ہو گا۔ پس ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ سلاطین (جابرہ) کی ملازمت اختیار کرکے اپنے دین و ایمان کی جڑ پر کلہاڑا نہ چلائیں۔ انھیں یہ خیال ہرگز دل میں نہ لانا چاہیے کہ اپنا دین بھی بچا لیں گے اور زندگی کے معاشی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے دربار سے کچھ کما بھی لائیں گے۔ ایسا خیال کرنا خوش فکری اور غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں این خیال است و محال است و جنوں

ج۔ حب مال | عموماً ایسے اشخاص دنیا میں پائے جاتے ہیں جنھیں پیدائشی طور پر مال کی غیر معمولی حرص ہوتی ہے۔ مگر حرص بھی اس عجیب قسم کی، کہ فقط گوناگوں اموال کے جمع ہو جانے ہی پر اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور حصول لذت کے لیے کچھ خرچ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہاں تو نفس اجتماع دولت ہی سب سے بڑی لذت اور اس کی

کثرت ہی سب سے بڑی راحت ہے۔ ایسے لوگ جب اپنے خزانوں اور دفینوں کی اک جھلک دیکھتے ہیں تو باغ باغ ہوجاتے ہیں اور انھیں ترقی دینے کی خواہش دلوں میں اور بھڑک اٹھتی ہے۔ چنانچہ خزانے سمیٹنے کے لیے سو طرح کے دکھ سہتے ہیں اور ہزار طرح کی مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔ حد یہ کہ بھوکے ننگے رہ کے عمر گذار دینگے مگر کیا مجال کہ اپنے خزانے میں سے ایک دمڑی بھی صرف کرسکیں۔

اب خود ہی غور کیجیے کہ ایسے لوگ اگر نظام سلطنت پر قابض ہوجائیں تو ان سے بجز اس کے اور کیا توقع ہوسکتی ہے کہ اپنی حرص کی آگ خوب بھڑکائیں۔ چنانچہ اہل زراعت و تجارت سے لے کر اغنیاء و فقراء تک سے حق حکمرانی (ٹیکس) وصول کرتے ہیں وہ بھی اس اہتمام کے ساتھ کہ مچھر کی ٹانگ سے لے کر چیونٹی کے انڈے تک کوئی چیز حساب سے باہر نہ رہے اور ایک رائی کا دانہ بھی کسی کو معاف نہ کیا جائے۔ بلکہ ان ظالموں کی تو دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ رعایا کے کسی فرد سے کوئی جرم سرزد ہو یا کوئی قصور کسی پر ثابت ہوجائے تو اس کی پکڑ دھکڑ اور سزا بتعزیر کے دوران میں اس کے مال واسباب کو بطائف الحیل اڑا لیا جائے۔ ایسے لوگ خود بھی رات دن یہی سوچتے رہتے ہیں کہ رعایا سے کس طرح مال ہتھیایا جائے اور ان کے درباری بھی اسی موضوع پر عقل لڑاتے رہتے ہیں۔ اب جس نے پرایا مال مارنے کے لیے کوئی کارگر تدبیر گھڑلی اور جس نے رعایا کو جُل دینے کا کوئی کامیاب گر ڈھونڈ نکالا، وہی ان کا خاص امیر ہے۔ وہی خیرخواہ وزیر ہے اور وہی مخلص مشیر! اس طرح سلطان جابر اور اس کے درباریوں کی مسلسل کاوشوں سے حیلہ سازی اور فریب بازی کے فنون لطیفہ اپنے کمال کو پہنچتے ہیں اور ان کے اصول و فروع مدون ہوجاتے ہیں۔

رہا بخل، سو اس کے تقاضے کے ماتحت ظالم سلاطین اپنے ملازمین سے یہ تو چاہتے ہیں کہ وہ وفاداری سے خدمت کریں اور اس خدمت کو اپنا فخر سمجھیں، مگر یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ خزانہ سے کوئی ایک تنکا بھی نکالا جائے یا دفینہ میں سے ایک کوڑی بھی کم ہوجائے۔ چنانچہ ان سے خدمت لینے کے لیے کتنی ہی چالبازیوں سے کام لیتے ہیں اور ریاست و سیاست کی کامیابی کے لیے خلق اللہ کو بالکل مصنوعی خلق سے رام کرتے ہیں، نیز جب مناسب سمجھتے ہیں کسی ملازم پر کوئی الزام قائم کرکے اس کی گذشتہ خدمات کو برباد کردیتے ہیں اور جہاں مناسب سمجھتے ہیں اپنے خدام کو محض تعظیم و تکریم کے نشہ میں مست رکھتے ہیں۔ ان باتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدمت تو لیتے رہیں مگر معاوضہ کچھ نہ دینا پڑے، یا اگر دینا ہی پڑے تو ایسے ڈھنگ سے دیا جائے کہ ملازمین کو پورا پورا حق نہ ملنے پائے بلکہ ان کے حق میں سے جتنا ممکن ہو خزانہ میں روک لیا جائے۔ مثلاً سونے چاندی میں سے کھرا مال بچا کے رکھیں گے اور کھوٹی دھات سے معاوضے ادا کرینگے یا یہ کہ زمانۂ خدمت کا کچھ حصہ حساب سے خارج کردینگے۔ یا پھر یوں ہوگا کہ ایک عرصہ تک مفت خدمت لینے کے بعد ان کا نام دفتر کے رجسٹروں میں درج کریں گے، وغیرہ!

اس قسم کی بخیل و حریص بادشاہت آخر مملکت کو تہ و بالا کرکے چھوڑے گی اور حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کردے گی۔ لیکن پھر بھی رعیت کے لیے یہی مناسب ہوگا کہ سلطانِ بخیل کے افکار و کردار پر صبر کرے اور اس سے متصادم نہ ہو۔ ورنہ اس کا اندیشہ ہے کہ وہ ملے اب تک جو کچھ چرب زبانی اور فریب کاری کے پس پردہ کررہا ہے، اسے دھڑلے سے سرانجام

دینے لگے گا اور خوب کھل کر ستم ڈھانا شروع کر دے گا۔ وجہ یہ کہ طمع اس کے خمیر میں شامل ہے اور اگر کسی وقت اس پر مال حاصل کرنے کے دروازے بند ہوجائیں گے تو وہ اپنی جبلت کے تقاضے سے مجبور ہو کر زیادہ ظلم ہوجائیگا۔ نبی صلعم نے حضرت ابوذر سے فرمایا کہ:

کیف انتم وائمۃ من بعدی یستاثرون بھذا الفئ؟ قال ابوذر اما والذی بعثک بالحق اضع سیفی علی عاتقی ثم اضرب بہ حتی القاک قال اولا ادلک علی خیر من ذلک تصبر حتی تلقانی

ترجمہ: میرے بعد کے ان امرا کے زمانہ میں تمہارا رویہ کیا ہوگا جو اس بیت المال کو خرچ کرنے میں اپنے کو دوسروں پر ترجیح دیں گے؟ حضرت ابوذر نے جواب دیا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، اس وقت میں اپنی تلوار اپنی گردن پر رکھ دوں گا اور اس کو تن سے جدا کروں گا تا آنکہ آپ سے جا ملوں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کیا میں تم کو اس سے بہتر راہ نہ بتا دوں؟ اس وقت تم

پھر فرمایا:-

انکم سترون بعدی اثرۃ وامورا تنکرونھا[له]

وروی ان الصحابۃ قالوا یا نبی اللہ ارایت ان قامت علینا امراء یسئلونا حقھم ویمنعونا حقنا فما تامرنا؟ قال اسمعوا واطیعوا فان علیھم ما حملوا وعلیکم ما حملتم

تم میرے بعد (غیروں کا) اپنے حقوق کی ترجیح (دینے والے امرا) پاؤ گے اور ایسے امور سے دوچار ہوگے جن کو تم برا سمجھو گے۔ اور روایت ہے کہ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ صلعم اگر ہم پر ایسے امرا مسلط ہوگئے جو ہم سے تو اپنا حق لے لیں لیکن ہمارے حقوق نہ ادا کریں تو اس وقت ہمارے لیے آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا ان کی سننا اور ان کی اطاعت کرنا۔ کیونکہ ان کی کمائی کا بار ان کے اوپر ہے اور تمہاری کمائی کا بار تمہارے اوپر۔

شوق مردم آزاری و خونریزی بعض اشخاص اپنی فطرت کے اعتبار سے مغلوب الغضب اور شتر کینہ ہوتے ہیں۔ ایسوں کا جب غصہ ابلتا ہے تو ترش روئی اور بدگوئی کی حد کر دیتے ہیں۔ اور موذی پن کے مظاہرہ میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ یہ تو ان کے لیے ممکن ہی نہیں کہ مجرم کے قصور کی نوعیت کا خیال کریں، بلکہ قانوناً اگر مجرم کی خطا معمولی درجہ کی ہو تو انھیں اور زیادہ غصہ آتا ہے کہ وہ کوئی جرم عظیم کیوں نہ کر کے آیا۔ ایسے ارباب ظلم جرم کو عقل کے کانٹے پر کیوں تولنے لگے۔ بس اندھا دھند ادنیٰ سے ادنیٰ غلطی پر بھی قتل اور قرقی اور تذلیل و تحقیر سے کم درجہ کی سزا تجویز نہ کریں گے، کیونکہ اس کے بغیر ان کو اطمینان قلب اور سکون خاطر حاصل ہو ہی نہیں سکتا پھر کسی گروہ کا محض ایک فرد اگر ان کی مخالفت کر بیٹھا تو سمجھ لیجیے کہ اس پورے گروہ کی شامت آئی! اچھا برا کوئی نہ بچنے پائے گا۔

(حاشیہ صفحہ ۳۰) کوئی وجہ نہیں کہ جو سلطان اسلامی مالیات کا نظم تہ و بالا کر رہا ہو اور بالواسطہ ریاست کے اندر معاشی و اقتصادی فساد پھیلا رہا ہو، اس کی کارگزاریوں پر ارباب دین و دانش چپ بیٹھے رہیں۔ حدیث ابی ذر کی رو سے اتنے صبر کا مطالبہ تو کیا جا سکتا ہے کہ تلوار نہ اٹھائی جائے لیکن یہ صبر بے جا صبر ہوگا کہ زبان اور قلم کو بھی حرکت سے روک رکھا جائے۔ یہ اندیشہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ اگر سلطان بخیل کی روک ٹوک ہوتی تو وہ اور زیادتیاں کرے گا، حالانکہ اگر روک ٹوک نہ ہوتی تو مزید زیادتیوں کا امکان زیادہ ہے اور اگر تنقید و تذکیر اسے بھڑکائے بھی تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ سلطان ان حدود سے آگے نکل جائے جن کے اندر اس کے خلاف خروج کی اجازت نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کچھ برا نہیں۔ انقلاب کا ایک ریلا از سر نو خالص خلافت راشدہ کو ابھار دے گا۔ (ن۔ص)

[له] اس روایت سے کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اس کا مدعا یہ نہیں ہے کہ اگر تم سے معصیت خالق کا مطالبہ کیا جائے تو بھی اپنے امرا کے غلام رہو، ہرگز نہیں۔ اس میں صرف یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر امرا تمہارے حقوق تمہیں نہ دیں تو صبر کرو اور نظام سمع و طاعت کو برقرار رکھو، یعنی خروج و بغاوت سے اجتناب کرو۔ امرا کا بوجھ امرا کے سر اور تمہارا تمہارے سر۔ لیکن اگر حقوق اللہ ہی کو یہ لوگ پی جائیں تو پھر مسلمان کے لیے اطاعت کو برقرار رکھنا ممکن نہیں ہے۔ (ن۔ص)

اب اگر دنیا کی بدقسمتی سے ایسے ہی لوگ مسند سلطنت پر متمکن ہوجائیں تو وہ دادِ ظلم و جور نہ دینگے تو کرینگے کیا؟ یہ ظالم خدا کے بندوں کو طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کرتے ہیں اور عزت داروں کو ذلیل و خوار کرکے چھوڑتے ہیں۔ غلط نہ ہوگا اگر انھیں بنی آدم کے لیے بھیڑیے یا کٹ کھنے کتے سمجھا جائے۔ ان کے زہریلے ڈنک سے نہ مساکین بچتے ہیں، نہ عزت و اعتبار والے، نہ غریبوں کو ان سے پناہ ملتی ہے نہ امیران کے گزند سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ان کی ایذا رسانی ہوتی اس درجہ کی ہے کہ غریب اور بے بس مسلمان ان کی "اسلامی حکومت" سے کفار کی کافرانہ حکومت کو ہزار درجہ بہتر سمجھنے لگتے ہیں اور یہی ان کے نزدیک خدا کے بندوں کے لیے جائے امن قرار پاتی ہے۔ ایسی حالت میں ادھر رعایا سلطان ظالم سے رنجیدہ ہوتی ہے اور ادھر سلطان ظالم بھی اپنے رعایا سے بیزار رہتا ہے۔ پس یہ اس کی تباہی میں خوش، وہ اس کے زوال میں راضی۔ اس حالت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

خیار ائمتکم الذین تحبونھم و یحبونکم و تصلون علیھم و یصلون علیکم و شرار ائمتکم الذین تبغضونھم و یبغضونکم و تلعنونھم و یلعنونکم

تمھارے امراء میں سے بھلے وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو۔ وہ تم سے محبت کریں اور تم ان کے لیے دعائے رحمت کرو اور وہ تمھارے لیے دعائے رحمت کریں اور تمھارے امراء میں سے برے وہ ہیں کہ تم ان سے نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں اور تم ان پر لعنت کرو، وہ تم پر لعنت کریں۔

سلطانی مظالم جس طرح رفتہ رفتہ رعایا کی معاش کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیتے ہیں اسی طرح ان کے شجر ایمان کی جڑیں بھی کھود دیتے جاتے ہیں۔ آخر لوگ اقامت دین و ایمان کی فکر کیا کریں گے، جبکہ انھیں سلطان ظالم کے خوف سے ایک ساعت بھی مخلصی نہیں ہوتی۔ چنانچہ سلطنتِ ظالم کا قیام کسی مذہب باطل کے پھیل نکلنے کے مشابہ ہے جو ملت کے نظام اور سنت کے آئین و حدود کو توڑتا چلا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

انما اخاف علی امتی الاستسقاء بالانواء و حیف السلطان والتکذیب بالقدر

مجھے اپنی امت کے بارے میں صرف یہ خوف ہے کہ (۱) وہ نچھتروں سے بارش طلب کریگی (۲) بادشاہ اس پر ظلم ڈھائیں گے (۳) اس میں قضا و قدر کا انکار پیدا ہوگا۔

سلطانِ ظالم بعض وجوہ کے ماتحت اگر کسی گروہ سے رنجیدہ ہوتا ہے اور اس سے انتقام لینے پر تل جاتا ہے تو اس کے انتقام کی تلوار مطیع اور غیر مطیع اور گنہ گار و بے گنہ میں ہرگز امتیاز نہیں کرتی بلکہ بے دریغ سروں کو کاٹتی چلی جاتی ہے اور ملکوں اور شہروں کو بے چراغ کرکے چھوڑتی ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ:-

من خرج علی امتی بسیفہ یضرب برھا و فاجرھا و لا یتحاشیٰ من مومنھا و لا یفی لذی عھد عھدہٗ فلیس منی و لست منہ

جس شخص نے اپنی تلوار لیکر میری امت پر حملہ کیا اور قتل و غارت میں نیک و بد کی تمیز نہ کی اور امت کے سچے مومنوں کو قتل کرنے سے پرہیز کیا اور نہ کسی سے اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھا اس کا نہ مجھ سے کوئی تعلق ہے اور نہ میرا اس سے۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے متعلق سلطان ظالم کے دل میں آتش غضب بھڑکتی ہے لیکن حالات ایسے نہیں ہوتے کہ عملاً انتقام لیا جا سکے۔ ایسے حالات میں لازماً اس کے سینے میں کینہ پرورش پاتا رہے گا اور وہ اس تاک میں رہے گا کہ اس کینہ کی بھڑاس نکالنے کا کب مناسب موقع پیدا ہوتا ہے۔ نبی صلعم سے روایت ہے۔

ما من والٍ یلی رعیۃ من المسلمین فیموت و ھو غاش لھم الا حرم اللہ علیہ الجنۃ

جو حکمراں بھی اپنی مسلم رعایا پر غدر اور خیانت کے ساتھ حکومت کرتا ہوا مرگیا اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کردی ہے۔

(باقی)

قانون بقائے انفع

اجتماعیات میں تحفظِ حق و عدل کا فطری اہتمام

(۲)

بحث کا پہلا حصہ انفرادی اخلاق سے متعلق تھا۔ انفرادی اخلاق کی اہمیت اجتماعیات میں اس وجہ سے ہے کہ ہر اجتماعی ہیئت افراد ہی کی اکائیوں کا مجموعہ ہوتی ہے اور ذہن و شعور صرف افراد کو حاصل ہے جس کی وجہ سے تمام تر ذمہ داریاں بالآخر افراد ہی پر عائد ہوتی ہیں۔ یہ بات اگر نہ ہوتی تو ہم انفرادی اخلاق پر اجتماعیات میں کوئی بحث نہ کرتے اور براہ راست جماعتوں اور اجتماعی نظاموں پر گفتگو چھیڑتے۔ سو فرد کے متعلق جو بحث کرنی تھی ہو چکی۔ اب ہمیں اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹنا ہے۔ یعنی یہ کہ قانون بقائے انفع کا عمل جماعتوں کے معاملہ میں کیا ہے؟ جماعتوں کو کیا چیز ابھارتی ہے؟ انھیں انسانی آبادیاں کس بنا پر سند قبولیت دیتی ہیں؟ پھر کیا اسباب انھیں اقتدار سے معزول کرتے ہیں؟ کیا اقتدار ان جماعتوں کے لیے ہے جو ظلم توڑنے کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کر لیں یا ان کے لیے جو اپنے آپ کو نوع انسانی کی خدمت کے لیے پیش کریں؟

مغرب نے تو ہمیں صرف اتنا بتایا ہے کہ کامیاب صرف وہ گروہ ہوتے ہیں جو "اقوی" ہوں، مگر یہ ہمارے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ہے۔ ہمیں تو یہ معلوم کرنا ہے کہ کوئی گروہ اقوی کس بنا پر ہوتا ہے؟ "اظلم" ہونے کی وجہ سے یا "اعدل" ہونے کی بنا پر؟ دوسرے لفظوں میں کیا انتفاع وجہ قوت ہے یا خدمت؟ لوگ اپنی باگ ڈور کیا اس گروہ کے حوالہ کرنا چاہتے ہیں جو ان کا سینہ روندے، ان کا گلا گھونٹے، ان کا چہرہ لہولہان کرے اور عام انسانی آبادی پر ارتقاء کی راہ بند کر کے صرف اپنے آپ کو آگے بڑھانے کی فکر کرے؟ یا پھر کیا وہ گروہ رضائے انسانیت حاصل کر سکتا ہے جو کمزوروں اور ضعیفوں اور کچلے جانے والوں کو ظالموں اور متکبروں کے پنجے سے نجات دلا کر اپنے پہلو میں کھڑا کرے اور طاقتور کو کمزور کی دستگیری کا سبق سکھائے؟ بس یہی اصل مرکزی سوال ہے جو اس مضمون میں پیش نظر ہے۔

اجتماعیات میں قوت کی حقیقت اوپر کا سوال حل کرنے سے پہلے یہ طے کر لینا ضروری ہے کہ اجتماعیاتی یا جماعتی قوت کی ماہیت کیا ہے؟ —— وہ قوت جو تمدنی و سیاسی نظاموں کو جوڑتی توڑتی ہے! مغربی فلسفہ کی سطح بینی نے زیادہ تر توپ و تفنگ کو فیصلہ کن طاقت قرار دیا ہے، جسے حاصل کر لینے والا گروہ زندگی کی مسابقت میں آگے بڑھ سکتا ہے، مگر توپ و تفنگ آسمانوں سے ڈھلے ڈھلائے تو ٹپکتے نہیں، خود انسانوں کو بنانے پڑتے ہیں۔ پس اس قوت کا حصول دو باتوں پر منحصر ہے: ایک تو قدرتی وسائل، دوسرے کسی آبادی کی دماغی ترقی! —— اور مغرب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ دو سعادتیں جس انسانی جماعت کو

حاصل ہوجاتی ہیں، وہی آگے بڑھا کرتی ہے۔ دماغی ترقی طبیعی قوتوں پر انسان کی دسترس بڑھاتی ہے اور ان قوتوں کی مدد سے جماعتیں انسانی آبادیوں کو مسخر کرتی ہیں۔ اس تسخیر اور نفاذ و استحکام اقتدار میں زیادہ سے زیادہ جو تیسری قوت استعمال ہوتی ہے وہ سیاسی ساحری کا فن ہے جس کے بغیر "قاہری" کوئی بڑا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ سو مغربی تصور کے مطابق اجتماعی قوت کے اقانیم ثلاثہ یہ ہوئے:۔

(ا) علوم طبیعی (ب)۔ قدرتی وسائل (ج)۔ سیاسی ساحری کا فن

مگر یہ "قوت اجتماعی" کا نامکمل تصور ہے۔ علوم طبیعی کا نشو و ارتقا اور قدرتی وسائل سے استفادہ کی صلاحیتیں اور سیاسی حکمت تو افراد انسانی کے دماغی کرشمے ہیں اور ان ہی کے اجتماع و تعاون سے اجتماعی قوت کا ظہور ہوتا ہے۔ اب سوچیے کہ یہ اجتماع و تعاون کیسے نمودار ہوتا ہے اور اس کا دائرہ کس طرح پھیلتا ہے؟

فرض کیجیے کہ آپ ایک دیس میں کھڑے ہو کر لوگوں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ آؤ اپنی اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو ایک مرکز پر جمع کردو۔ ماہرین علوم طبیعی اپنی اپنی تحقیقاتیں اور ایجادیں پیش کردیں، علمائے سیاست اپنے اپنے "جادوں" کا مظاہرہ کریں، دولت و سرمایہ کے مالک اپنے مال ڈھیر کر دیں، مزدور اور دہقان اپنی محنت کی متاع بیش بہا لے کر حاضر ہوجائیں!۔۔۔ کیا یہ آواز سنتے ہی دنیا تعمیل کرے گی؟ نہیں، ہرگز نہیں! وہ آپ سے دریافت کرے گی کہ ہم کاہے کو یہ دعوت مان لیں؟ چنانچہ آپ کو مقصد بتانا پڑے گا کہ آپ ایک اجتماعی ہیئت کی تشکیل کر کے سیاسی تمکن حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر آپ کا سیاسی تمکن فی نفسہٖ کسی کا مقصود نہیں ہو سکتا، آپ کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ اس تمکن کی غایت کیا ہے؟ چنانچہ آپ بتاتے ہیں کہ ہمارا مقصد نوع انسانی یا کسی ایک نسل و وطن کے فرزندوں کی فلاح و بہبود ہے۔ لیکن صرف اتنی توضیح بھی لوگوں کو آپ کے گرد جمع نہیں کر سکتی۔ آپ کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ فلاح و بہبود سے آپ کی مراد کیا ہے اور وہ کون سے اصول فکر و عمل ہیں جو جملہ بنی آدم یا آپ کی ہم نسل و ہم وطن برادری کی فلاح و بہبود کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ ان سارے پہلوؤں سے اگر آپ خواص و عوام کی "رضا" حاصل کر سکے تو وہ اپنی ساری صلاحیتوں اور ساری مادی قوتوں کے ساتھ آپ کے گرد سمٹ آئیں گے۔ پس مادی قوتیں جماعتی نظام میں خارجی حیثیت رکھتی ہیں اور جماعت کی داخلی قوت وہ اصول و مقاصد ہیں، جو انسانی رضا کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں۔ پس جماعتی قوت کا شجرۂ نسب مختصراً یہ قرار پائے گا:۔

اصول[1] و مقاصد ← انسانی آبادی[2] کی رضا ← مادی قوت[3] ← تمکن فی الارض[4]

انسانی رضا حاصل کر سکنے والے اصول و مقاصد کو جماعت کی ہیئت سے الگ کر دیجیے تو پھر آپ کے پاس نہ مادی قوت فراہم ہو سکے گی اور نہ تمکن فی الارض کا کوئی امکان رہے گا، بلکہ خود "جماعت" نام کی کوئی چیز بھی باقی نہ رہے گی، صرف منتشر افراد ہوں گے جن کے پاس ہر طرح کی صلاحیتیں ہوں گی مگر وہ کسی کام نہ آسکیں گی! پس اصول و مقاصد جماعتوں کے لیے اصل قوت ہیں جن سے انسانی رضا ظہور کرتی ہے۔

اصول و مقاصد کی جاذبیت آگے چلنے سے پہلے ہمیں اصول و مقاصد کی جاذبیت کا راز ڈھونڈنا ہے، کیونکہ اسی کے محور پر ہماری ساری بحث کا پہیہ گھومتا ہے۔ تو اب غور فرمائیے کہ آپ اردگرد کی دنیا کو اگر اس مقصد کی طرف بلائیں کہ لوگو اٹھو اور "زید" کی فلاح و بہبود میں اپنی ساری مساعی صرف کرنے کے لیے جماعت بندی کرو تو زید کے سوا شاید کوئی اور اس پر لبیک کہنے والا

نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ اپنی بات کی پنچ میں شاید آپ خود زید کا ساتھ دے جائیں ـــــ مگر اور کوئی "سر پھرا" آپ کو نہ ملے گا۔ اچھا پھر اگر آپ یہ دعوت دیں کہ "بکر" کی برادری کی بھلائی کے لیے جماعت بندی کی جائے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہ کہ بکر کی برادری آپ کے گرد جمع ہو جائے ـــــ مگر "زید" کی "عمر" کی "نتھو" کی "فتو" کی برادریاں تو آپ کی دعوت کو کوئی وقعت نہ دیں گی۔ پس معلوم ہوا کہ آپ کی دعوتِ فلاح کا دائرہ جتنے انسانی افراد کو محیط ہوتا ہے، آپ کی دعوت کی جاذبیت صرف انہی تک محدود رہتی ہے اور "رضا" صرف انہی کی حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اجتماعیات میں جن سیاسی جماعتوں سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ تجارتی فرموں کی طرح نہیں ہوتیں، بلکہ ان کا خطاب پوری انسانیت یا کم از کم ایک نسل اور ایک وطن کے پورے لوگوں سے ہوتا ہے، کیونکہ سیاسی تمکن کا حصول بہت بڑی اجتماعی قوت چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ مطلوبہ مادی قوت ہر پہلو سے مکمل کرنے کے لیے ہر قسم کے انسانوں کی رضا مطلوب ہوتی ہے اور قوم یا نسل کا کوئی عنصر ایسا نہیں ہوتا جسے قطعاً نظر انداز کیا جا سکے۔ اہلِ مال و منال ہوں یا اربابِ علم و فضل، ماہرینِ سیاست و تمدن ہوں یا مصنفین و اساتذہ، سپاہی اور انجینیر ہوں یا وکیل و ڈاکٹر، دہقان اور کسان ہوں یا مزدور اور قلی، تاجر اور سوداگر ہوں یا صناع اور اہلِ حرفت سبھی سے حسبِ استطاعت رضا اور مادی قوت کا چندہ لینا کسی سیاسی دعوت کے لیے ناگزیر ہے۔ پس کسی بڑے گروہِ انسانی کی رضا حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ من حیث المجموع اس پورے حلقہ کی فلاح و بہبود کو مرکزی مقصد قرار دیا جائے۔ اگر آپ فلاح و بہبود کے استحقاق سے کسی ایک عنصر کو محروم کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنی دعوت میں اس کے لیے کوئی جاذبیت نہیں چھوڑتے بلکہ الٹا اس کے خلاف اس عنصر میں منافرت پیدا کرتے ہیں۔ تاہم جس گروہ کو بھی آپ مخاطب کر رہے ہوں اگر اس کے ہر ہر طبقے، ہر ہر عنصر اور ہر ہر فرد کی فلاح و بہبود آپ کا مقصد قرار پاتی ہے تو وہ مطلوبہ جماعت بندی کے قالب میں ڈھل جائے گا۔

اب ہم اس مقصد کے حصول کا اساسی اصول معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات تو روشن ہے کہ فطرت کی تنوع پسندی نے کوئی سے دو انسانوں کو بھی مساوی نہیں بنایا ہے بلکہ اس نے اپنے ہمہ گیر مذاق کے ماتحت کسی کو مضبوط بدن دیا ہے کسی کو کمزور، کسی کو سالم الاعضا بنایا ہے کسی کو ناقص الاعضا، کسی کو ذکی و ذہین پیدا کیا ہے کسی کو بلید و احمق، کسی کو کثیر الافراد قبیلہ قسمت کیا ہے کسی کو خاندان سے بالکل محروم کر دیا ہے، کسی کو ہنروری میں چاق و چوبند بنایا اور کسی کو کمالِ فن کا زینہ چھونے بھی نہیں دیا۔ کسی کا ماحول ہمت افزا ہے اور کسی کا مایوس کن، کسی کو علم و فضل حاصل ہے اور کوئی جہل کی وادیوں میں بھٹک رہا ہے۔ کسی کو مال و منال میسر ہے اور کوئی افلاس و تنگ دستی میں گھرا ہوا ہے، کوئی طلاقتِ لسانی میں استاد ہے تو کسی کو سیدھی بات کرنی نہیں آتی، کوئی قلم سے دماغوں کو فتح کرتا ہے تو کوئی دوسرا الف بے لکھنا نہیں جانتا۔ پھر ان فروق و اختلافات کے ساتھ انسانی طبائع میں کبر و خود پرستی کے ظہور کے امکانات بھی رکھ دیے ہیں اور عجز و سرافگندگی کے میلانات بھی۔ اب یہ مختلف صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں کا انبوہ تمدن کے میدان میں اترتا ہے تو ہر طرف معرکوں اور تصادموں کا ایک طوفان امڈ آتا ہے۔ قوی قوت بازو سے کام لے کر ضعیف کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے۔ تونگر مال کے زور

سے مفلس کا خون چوسنے لگتا ہے، دماغ والا سادہ لوح کو بیچ کھاتا ہے، زبان کا استاد بے زبانوں کو چُل دے جاتا ہے اور انسان انسان کی اس کشمکش میں انسانیت دیوالیہ ہو جاتی ہے یعنی اس کے خزانۂ اجتماعی میں امن و مسرت کا ایک حبہ تک محفوظ نہیں رہ جاتا۔ "فطری عدم مساوات" کے ان خوفناک نتائج سے بچنے کے لیے انسان کو لازماً "اخلاقی مساوات" کے اصول پر اجتماعی نظم کی تشکیل کرنی پڑتی ہے جسے چلانے کے لیے وہ ریاست کے ادارے کو وجود دیتا ہے۔

اخلاقی مساوات کی صورت یہ ہوتی ہے کہ من حیث المجموع "انسان" کے فطری اور قانونی اور اخلاقی حقوق متعین کر دئے جاتے ہیں۔ اس تعین کو اہلِ قوت کی دسترس سے بچانے کیلیے ریاست "اجتماعی قوت" کو استعمال کرتی ہے جس کے مظاہر میں نظامِ عدالت و تعزیرات اور پولیس وغیرہ شامل ہیں۔ اس قوت کے فراہم کرنے میں نظامِ حکومت کو یہ ملحوظ رکھنا پڑتا ہے کہ جو زیادہ حصہ دینے کے قابل ہے وہ زیادہ دے اور جو کم دے سکتا ہے اس سے کم لیا جائے اور پھر اسے صرف کرتے ہوئے بھی یہ مدنظر رکھنا ہوتا ہے کہ جو کم محتاج ہے اسے کم ملے اور جو زیادہ محتاج ہے وہ زیادہ پائے۔ یوں سمجھیے کہ تمدن ایک ترازو ہے جس کے جھکتے پلڑے میں اربابِ قوت و غنا ہیں اور اٹھتے پلڑے میں اہلِ ضعف و احتیاج۔ اب حکومت کا عمل یہ ہوتا ہے کہ دونوں پلڑوں کو برابر کر دے اور اسی کا نام اخلاقی مساوات ہے جس کے ماتحت ذمہ داریاں "قوت" پر عائد ہو جاتی ہیں اور ضعف کو حقوق ملتے ہیں۔ جو جتنا قوی ہوتا ہے وہ کمزور کے مفاد کا اتنا ہی زیادہ ذمہ دار ہوتا ہے اور جو جتنا ضعیف ہوتا ہے وہ ذمہ داریوں سے اتنا ہی بری اور حقوق سے اتنا ہی زیادہ مستفید ہوتا ہے۔ پس انسانی ہیئت اجتماعیہ کی مجموعی فلاح و بہبود کے وسیع مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے جو اخلاقی مساوات ناگزیر ہے وہ ترازو کے پلڑوں کو برابر کرنے والے اصولِ عدل پر قائم ہوتی ہے۔ اس طرح جہاں مجموعی فلاح و بہبود مدنظر ہو اور اس کے لیے اصولِ عدل پر دعوت دی جائے وہاں انسانی رضا کے لیے جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔

نظام خدمت یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصولِ عدل کی کچھ اور توضیح کر دی جائے۔ عدل کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ سوسائٹی کے مختلف عناصر میں توازن قائم کر دیا جائے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان جن مختلف تقاضہائے فطرت کا مخاطب ہے ان سب کو پورا کیا جائے۔ ان مختلف حیاتی اور حیوانی اور اخلاقی تقاضوں میں سے کسی ایک کو نظرانداز کر دینا بھی اصولِ عدل کے منافی ہوگا۔ اسی طرح کسی تقاضے کو اس کی اصل حدود سے بڑھا چڑھا کر دیکھنا اور اسی طرح بعض تقاضوں کی اہمیت کو کم کر کے انھیں پیشِ نظر رکھنا بھی اصولِ عدل کی نفی ہے۔

مگر زندگی کے گوناگوں اعمال و کردار اور ضوابط و دساتیر میں روحِ عدل کا ساری ہونا اس امر پر منحصر ہے کہ عملیات کا خاکہ نظریات کے جن اساسی نقاط پر مرتب کیا جائے وہ سراسر حق اور مطابقِ واقعہ ہوں۔ پس جیسا کہ ہم انفرادی اخلاقیات پر بحث کرتے ہوئے مضمون کے حصہ اول میں واضح کر چکے ہیں عملیۂ عدل کیلیے نظریۂ حق لابدی اساس ہے، اسی اصول کے ماتحت جماعتوں کو کسی آبادی کی "رضا" حاصل کرنے کے لیے نظریۂ حق اور عملیۂ عدل دو لازم و ملزوم سرمایوں کی ضرورت ہے۔ جن کے مجموعے کو ہم "نظام خدمت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ "نظام خدمت" یا نظام حق و عدل کی علمبرداری ہی سے جماعتوں میں نوعِ انسانی کے لیے افادیت اور نفعیت پائی جاتی ہے جس کی بنا پر وہ تمکن کی مستحق ٹھہرتی ہیں۔ اور نظام خدمت سے ہٹ جانے کے بعد وہ اپنی افادیت کو کھو دیتی ہیں اور جماعتوں سے افادیت کے سلب ہو جانے کے نتیجے میں انسانی رضا ان سے منہ پھیر لیتی ہے اور ان کے اقتدار

کے محل کو میل لگ جاتی ہے، حتیٰ کہ اس کے کھنڈر ایک دن نوحہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یورپ نے بھی حق و عدل کی اہمیت کو "گول مول" طریقہ سے ضرور محسوس کیا ہے۔ کیونکہ ان کی افادیت ایک ایسی قطعی صداقت ہے جس سے انکار کرنے سے پہلے تاریخ نوعِ انسانی کے پورے دفاتر دریا برد کردینے چاہئیں۔ پس جہاں تک اساسی نظریات اور تعبیراتِ حقائق کا تعلق ہے ان کا آخری گول "حق" ہی کو تسلیم کیا گیا ہے اور تمام اماماں فلسفہ کا دعویٰ یہی ہے کہ ہمارا شغل "تلاش حقیقت" ہے۔ ہم "دوامی صداقتوں" کا کھوج لگانا چاہتے ہیں اور ہماری حرکت "ظن" سے "یقین" کی طرف ہے ___ کیونکہ واقعات کی غلط تعبیرات پر تعمیر ضوابط کا انجام بخیر نہیں ہوسکتا۔ اسی غرض کے لیے انسان کے ذہن میں فطرۃً حق کو پا لینے کی خواہش برسرِ عمل ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں جو ٹھوکریں کھائی گئی ہیں وہ منحصر ہیں ان ذرائع علم کی کمزوری پر جو تجربہ و مشاہدہ کے میدان سے آگے بڑھتے ہی اپنے اندھے پن پر سب سے بڑے گواہ خود ہی ہوتے ہیں۔

اسی طرح جہاں تک عملی اجتماعی ضوابطِ عمل کا تعلق ہے، دبے لفظوں نہیں، کھلے بندوں یہ مانا گیا ہے کہ "انصاف" ہی جماعتوں اور قوموں کے لیے وجہ بقا ہے۔ چنانچہ ابوالآبائے فلسفہ ارسطو نے اپنی اخلاقیات میں "اجتماعی عدل" کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کی توضیح میں یہ کہا ہے کہ "غیر منصفانہ قانون قانون نہیں ہے"۔ گاڈون اس سلسلہ میں یہ کہتا ہے کہ:-

> "اخلاق، فرض کا معیار کیا ہے؟ ___ انصاف! اور یہ اصول کسی خاص آب و ہوا سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس دوامی شعور پر قائم ہے جو انسان کے ساتھ ہر زمانہ اور ہر ملک میں پایا جاتا ہے! ___ اور اس اصول کی عام فہم شرح صرف یوں کی جا سکتی ہے کہ اپنی پوری قوتوں کے ساتھ سب کے مشترکہ مفاد کی خدمت کا نام انصاف ہے"!

پھر یہی شخص یہ بھی کہتا ہے کہ طاقت اگر وجہ جواز حکمت ہو تو عدل کی قطعی نفی ہے"۔ پھر ارسطو کے سیاسی انصاف کی ایک شرح یہ کی گئی ہے کہ "قانونِ فطرت سے جو قانون متصادم ہے وہ قابلِ اتباع قانون نہیں ہے"۔ اس سے آگے بڑھ کر دوسری صورت توضیح کی یہ اختیار کی گئی ہے کہ "انسانیت کے مشترکہ قانون سے ہٹا ہوا قانون ناقابلِ برداشت ہے" ___ وغیرہ!

پھر آدم گاڈنز وائٹ اپنی کتاب "مذہبِ کشادہ دلی" میں اعتراف کرتا ہے کہ "قانون ہمدردی (خدمت) ہی دراصل قانونِ ارتقا ہے"۔ اور فوادر میکیا ولی جیسا بے بصیرت شخص یہ کہتا نظر آتا ہے کہ "اسلحہ کے لحاظ سے کوئی شخص لاکھ مضبوط ہو، مگر ایک علاقہ پر بحیثیت حکمراں قدم رکھنے کے لیے اسے مقامی آبادی کی "رضا" کی بھی ضرورت ہے اور اسی "رضا" کو نہ پا سکنے کی وجہ سے لوئیس دوازدہم نے میلان کے علاقہ کو جس تیزی سے فتح کیا، اسی تیزی سے گنوا دیا"۔ پھر ایک موقع پر وہ بزور کہتا ہے کہ "مظالم چاہے سلطنت جیت لیں مگر وہ حقیقی عظمت کو نہیں جیت سکتے"۔

اب چاہے تعبیرات کتنی ہی مختلف ہوں، مگر انسانیت کو گمراہ کرنے والے تمام اربابِ فلسفہ نے کسی نہ کسی صورت میں اس سچائی کو تسلیم کیا ہے کہ نظامِ عدل و انصاف کی تعمیر ہی اجتماعی فلسفہ کا مقصود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عدل و انصاف کا قطعی معیار نہ پا سکنے کی وجہ سے یہ مقصود اب تک حاصل نہیں ہوا ہے۔ اس امر سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ نظامِ خدمت (نظریاتِ حق و ضوابطِ عدل) کی علمبرداری کے بغیر بھی جماعتوں کے لیے حصولِ اقتدار، بلکہ تحفظ وجود کی کوئی راہ موجود ہے۔

نظامِ انتفاع اگر آپ ان سطور کو پڑھ کر شاید چونک اٹھیں گے اور کہیں گے کہ "ہیں! کیا فی الواقع حق و عدل ہی وجہ اقتدار

ہے؟ کیا واقعی سیاسی تسلط لوگوں کی رضا پر منحصر ہے؟ ــــ اگر ایسا ہے تو یہ ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت کیا معنی؟ مزدوروں پہ سرمایہ داروں کا تسلط کیسا؟ لال ہندیوں اور حبشیوں پر سفید فاموں کی خدائی کیوں؟ ــــ آپ کا چونک جانا بجا ہے اور آپ کی کھٹک بہت معقول ہے، مگر یہ بھی صاف ہوئی جاتی ہے۔

سب سے پہلے نظام انتفاع کی ماہیت سمجھ لیجیے۔ یہ نظام "نظام خدمت" کی بالکل ضد ہوتا ہے۔ یعنی اس کی علمبردار جماعتیں سب کے مشترک مفاد کے لیے نہیں، بلکہ ایک حلقہ انسانی میں سے کسی ایک عنصر کی خدمت کو نصب العین بناتی ہیں اور بقیہ عناصر سے انتفاع کرتی ہیں۔ کچھ لوگوں کو اوپر چڑھانا اور کچھ کو نیچے گرانا اور گرائے رکھنا ان کو مطلوب ہوتا ہے۔ پھر یہ فطرت انسانی کے بعض مطالبات کو تو خوب زور شور سے ابھارنے والی ہوتی ہیں لیکن بعض مطالبات کو سرے سے کوئی وزن ہی نہیں دیتیں۔ پس ان کے حقیقی ابطال کی شکل "خلاف وضع فطری" ہوتے ہیں اور ان کی اساس نظریات باطل پر قائم ہوتی ہے۔ ایسی جماعتیں جن لوگوں کے مفاد کی خدمت کرتی ہیں ان کی "رضا" تو انھیں عین قانون بقائے انفع کے تحت حاصل ہوتی ہے مگر جن عناصر سے انھیں انتفاع کرنا ہوتا ہے ان پر اگر ان کی حیثیت آشکارا ہو تو ان کی رضا کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس اپنے نظام ظلم و جور کے ساتھ انتفاع پیشہ جماعتیں اگر ابھرتی ہیں تو "ساحری" ان کا خاص طریق کار ہوتا ہے جیسے وہ بعض عناصر کے مفاد کے لیے بعض دوسرے عناصر کے خلاف استعمال کرتی ہیں یعنی حقیقتاً تو یہ قاتل عالم ہوتی ہیں مگر بظاہر مسیحائی کا دم بھرتی ہیں۔ ظلم کے اسلحہ تو ان کی آستینوں میں پنہاں ہوتے ہیں مگر یہ پنجہ اور حق میں نظام حق و عدل کا۔ آخر جادو چل جاتا ہے اور انھیں اقتدار مل جاتا ہے مگر جب یہ اقتدار کو استعمال کرنے لگتی ہیں تو ان کی اصل حقیقت فاش ہو جاتی ہے۔ اس مرحلہ پر "مظلوم عناصر" کی رضا کا رخ ان سے پھر جاتا ہے اور وہ مزاحمت کرنے لگتی ہیں۔ اس مزاحمت کو کمزور کرنے کے لیے انتفاع پیشہ جماعتوں کو "قوت" خرچ کرنی پڑتی ہے۔ اب ایک انسانی حلقہ کی "رضا" کی نالی اس کے اقتدار کا حوض بھرتی رہتی ہے مگر دوسری طرف دوسرے حلقہ انسانی کی نالی اسے خالی بھی کرتی جاتی ہے۔ ابتدا میں حوض بھرنے والی نالی زیادہ کام کرتی ہے اور خالی کرنے والی کم، مگر بعد میں تدریجاً پہلی کی رفتار کم سست اور دوسری کی تیز ہوتی جاتی ہے۔ اسی تدریج کی وجہ سے ایک دفعہ اقتدار پا لینے والی جماعت کو مدت تک جمی جانے کا موقع ملتا ہے۔ کیونکہ "تدریج" کائناتی اور حیاتی اور اخلاقی سبھی قسم کے تغیرات کا مستقل خاصہ ہے۔

پس انتفاع پیشہ جماعت کا اقتدار کچھ اس طرح تحلیل ہوا کرتا ہے:-

قرن اول:-	قوت رضا (۱۰۰)	-	قوت مزاحمت (۱۰)	=	حق اقتدار (۹۰)
قرن ثانی:-	" (۸۰)		" (۳۰)	=	" " (۵۰)
قرن ثالث:-	" (۴۵)		" (۳۸)	=	" " (۷)
قرن رابع:-	" (۴۰)		" (۴۰)	=	" " (۰)

قوت رضا اور قوت مزاحمت جب برابر ہو جاتی ہیں تو کسی جماعت کے لیے اقتدار کا قائم رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اوپر نظام انتفاع کی جو ساحرانہ شکل بیان ہوئی ہے وہ اس صورت میں نمودار ہوتی ہے جبکہ ایک جم

مخاطبین ہی کے حلقہ میں ایک طرف "خدمت" کا طریق کار اختیار کرے اور دوسری طرف "انتفاع" کا۔ اس کی مثال دیکھنے کو سرمایہ دار ممالک کے نظاموں پر نظر ڈال لیجے۔ انگلستان، امریکہ، فرانس وغیرہ کی برسراقتدار اجتماعی ہیئتیں اپنی اپنی جغرافی قوموں کو بحیثیت مجموعی دعوت کا مخاطب بنانے پر مجبور ہیں مگر اپنے جانبدارانہ رجحانات کے تحت اپنی پوری قوم کے ... کی بنا دلانہ خدمت کی جگہ وہ اس کے سرمایہ دار عناصر کی خدمت کرتی ہیں اور ان کی خاطر محنت پیشہ عناصر کو انتفاع کے شکنجہ میں کستی ہیں۔ اب اس روش کے دوہرے اثرات یہ رونما ہوتے ہیں کہ ادھر سرمایہ دار عنصر اپنی نمائندہ مقتدر جماعت کی پشت پناہی کرتے ہیں اور ادھر محنت پیشہ عناصر اس کے خلاف زور کرتے ہیں۔ قانون فطرت کے ماتحت تدریجاً ان ظالمانہ اقتدار کی پشت پناہی کرنے والی طاقتیں کمزور ہو رہی ہیں اور ان کی مزاحمت کرنے والے عناصر قوت پکڑ رہے ہیں اور اس تغیر کا انجام ایک دن یہ ہوگا کہ جو قوی ہیں وہ کمزور ہو جائیں گے اور جو مظلوم ہیں ابھر کر اوپر آجائیں گے۔

نظام انتفاع جب اپنے مخصوص مخاطبین کے حلقہ سے باہر کام کرنا چاہتا ہے تو پھر وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ کہاں کس ملک یا قوم میں ایسا اقتدار پایا جاتا ہے جو اخلاقی یا مادی وجوہ سے ضعیف واقع ہوا ہو۔ جب کوئی ایسا شکار نظر پڑ آتا ہے تو کوئی انتفاع پیشہ قوم اس پر "ساحری" کا دام بچھاتی ہے اور اس کے ساتھ "قاہری" کے اسلحہ تیز کرتی ہے۔ آخر بدقسمت قومیں بے بس ہو کے رہ جاتی ہیں۔ اسی صورت حال پر اقبال نے کہا تھا:۔

"غضب ہے یہ فورِ انساں نوعِ انساں کی شکاری ہو"

مگر یہاں بھی مظلوموں کی طرف سے مزاحمت ہونے لگتی ہے۔ اس وقت تک کہ سیاسی ظلم کا خاتمہ ہو جائے۔ اور اس میں جو دیر لگتی ہے وہ قانونِ تدریج ہی کے ماتحت لگتی ہے۔

اس امر کا خیال رہے کہ نظام انتفاع کے ماتحت جس عنصر کی خدمت ہوتی ہے وہ بھی ... اور لذتوں کے حصول کے باوجود "اطمینان آمیز مسرت" سے محروم رہتا ہے کیونکہ نظام انتفاع کے ماتحت ایک قوم کے طبقات میں یا مختلف اقوام میں جو مزاحمت و کشمکش جاری رہتی ہے وہ اطمینان آمیز مسرت کی دشمن ہے۔ اور پھر آخری انجام تو ہمیشہ آنکھیں دکھا دکھا کر انھیں خوفزدہ کرتا ہے ـــــ یعنی جنگ یا انقلاب ـــــ جس کا عمل یہ ہے کہ نیچے والوں کو اوپر اور اوپر والوں کو نیچے کر دے!

"عنا" و "مزاحمت" کی آویزش | یہ تو ٹھیک ہے کہ نظام انتفاع کے ماتحت جو غالب فریق نفع میں رہتا ہے اس کے خلاف گھاٹے میں رہنے والے مظلوم عناصر زور کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ دعویٰ کہ مظلوم عناصر آخر کار اوپر آجاتے ہیں، غور طلب ہے کیا تعجب کا مقام نہیں ہے کہ غالب فریق جو سیاسی اقتدار کی پشت پناہی حاصل کیے ہوئے ہوتا ہے وہ ان نہتے گروہوں سے شکست کھا جائے جنھیں نہ اس کی سی علمی برتری حاصل ہے، نہ اس کی سی مالی قوت میسر ہے، نہ اس کی سی مضبوط تنظیم کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ نہ اس کی سی سیاسی فوقیت قسمت میں ہوتی ہے۔ لیکن دراصل یہ تعجب کا مقام نہیں ہے، یہ تعجب کا مقام اس لیے بن گیا ہے کہ ہم نے اس غلط فہمی کو حقیقت کا درجہ دے کر حالات کا مطالعہ کیا ہے کہ قوت صرف مادی، سیاسی ... کا نام ہے اور اخلاق نہ کوئی قوت ہے، نہ اسے ارتقائے حیات میں کوئی دخل ہے۔

... پر فطرتِ انسانی کبھی مطمئن نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ خود ظالم بھی جسے دوسروں کو مظلوم بنا رکھنے سے براہ راست

فائدہ حاصل ہوتا ہے، اس کا ضمیر بھی نظامِ ظلم کے خلاف دبی دبی نفرت کرتا ہے اور اس کی اخلاقیت چاہے کتنی ہی ضعیف ہو رہی ہو، بہر حال ظلم کے خلاف زور کرتی ہے۔ اب جب نظامِ انتفاع کے حامیوں اور اس کے دشمنوں میں تصادم ہوتا ہے تو اول الذکر گروہ کے پاس مادی قوت تو ہوتی ہے مگر اخلاقی قوت صفر ہوتی ہے، دوسری طرف مؤخر الذکر گروہ کے پاس مادی قوت نہیں ہوتی مگر اخلاقی قوت ہوتی ہے۔ مادیت اور اخلاقیت کے اس تصادم میں ظالم طبقے کے بیدار ضمیر افراد کے دل خود بخود ٹوٹ ٹوٹ کر مظلوموں کے ساتھ ہونے لگتے ہیں اور وہ اخلاقیت کے ہر حملے کے بعد اپنے مقامِ کبریائی سے کچھ نہ کچھ پسپا ہوتے جاتے ہیں۔ اس طرح تاریخ میں تدریجاً عظیم الشان سیاسی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔

مادیت اور اخلاقیت کے تصادم کی تاریخ کا کوئی سا صفحہ بھی کھول کر دیکھ لو، اخلاقیت کو اپنے مقام پر اٹل پاؤ گے، چاہے اس کے حامیوں پر کتنے ہی ظلم توڑے جائیں، مگر دوسری طرف اخلاقیت کے مقابلے میں مادی قوت کے علمبرداروں کو ہمیشہ اپنی جگہ سے سرکتا ہوا دیکھو گے، چاہے اس کا اقتدار مظلوموں پر کتنی ہی قاہرانہ گرفت کیوں نہ رکھتا ہو۔

حضرت عیسیٰ اور کبرائے یہود، حضرت موسیٰ اور اقتدار فرعون، محمد صلعم اور قریش، سیدنا حسین اور یزید، خلیفہ منصور اور علمائے حق، ان میں سے کسی کے تصادم کی داستان پڑھ جاؤ، ظلم اربابِ حق کی جان لے سکا ہے مگر انھیں ان کے موقف سے سرکا نہیں سکا، بلکہ الٹا انسانی خون کی ندیاں بہانے کی قدرت رکھنے کے باوجود آخر کار خائب و خاسر ہو کے رہا۔ نہتے اور بے وسیلہ لوگ محض اخلاقیت کے زور سے اوپر ابھر آئے ہیں اور زر و جواہر اور تخت و تاج اور افواج و عساکر رکھنے والے اکابرِ زمانہ کے پاؤں کے نیچے مسل گئے ہیں۔

یہ تو پرانی کہانیاں ہیں، نئی داستانیں جو آپ کے سامنے لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں، یہ سب اخلاقیت اور حق و عدل کی قوت کا راز کھولنے والی ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مصر اور برطانیہ کی سیاسی کشمکش میں کمزور مصر کامیاب رہا ہے اور قوی برطانیہ اپنے مقامِ اقتدار سے پسپا ہوا ہے؟ کیا یہ حق نہیں ہے کہ زارِ روس کی خدائی کا گلا اس بے بس رعایا نے گھونٹ دیا جس کی بے بسی کو انتہا تک پہنچانے کے لیے سائبیریا کی جہنم کی ساری عقوبتیں اس پر حملہ آور ہو گئیں، پھانسیوں کے پھندے اس کی گردنوں میں حائل ہو گئے۔ زندانوں نے اسے نگلنا شروع کر دیا، زنجیروں کے اژدہاؤں نے اس کی ٹانگوں سے لپٹنے میں پورے کمالات دکھائے مگر پھر بھی یہی بے بس رعایا غالب رہی۔

پھر جہاں اس نوعیت کا تصادم ابھی تک جاری ہے وہاں بھی آپ یہی صورتِ حالات دیکھیں گے۔ کیا یہ درست نہیں کہ فلسطین کو مغربی قاہری اس کی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکا سکی بلکہ خود اس قاہری کے لیے راتوں کی نیند اور دنوں کا چین حرام ہو گیا ہے؟ کیا یہ حق نہیں کہ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی و استقلال کو موت اور قید اور بندوقیں اور سنگینیں اور بھوک اور قرقیاں دبا دینے میں ناکام رہی ہیں، بلکہ الٹا کمزور ہندوستانیوں کو برسرِ حق ہونے کی وجہ سے صاحبِ اقتدار برطانیہ ہر آویزش کے بعد ان کے حق کی کچھ نہ کچھ قسط ادا کرنے پر مجبور ہوا ہے؟

انسانی دنیا کا سراسر مادیت پر انحصار اور اخلاقیت سے قطعی خالی ہو جانا ناممکن التصور ہے۔ اس کی روحانی توجیہ تو یہ ہے کہ اخلاقیت انسانی فطرت کے اٹل مطالبات کا نتیجہ ہے مگر اس کی مادی توجیہ بھی کی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اقتدار

ایک ہی ایک نوع نہیں، متعدد اقتدار بہ یک وقت موجود ہیں۔ اس وجہ سے کسی اقتدار کا معاملہ اپنے محکوموں اور مفتوحوں ہی سے نہیں ہے بلکہ اپنے برابر کے اور اپنے سے قوی تر اقتداروں سے بھی ہے اور ان اقتداروں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ خود مجبور ہوتا ہے کہ اخلاقیت ہی کے نام پر حریفوں کو اپیل کرے، حتیٰ کہ جنگ اور معاشی تصادم جیسے غیر اخلاقی سمجھے جانے والے مسائل میں بھی اسے اخلاقیت کا دامن قطعی طور پر چھوڑ دینے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اب ایک اقتدار جس حق اور جس عدل کا نام لے کر اپنے ہمسر حریفوں سے امور متنازعہ کو طے کرتا ہے، جب اس کے محکوم و مظلوم اسی حق اور اسی عدل کا نام لے کر اس سے اپنے مطالبات منوانا چاہتے ہیں تو وہ اس سے کامل روگردانی نہیں کر سکتا، کیونکہ اس روگردانی سے حق اور عدل کی قیمت کو وہ جتنا گرائے گا، اتنا ہی اپنا نقصان کرے گا۔ جس سکے کو وہ دوسروں کے سامنے پیش کر کے زیادہ سے زیادہ مطلوبات حاصل کرنا چاہتا ہے، اگر اسی سکے کو قبول کر کے وہ خود مطالبات حق وعدل کو ادنیٰ درجہ میں بھی پورا کرنے سے انکار کر دے تو آخر وہ کس منہ سے اور کس امید پر اسی سکے کو لے کر دنیا میں نکلے گا؟ اخلاقیت کے سکوں کی جو قدر خود اس کی اپنی منڈی میں قرار پائے گی، بیرونی منڈیاں اسی کی مناسبت سے ان کی قیمت متعین کریں گی۔ چنانچہ آپ نے دیکھا کہ حالیہ جنگِ عالمگیر میں جو بڑی بڑی سلطنتیں اس دعوے کے ساتھ میدان میں اتریں کہ ہم محکوموں کو حقِ آزادی دلوانے کے لیے اور جمہوریت و مساوات قائم کرنے کے لیے لڑائی لڑتی ہیں، پس دنیا کو ہماری امداد کے لیے پورے ذرائع صرف کر دینے چاہئیں، کیا ان سلطنتوں سے ان کے ایک ایک مخالف ایک ایک معاون نے یہ سوال پیش نہیں کیا کہ تم جو فلاں ملک کو غلام بنائے ہوئے ہو اور تم جو فلاں قوم کا خون چوس رہے ہو، تم پر کیسے بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ تم آزادی، اور مساوات اور جمہوریت کے نفاذ کے لیے تلوار اٹھا رہے ہو؟ ——— اور کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان طاقتوں کو اپنے محکوموں کے مقابلہ میں نرم ہونا پڑا؟

نظامِ ظلم و انتفاع کے ماتحت تدریجاً اربابِ اقتدار کی رضا میں ضعف اور مظلوموں کی مزاحمت میں شدت پیدا ہونے کی بھی مادی توجیہ ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ جب کسی سوسائٹی کا مجموعی نظم ظالمانہ ہوتا ہے تو پھر اس کے اندر ایک ایک گوشے میں ظلم ہی کو فروغ ملنے لگتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب انتفاع کو کارِ خیر مان لیا گیا ہو تو یہ ممکن نہیں کہ اس کا ایک خاص دائرہ متعین رہے۔ یہ دائرہ لازماً پھیلے گا۔ مثلاً کسی مقتدر سرمایہ دار عنصر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ملک کے محنت پیشہ عنصر کی ایک مقررہ تعداد کا خون نچوڑتا رہے، بلکہ اس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ اس ریوڑ میں خوب ترقی ہو اور نئے نئے موٹے تازے جانور اس میں بھرتی ہوتے رہیں۔ چنانچہ بڑے سرمایہ دار چھوٹے سرمایہ داروں کو رفتہ رفتہ اس ریوڑ میں شامل کرتے جاتے ہیں تا آنکہ ایک بالکل قلیل عنصر ظالموں کا رہ جاتا ہے اور مظلوموں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ ظلم کے اسی عمل کو معاشیات میں "تمرکزِ زر" کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ اصول صرف معاشیات ہی میں نہیں، ہر دائرہ میں چلتا ہے۔ فرض کیجیے کہ آدم خوری کو جائز قرار دے دیا جائے اور انسان انسانی گوشت کو غذا میں شامل کر لے اور قانون کی طرف سے عام اجازت ہو کہ آدمی کا شکار کیا جا سکتا ہے۔ اب جن جن لوگوں کو اچھی اچھی رانفلیں حاصل ہیں وہ نہتوں کو بھون بھون کر کھاتے پھریں گے، مگر بات نہتوں تک محدود نہیں رہ سکتی،

ر کار خود ان رائفلوں والوں میں آدم شکاری کا معرکہ شروع ہوگا، اچھی رائفل والا فشاد کا ماہر اونی رائفل
لے اور نشانہ میں کمزور رہنے والے حریف کو بھون بھون کر کھائے گا۔ آخر کار سب کا صفایا ہو جائیگا
کل اسی طرح پر دنیا کی سیاست چلتی ہے۔ پوری دنیا کی کمزور اقوام کے مقابلہ میں مقتدر اقوام کا ایک گروہ
جو ایک دوسرے کی رسمی پاسداری اور باہمی معاہدات وغیرہ کی وجہ سے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے بنی ہوئی ہیں۔
خود ان کے درمیان بھی صنعت و قوت کی معرکہ آرائی برسر کار ہے، چنانچہ ان میں سے بعض اقوام سربراہ کاری کرتی
، جیسے آجکل "تین بڑوں" کی بڑائی کے مظاہرے ہو رہے ہیں، مگر خود ان سربراہ کاروں میں بھی دبی دبی آویزش
جود ہے۔ اس آویزش میں جس ایک قوم کا پلڑا بھاری قرار دیا جائے اسے اگر گہری نظر سے دیکھیے تو اس کے اندرونی
قات میں وہی تصادم موجود ہے، پھر ان طبقات کے اندر بھی مختلف پارٹیوں میں رسہ کشی ہوتی ہے، اور پارٹیوں
تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فرد فرد میں بھی وہی مسابقت ہے اور ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ دوسروں کو نیچ کھائے۔
پس نظام انتفاع کے اندر خود ظالم عنصر کی مختلف پارٹیوں میں اور ان پارٹیوں کے افراد کے درمیان بھی یہی
مابقت جاری رہتی ہے کہ اوپر ہم ہی ہم ہوں، باقی سب نیچے ہو کے رہیں اور اس عمل کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ظالم عنصر
لے سکڑتے جانے سے نظام انتفاع کو جو پہلے معاونت حاصل تھی ادھر کمزوری پیدا ہونے لگتی ہے اور مظلوموں
ں تعداد میں اضافہ ہونے سے مزاحمت میں شدت آنے لگتی ہے اور اس کے نتیجہ میں کوئی انقلابی تحریک کامیاب
ہو سکتی ہے۔

کیا آپ کے دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ مظلوم جب نظام انتفاع کے خلاف چیخ پکار کر کے اخلاقی دباؤ پیدا کر لیتے ہیں
و آخر ظالم عناصر بھی کیوں نہیں برسر عام چیختے کہ دیکھو یہ لوگ ہمیں راحتوں اور آسائشوں سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور کیوں اس
شور پر انھیں اخلاقی زور نہیں حاصل ہو جاتا؟ اگر ہندوستانی چلا سکتے ہیں کہ انگریز ہمیں لوٹ کر کھا گئے تو انگریز کیوں نہیں
چلاتا کہ دیکھو ہندوستانی ہمارا اقتدار ختم کر کے ہمیں ان فائدوں سے محروم کر رہے ہیں جو ان کی غلامی سے ہمیں حاصل ہو رہا
ہے؟ ہمارے کارخانے تباہ ہو جائیں گے، ہمارے بہت سے لوگوں کی تنخواہیں اور پنشنیں بند ہو جائیں گی، ہماری تجارت کے
لیے منڈیاں نہ رہیں گی وغیرہ؟ مزدور اگر یہ فریاد کر کے اخلاقی زور پیدا کر لیتا ہے کہ سرمایہ دار میرا مال مار رہا ہے تو سرمایہ دار
کیوں نہیں انسانیت سے اپیل کرتا کہ دیکھو مزدور مجھے اپنا خون نہیں چوسنے دیتے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میری توند اتنی
پھولی نہ رہ سکے گی؟ کالی چمڑی والا حبشی اگر گوروں کے مظالم بیان کر کے ہمدردیاں حاصل کر سکتا ہے تو گورے
کیوں انسانی جذبات کو اپیل کر کے ہمدردیاں نہیں حاصل کر سکتے کہ دیکھو یہ کالی نسل ہماری برابری کر کے ہمارا
رتبہ گھٹا رہی ہے؟ اسی سوال کے حل سے تو وہ عظیم الشان راز کھلتا ہے جس سے مغرب نے چشم پوشی کر لی ہے۔
در اصل "قوت" کے استعمال سے انتفاع کرنے اور دوسروں کو گرا کر خود کو اوپر اٹھانے کے خلاف انسانیت
کی مزاحمت بالکل ایک ایسے قانون کے مطابق ہے جو طبیعی قوانین کی طرح اجتماعیات میں نافذ ہے، بلکہ غلط نہ ہوگا اگر
اسے "اجتماعی طبیعی قانون" کہا جائے۔ نظام انتفاع انسان کی حس اخلاقی کو کبھی اپیل نہیں کر سکتا بلکہ وہ فطرت انسانی کے خلاف

پیچیدگی کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے کہ انسانی اخلاقیت کو دبانے کے لیے مادی قوت کو استعمال کرے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ پانی کو نشیب کی طرف بہنے کے لیے کسی خارجی قوت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی یہ حرکت عین طبیعی قانون کے ماتحت ہے مگر آپ اگر اسے اس قانون کے خلاف بلندی کی طرف لے جانا چاہیں تو آپ مجبور ہوں گے کہ کوئی خارجی قوت اس پر صرف کریں۔ مثلاً کنویں سے پانی کھینچنا ہے تو رہٹ یا پمپ یا کوئی اور آلہ یا مشین استعمال کی جائے گی اور اس پر قوت صرف ہوگی۔ جسمانی قوت ہو یا تیل کی قوت، بھاپ کی قوت ہو یا برقی قوت! صرف قوت کے بغیر پانی کو ایک مصنوعی راستہ پر چلانا ممکن نہیں ہے۔

اجتماعیات میں بھی یہی اصول کام کرتا ہے۔ نظام اجتماعی اگر انسانی سوسائٹی کو انسانی فطرت پر برقرار رکھے گا اور اسی کے تقاضے سے نظام حق وعدل کو کارفرما کرے گا تو اس کی مزاحمت نہیں ہوگی اور اس وجہ سے مزاحمت کا زور روکنے کے لیے اسے فضول قوت صرف کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی لیکن جب وہ خلاف قوانین فطرت حرکت کرے گا تو قوت صرف کیے بغیر کوئی چارہ نہ ہوگا۔

آپ موجودہ سوسائٹیوں پر اگر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانی فطرت کی متعینہ راہِ حق وعدل سے انحرافوں کے ہٹ جانے کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بے شمار انسانی قوت ضائع جاتی ہے۔ مزدور اور سرمایہ دار کا تصادم ہو یا کالی اور سفید نسلوں کی کشمکش، عورتوں اور مردوں کی آویزش ہو یا والدین اور اولادوں کی رسہ کشی، طبقوں طبقوں کی فساد انگیزیاں ہوں یا قوموں قوموں کی کشت وخون، ان سارے دنگلوں پر بے حساب اجتماعی قوت ضائع ہوتی ہے۔ معاشرت میں ظلم کی کارفرمائی ہو تو خاندانی قوت کا ضیاع ناگزیر ہے، کیونکہ ماں باپ اور اولاد، بیویاں اور شوہر، ایک دوسرے کے سکون کو تہ وبالا کرنے کے لیے زور کرتے رہیں گے۔ معیشت میں اگر ظلم گھس جائے تو سرمایہ اور محنت دونوں کا بہت بڑا حصہ باہمی آویزش کی وجہ سے ضائع جاتا ہے۔ سیاست میں اگر فساد کا دخل ہو تو جماعتوں اور پارٹیوں اور لیڈروں اور صحافیوں اور مفکروں کی آویزش میں طاقت کی بہت بڑی مقدار رائگاں جاتی ہے۔ عام معاملات میں اگر حق وعدل کی نفی ہونے لگتی ہے تو افراد کی کھینچا تانی میں بہت سی انفرادی قابلیتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ اگر آپ کے پاس وسیع ذرائع ہوں اور باریک بینی سے آپ دنیا بھر کی فوجی، عدالتی، مکتبی، علمی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، اور انفرادی قوتوں کے ضیاع کا کامل اندازہ لگا سکیں تو آپ دیکھیں گے کہ انسانی مساعی کا ننانوے فیصدی حصہ محض ظلم وفساد کے خلاف جو مزاحمت ہوتی ہے اسے روکنے میں ضائع جاتا ہے۔

اب ذرا گذشتہ سطور کا خلاصہ پیش نظر رکھ لیجیے تاکہ آپ بسہولت کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

۱۔ کوئی نظام اجتماعی انسانی رضا کے بغیر نہیں چل سکتا۔

۲۔ نظام خدمت کو انسانی رضا حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ نظام انتفاع جس عنصر کی خدمت کرتا ہے، اس کی رضا اسے حاصل ہو جاتی ہے ـــــ مگر جس عنصر پر ظلم ہوتا ہے وہ اس کی مزاحمت کرتا ہے۔

۴۔ نظام انتفاع کی تائید میں ارباب ظلم کا زور مادی قوت رکھنے کے باوجود تدریجاً کم ہوتا جاتا ہے اور دوسری طرف مظلوموں کی مزاحمت کا زور مادی قوت سے محروم ہونے کے باوجود تدریجاً بڑھتا جاتا ہے تاآنکہ نظام انتفاع کا خاتمہ ہو جائے۔

۵- نظام انتفاع (ظلم) کو سوسائٹی میں بحال رکھنے کے لیے بہت سی انسانی قوت رائگاں جاتی ہے۔

ان نکات پر غور کرنے کے بعد ہر سلیم الفطرت آدمی لازماً اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ نظام انتفاع (ظلم و باطل) انسانی فطرت کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا اور برعکس اس کے نظام خدمت (حق و عدل) انسانی فطرت و طبیعت سے موافقت رکھنے کی وجہ سے پوری کامیابی سے پروان چڑھ سکتا ہے اور اسی کے اختیار کرنے سے جماعتوں میں انفعیت نمودار ہوتی ہے۔

مگر نہیں، ابھی ہمیں اس دعوی کے دلائل کو قوی تر کرنا ہے اور اجتماعیات میں فطرت کے جو طبیعی اخلاقی ضوابط برسرِ عمل ہیں ان کی توضیحات کی ضرورت ہے۔ (باقی آئندہ)

ہماری زیر طبع کتب

رسالہ دینیات — مسئلہ جبر و قدر — دین حق — مذہب کا انقلابی تصور

مسئلہ قومیت — تنقیحات — روداد جماعت اسلامی حصہ اول

جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع منعقدہ دارالاسلام

(سنہ ۱۹۴۵ء)

کی روداد چھپ کر مکتبہ میں آچکی ہے

قیمت — ۸/

مکتبہ جماعت اسلامی، دارالاسلام

جمال پور، پٹھان کوٹ

اشتراکی مغالطے

از جناب مولوی محمد مظہر الدین صاحب صدیقی

(یہ ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جو صاحب مضمون کے مزید اضافوں اور تشریحات کے بعد شائع کیا جارہا ہے)

اشتراکیوں کا خیال ہے کہ کسی نظامِ فکر کے مختلف اجزائے ترکیبی کا باہمی ربط و تطابق اُس کی صداقت کا معیار ہوا کرتا ہے۔ انھیں اس بات پر فخر ہے کہ اشتراکیت عقائد و نظریات کا ایک مربوط نظام ہے جس کا ہر جزو دوسرے جزو سے ہم رشتہ اور ہم آہنگ ہے۔ لیکن جس شخص میں ذکاوتِ طبع کا ذرا سا بھی مادہ موجود ہے، وہ اشتراکی نظامِ فکر میں متعدد رخنوں کا سراغ لگا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اشتراکیوں کی طرح معاشرتی اور اقتصادی تعصبات سے مغلوب نہ ہو۔ علاوہ ازیں اگر اس اشتراکی دعوے کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اشتراکی نظامِ فکر کے ترکیبی عناصر ایک داخلی ربط و تسلسل کے حامل ہیں، تب بھی محض یہ چیز اشتراکیت کے برحق ہونے کا کافی ثبوت نہیں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ کسی نظام کے اجزائے فکر کی باہمی مطابقت صداقت کا واحد معیار نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کی دروغ بافیوں میں داخلی ربط و تسلسل پایا جائے تو محض اس ربط کی بنا پر اس کی دروغ بیانیاں سچائیاں نہیں بن جائیں گی

تاہم جہاں تک داخلی ربط اور تطابقِ فکر کا سوال ہے، اس پہلو سے بھی اشتراکیت علمی تنقید کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر تاریخ کی مادی تعبیر کو لیجیے، جو قصرِ اشتراکیت کا سنگِ بنیاد ہے۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ تمام اخلاقی تصورات اور علمی نظریات زندگی کے معاشرتی ماحول اور خارجی واقعات سے پیدا ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اخلاقی افکار اور ذہنی تخیلات ان خارجی حالات سے الگ ہو کر کوئی حیثیت نہیں رکھتے جن میں کہ وہ رونما ہوتے ہیں۔ اس مفروضہ کی بنا پر تمام صداقتیں اپنے اپنے دَور کے لحاظ سے اضافی قرار پاتی ہیں۔ یعنی ہر صداقت جس دور کے خارجی حالات سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ اس دور کے ختم ہو جانے پر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی صداقت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے جو ہر زمانہ کے لیے یکساں طور پر صحیح ہو اور ابدی ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ اب اگر اشتراکیوں کا یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسانی افکار و تخیلات اور اخلاقی اقدار (Moral Valaes) خارجی احوال و واقعات کا عکس ہوتے ہیں۔ تو یہ بات مطلق سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ افکار و اقدار پر نیک و بد، محمود و مذموم یا حق و باطل ہونے کا اطلاق کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جو چیز خارجی حالات سے میکانکی طور پر پیدا ہو جائے اور ہمارے ارادہ و اختیار کے بغیر ہم پر زندگی بھر مسلط رہے وہ بری یا اچھی کیسے کہلائی جا سکتی ہے۔ روحانی تصورات اور اخلاقی افکار بے نتیجہ اور بے قیمت ہیں اگر وہ ہماری مادی زندگی اور خارجی ماحول سے میکانکی طریقہ پر وجود میں آتے ہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں ہماری عملی زندگی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا ہے اور نہ واقعات و حوادث کی تشکیل یا انسانی اعمال کی صورت گری میں ان کا کوئی حصہ ہو سکتا ہے۔ جس طرح ہم اپنے گرد و پیش اور اپنے خارجی ماحول کے اثرات سے بچ نہیں سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنے عقائد

وافکار اور اخلاقی تصورات پر عمل پیرا ہونے کے لیے بھی مجبور ہیں۔ کیونکہ وہ بھی ہمارے خارج اور ہمارے گرد وپیش سے وجود میں آتے ہیں۔ اس مفروضہ پر اخلاقی تصورات واقدار کا وجود تو تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن اُن کی انتزاعی اور عملی قدر وقیمت کا انکار لازم آتا ہے۔ نیز اس استدلال کی بنا پر ہر قسم کے معاشرتی مظالم، سیاسی جبر اور معاشی استحصال کو جائز ٹھیرایا جا سکتا ہے۔ اگر انسان خارجی احوال اور گرد وپیش کے اثرات کا مجبور بندہ ہے اور اس کی ذہنیت وسیرت بالکلیہ خارجی اثرات سے تشکیل پاتی ہے جن پر اسے کسی طرح کا اختیار یا قدرت نہیں ہے۔ تو پھر سرمایہ دار اپنی معاشی لوٹ کھسوٹ، سامراج کے نمائندے اپنے سیاسی ظلم وستم اور فاسسطی آمر اپنے جابرانہ طرز حکومت پر اسی طرح مجبور ہیں جس طرح اشتراکی حضرات اپنی انقلاب انگیزی اور مفسدہ پردازی پر اور حیوانات اپنی بہیمانہ سرشت پر۔ کائنات کا ہر ذرہ مقہور ومجبور ہے اور انسانی ارادہ واختیار ایک زعم باطل ہے۔ جب ہر طبقہ اور ہر گروہ خارج کا بے بس آلۂ کار ٹھیرا تو اس کی برائیوں اور ناانصافیوں کی ذمہ داری اس پر کیونکر عائد کی جا سکتی ہے۔ یہ سارا ظلم وفساد اس عمل ارتقاء (Evolutionary process) اور تاریخی وجوب (Historical Necessity) کے تحت رونما ہو رہا ہے جس کے نام پر اشتراکی حضرات اپنی تحریک چلا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر اشتراکی تحریک کامیاب بھی ہو جائے تو اس کی کامیابی حق وصداقت کی کامیابی نہیں بلکہ زور وقوت کی کامیابی ہو گی۔ کیونکہ حق وصداقت کا اطلاق ان اعمال وافکار پر نہیں کیا جا سکتا ہے جہاں ان سے اضطراراً بلا اختیار وارادہ اور خارجی ماحول کے دباؤ سے سرزد ہوں۔ خیر وشر اور حق وباطل کے تصورات انسانی اختیار اور ارادہ کے وجود کو مستلزم ہیں۔ جو انسان خارجی ماحول اور ارتقائی عمل کا غلام ہو اس کے لیے نہ حق وصداقت کوئی چیز ہو سکتی ہے اور نہ عدل وانصاف کوئی معنی رکھتا ہے۔ جو کچھ ہے، ہے، خواہ وہ ظلم ہو یا عدل، مساوات ہو یا نامساوات۔ اس کے سوا نہ کچھ ہو سکتا ہے اور نہ ہو سکتا تھا۔ انسانی تاریخ میں وجوب (necessity) ہی وجوب ہے۔ امکان (possibility) کا نام نہیں ہے۔

اب آئیے ذرا دیر کے لیے ہم اس نظریے کو خود تاریخ کی مادی تعبیر پر چسپاں کر کے دیکھیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ انسانی افکار وتخیلات اور علمی نظریات معاشرتی ماحول اور خارجی احوال سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کی صداقت اس معنی کر کے اضافی ہوتی ہے کہ جب وہ دور ختم ہو جاتا ہے جس کے مادی اور معاشرتی احوال نے ان نظریات وافکار کو پیدا کیا تھا، تو ان افکار ونظریات کی صداقت اور سودمندی بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تاریخ کا مادی نظریہ یعنی یہ دعویٰ کہ افکار ونظریات خارجی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں، کن خارجی حالات اور کس معاشرتی ماحول میں پیدا ہوا تھا۔ مفروضہ بالا کے تحت تاریخ کی مادی تعبیر کا یہ نظریہ اُن احوال خارجی اور اس سیاسی اور معاشرتی ماحول سے پیدا ہوا تھا جس میں مارکس اور انجلس نے زندگی بسر کی اور جس میں اُن کی ذہنی نشو ونما ہوئی۔ چونکہ اُس زمانے کے خارجی حالات اس وقت موجود نہیں ہیں اور کارل مارکس کے عہد سے دو تین صدی پیشتر یقیناً ان حالات کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس لیے اس مفروضہ اور اس نظریے کی بنا پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ عہد مذکور یعنی انیسویں صدی کے قبل اور اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کی تعبیر اس طرح نہیں کی جا سکتی ہے جس طرح اشتراکی حضرات ان کی عموماً تعبیر کیا کرتے ہیں۔ تاریخی واقعات کی توجیہ کا یہ طریقہ صرف انیسویں صدی کے لیے صحیح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسی صدی کے سیاسی اور معاشی حالات اس علمی نظریہ کی پیدائش کا سبب ہوئے تھے۔ اور اب جب کہ وہ حالات ختم ہو چکے ہیں، اس نظریہ کی صداقت بھی ساقط ہو گئی ہے۔ ماضی اور حال کے جملہ واقعات کی تعبیر وتوجیہ اس نقطۂ نظر سے کرنا خود مارکس کے اس بنیادی مفروضہ پر ظلم کرنا ہو گا کہ عقلی نظریات اور

اخلاقی تصورات خارجی ماحول کا عکس ہوا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اشتراکی حضرات قدیم اور جدید تاریخ کی توجیہ اسی مادی نقطہ نظر سے کرتے ہیں جو صرف اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے حالات سے وجود پذیر ہوا تھا۔ یہ عقیدہ رکھنے کے باوجود کہ کوئی صداقت ابدی اور عالمگیر نہیں ہے وہ تاریخ کی مادی تعبیر کو ایک عالمگیر اور ابدی صداقت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور تاریخ کے ہر دور پر اس کو بلا تکلف چسپاں کر دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تضاد خیال کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

اشتراکیت کے نظریات میں صریح تناقض اور عدم تطابق کا ایک دوسرا ثبوت اس کا وہ رویہ ہے جو اس نے مذہب کے متعلق اختیار کیا ہے۔ اشتراکیت مذہب کی شدید دشمن ہے۔ اشتراکی مفکرین کے نزدیک مذہب ہمیشہ ظالموں اور جفاکاروں کا آلۂ کار رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ فرماں روا طبقے کو ظلم و ستم، ناانصافی اور معاشی استحصال میں مدد پہنچائی ہے۔ مذہب ان کے نزدیک عوام الناس کے لیے افیون ہے۔ یہ خیال بنیادی طور پر لغو اور مہمل ہے۔ یا تو اس کے پیش کرنے والے قطعی طور پر مذہب کی تاریخ سے ناواقف ہیں، یا پھر وہ واقعات کی صورت کو اپنی خواہشات کے مطابق عمداً مسخ کر کے غلط طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ یہ اشتراکیت پسندوں کا ایک مرغوب مشغلہ ہے۔ پوری تاریخ ان کی اس غلط بیانی کی تردید کرتی ہے۔ تاریخ میں جہاں کہیں کسی دینی تحریک کی ابتدا ہوئی ہے اس نے ہمیشہ مظلوم انسانوں کا ساتھ دیا ہے۔ ظالم، غاصب اور ذاتی اغراض و منافع کو پیش نظر رکھنے والے ہمیشہ مذہب کے شدید ترین دشمن رہے ہیں۔ انبیاء کو جو کفار کی طرف سے ایک عام طعنہ دیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ دنیوی وجاہت کا مالک کوئی انسان تمہارے ساتھ نہیں ہے، تمہارے متبعین سب کے سب ایسے ہیں جنھیں سوسائٹی میں کوئی قدر و منزلت حاصل نہیں۔ ان کے اندر صحیح قوتِ فیصلہ ہی موجود نہیں ہے۔ قرآن نے انہی کے قول کو اس طرح نقل کیا ہے :۔

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ۔ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ۔	ہم نہیں پاتے تم کو مگر اپنے ہی جیسا انسان۔ اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمہاری پیروی کی ہو مگر ان لوگوں کو جو ہم میں کمینے ہیں بے سمجھے بوجھے اور تم کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

قریش اسی لیے آخر دم تک مسلمانوں سے برسرپیکار رہے کہ اسلام اس معاشرتی اور سیاسی تفوق کو مٹا رہا تھا جو انہیں معاشرے میں حاصل تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں جزیرۃ العرب کے حقوق یافتہ طبقات اسلامی تحریک کی ترقی سے خائف و ہراساں تھے۔ اسلام کی فتح دراصل مساوات کی فتح تھی اور یہی اس کی فوری ترقی اور حیرت انگیز کامرانی کی بہت بڑی وجہ ہے۔ انسان کے لیے افیون ہونا تو درکنار، اسلام تاریخ میں ایک عظیم ترین انقلابی قوت ہے جس کے سامنے فرانسیسی انقلاب یا روس کا اشتراکی انقلاب بالکل ہیچ نظر آتے ہیں۔ روس کا انقلاب ایک ایسے ملک میں برپا ہوا جو آبادی کی کثرت، رقبہ کی وسعت اور قدرتی وسائل کی فراوانی کے لحاظ سے دنیا کے تمام ملکوں پر فائق ہے۔ اس کے باوجود ایک طاقتور دشمن سے اپنے اولین تصادم کے موقع پر وہ اپنے خول میں سمٹ کر رہ گیا اور اس کو محض اپنی حفاظت اور بقا کے لیے دوسروں کی مدد کا دست نگر ہونا پڑا۔ لیکن اسلامی تحریک جو تمدنی مؤثرات سے دور، ایک خشک، بنجر، بے برگ و گیاہ اور قلیل آبادی رکھنے والے خطۂ زمین سے اٹھی اور فاتحانہ شان کے ساتھ پھیلتی اور وسیع ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ہندوستان کی سرحدوں سے لے کر بحر اوقیانوس کے سواحل تک، ایشیا اور افریقہ کا بیشتر حصہ اس کے حلقۂ اقتدار میں آ گیا۔ اور یہ سب کچھ اُس زمانہ میں وقوع پذیر ہوا جب کہ ذرائع آمد و رفت کی رفتار نہایت سست

تھی۔ جب کہ سٹیم انجن اور دخانی جہازوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ موٹر کار اور ہوائی جہاز کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روسی کو اسلامی انقلاب کے مقابلہ میں پیش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ اسلام نے اپنے دائرے میں داخل ہونے والی قوموں کی زندگیوں میں جو عظیم الشان تغیر پیدا کیا اس کا اندازہ کیجیے۔ فارس، مصر، شام اور الجیریا کے دور افتادہ خطوں میں رہنے والوں کو ہمیشہ کے لیے اسلام نے ایک مستقل طرز زندگی عطا کیا۔ گزشتہ بارہ صدیوں کے انقلابات، حتی کہ مغرب کی مادی تہذیب کی نظر فریب درخشانی بھی اُن کے اخلاقی اقدار اور دینی نقطۂ نظر کو تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اتنے وسیع الاثر اور دور رس نتائج رکھنے والے انقلاب سے اشتراکی انقلاب کو کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بسا اوقات معاشی مقاصد کے لیے مذہب کا ناجائز اور ناروا استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس میں مذہب کا کیا قصور ہے؟ افکار و نظریات کا کوئی سا مجموعہ، خواہ وہ دینی ہو یا غیر دینی، پست اور ذلیل مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہی الزام خود اشتراکیوں کے خلاف عائد کیا جا سکتا ہے۔ سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جو سماجی اور مذہبی قیود سے آزاد ہونا چاہتے ہیں جن میں متمول طبقوں کے وہ افراد بھی شامل ہیں جو آزادانہ تن پروری اور تعیش پرستی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور وہ تعلیم یافتہ نوجوان بھی شامل ہیں جو کہ ناقص تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہر قسم کی اخلاقی بندشوں کو توڑ دینا چاہتے ہیں، اشتراکیت کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ اور یہ محض اس لیے کہ اشتراکیت تمام مذہبی اور اخلاقی قیود کی نفی کرتی ہے اور اخلاق کی بنیاد محض مصلحت پرستی پر قائم کرتی ہے۔ اور اشتراکی بنا انفرادی اور شخصی اصلاح کی کوششوں اور اس کی لازمی مشقتوں سے انسان کو رہائی دیتا ہے۔ ان اشتراکیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ دنیا کے تمام مفاسد سرمایہ داری کی پیداوار ہیں اور اصلاح نفس کی حقیقت ایک خام خیالی یا خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو جائے گا اُس وقت معجزانہ طور پر تمام افلاس، بُرائی اور بے انصافی دنیا سے مٹ جائے گی۔ اشتراکی جنت میں اخلاقی قیود کے آثار باقیہ کو مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے محو کر دیا جائے گا اور انسان کو آزادی اور بے لگامی کی وہ بہشت حاصل ہو جائے گی جس کی نعمتوں سے جنگل کے شیر اور سمندر کی مچھلیاں لذت اندوز ہیں۔ اس طرح اشتراکیت سے دین اور اخلاق کے وہ دشمن ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں جنھیں نیکی سے اس لیے نفرت ہے کہ ان میں نیک اور شریف بننے کی ہمت اور سکت باقی نہیں ہے۔ جو نظام اخلاق سے اس لیے بیزار ہیں کہ وہ قدم قدم پر ان سے اصلاح اخلاق کی دائمی جدوجہد کا مطالبہ کرتا ہے۔

اشتراکیت کے نظریات میں صرف ایک صداقت ہے جو کہ بیک وقت اس کی زندگی اور قوت کا باعث ہے۔ وہ یہ کہ کوئی معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا، ترقی اور ارتقاء کا تو ذکر کیا ہے، جو اپنے افراد کی ایک کثیر تعداد کو ان وسائل حیات سے محروم رکھے جن سے کم از کم ایک اوسط درجے کی آسائش کی زندگی بسر کی جا سکے۔ نیز یہ کہ اگر سوسائٹی میں آپ مذہب، اخلاق اور دیگر اعلیٰ اقدار کی کارفرمائی چاہتے ہیں تو آپ کو طبقاتی اختلاف ختم کرنا ہوگا اور ایک ایسے اجتماعی نظام کے قیام کی کوشش کرنی ہوگی جو سوسائٹی کے ہر مرد و زن کے لیے کم از کم وہ ضروریات زندگی فراہم کرنے کا ذمہ لے جن سے جسم و جان کا رابطہ باسانی قائم رکھا جا سکے۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جسے ہر صحت مند اور ترقی پذیر معاشرے نے تسلیم کیا ہے۔ جہاں اسے تسلیم نہیں کیا گیا اس کا نتیجہ باہمی استیصال، ہلاکت اور تباہی کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ سوائے اس ایک نہایت اہم صداقت کے، جس کی حامل تنہا اشتراکیت ہی نہیں، تمام فلسفۂ اشتراکیت لغویات کا ایک انبار اور جزوی صداقتوں، غلط بیانیوں اور دروغ گوئیوں کا ایک طوفان ہے جس میں تاریخ انسانی کے واقعات کو مسخ کر کے اور ان میں جا بجا بری طرح قطع و برید کر کے پیش کیا گیا ہے۔

فریضۂ اقامتِ دین

از

جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

کسی با اصول جماعت کی زندگی اس کے اصولوں کی زندگی پر موقوف ہے، اگر اس کے افراد میں ان اصولوں کا سچا عشق اور یقین موجود ہو تو موت اس کو آنکھ نہیں دکھا سکتی، یہ عشق اور یقین اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ جماعت دنیا میں ایک غالب، سربلند اور باعزت جماعت کی حیثیت سے ہے یا ہو کر رہے گی اور پھر اسی عشق و یقین کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جماعت کا اجتماعی نظم و نسق اس کے اپنے ہاتھو میں ہو، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی ایسا اجتماعی نظم اس پر مسلط ہو جو اس کے محبوب اصولوں پر تعمیر نہ کیا گیا ہو اور اگر انقلابی حوادث نے اس کو کبھی یہ دن دکھا دیے تو اس کا ایک ایک فرد اس مچھلی کی طرح بے تاب و بیقرار رہے گا جس کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا گیا ہو۔ اس کو اپنے اصولوں کی محبت موت کی بازی کھیلنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ رائج الوقت نظامِ زندگی کے خلاف سراپا احتجاج اور مجسم اعلان جنگ بن جائے گا اور اس کے ساتھ کسی قسم کے تعاون یا مصالحت یا مداہنت کا تصور تک اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری انفرادی اور جماعتی زندگی کا تشخص انہی اصولوں سے وابستہ ہے جن کو اس نظام قاہر نے تہ و بالا کر رکھا ہے۔ پھر یقین ہے کہ یہ جماعت کبھی نہ کبھی اس نظام غیر کے حلقۂ غلامی کو اپنی گردن سے نکال پھینکے گی اور اپنے اصولوں کا نظام زندگی قائم کر کے دم لے گی، بشرطیکہ اس کی بہ نسبت اس کے اصول زیادہ طاقت، افادیت اور صداقت کے حامل ہوں اور اس کے پیروؤں کی بہ نسبت اس کے افراد میں اپنے اصولوں کے ساتھ زیادہ گہری عقیدت و فدویت ہو۔

لیکن ایک اجتماعی مسلک رکھنے والی اور با اصول جماعت کے افراد میں اگر کسی دوسرے نظام زندگی کے ساتھ جو ان پر کسی طرح مسلط ہو گیا ہو، تعاون یا مصالحت یا مداہنت کا رجحان پیدا ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ متاع حیات قومی کے محافظین نے خزانہ کی کنجیاں دشمنوں کے حوالہ کر دیں اور اب اس متاع کا لٹ جانا چند لمحوں کی بات ہے، جس کو شاید کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہو تو بچا سکے۔

اس کے بعد ایک تیسرا دور بھی آتا ہے جس میں افراد جماعت، مداہنت اور تعاون کی حدود سے تجاوز کر کے اس مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں انھیں اپنا اصولی اور اخلاقی موقف ہی یاد نہیں رہ جاتا ہے اور وہ اپنے اصول و مقاصد سے اتنے بیگانہ ہو جاتے ہیں کہ نہ صرف عملاً، اور بطیب خاطر، ان اصولوں کی بیخ کنی پر اپنی بہترین قوتیں اور صلاحیتیں صرف کرنے لگتے ہیں بلکہ اگر کوئی واقف کار ان کی اس خود فراموشی اور خود کشی پر انھیں متنبہ کرتا ہے اور یہ یاد دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ جن اصولوں کے خلاف تم اس وقت صف آرا ہو، وہی تمھاری رگِ حیات ہیں، تو وہ اس کی باتوں کو حیرت کے کانوں سے

سنتے اور انکار و تکذیب، طعن و تشنیع اور اختلاف و عناد کی زبانوں سے ان کا جواب دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں جماعت بحیثیت ایک اصولی جماعت کے فنا ہو جاتی ہے اور اس کے غدار اور نالائق فرزند اپنے ہی ہاتھوں اسے قبر کی گود میں سلا دیتے ہیں۔

دونوں موخر الذکر صورتوں میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس جماعت کے افراد بھی ہلاک و برباد ہو جائیں اور دنیا کی دولت اور سیاست میں ان کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہ جائے، بلکہ یہ ہر وقت ممکن ہے کہ عام قوانین طبعی پر عمل کر کے وہ اقوام عالم کی صفوں میں ایک نمایاں اور عظیم الشان پوزیشن کے مالک ہو جائیں، لیکن اپنی تمام تر شوکتوں اور عظمتوں کے باوجود ان اصول و مقاصد کے نقطۂ نظر سے، جن پر اس جماعت کی بنیاد قائم تھی، ان کا وجود و عدم برابر ہے، اصولوں کی لاش ان کے پیروں تلے روندی جا رہی ہو، ان کو اس سے کیا بحث کہ وہ فرشِ ذلت پر ہیں یا عرشِ عزت پر، ان کو اگر بحث ہے تو صرف اس بات سے کہ زندگی کے میدان میں ہم کو قائم و برپا کرنے کی ان کے دلوں میں لگن ہے اور وہ اس کے لیے اپنی جان، اپنے مال، اپنے ذرائع اور اپنے قوائے ذہنی و دماغی کی کتنی قربانیاں کر رہے ہیں۔ لیکن اگر یہ کچھ نہیں ہے تو یہ اصول ان سے اپنی برأت اور بے تعلقی کا اعلان کر دیں گے اور پھر اخلاق و دیانت کا ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ یہ لوگ بھی اپنی طرف سے انقطاع کا اظہار کر دیں۔ اب ان کے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ ان اصولوں کا نام لیں اور اپنے آپ کو اس جماعتی لقب سے موسوم کریں جو ان اصولوں کی صحیح نمائندگی کے سبب انھیں ملا تھا کیونکہ اب وہ ان کے نمائندے رہے نہیں۔

اسلام بھی ایک مکمل ضابطۂ زندگی اور ایک کامل اجتماعی مسلک ہے اور "ملت اسلامیہ" یا "امت مسلمہ" وہ بااصول جماعت ہے جس نے اسلام کے دیے ہوئے اصول پر اپنی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی ہے۔ لیکن زندگی کے دوسرے ضوابط اور اسلام کے ضابطۂ حیات میں ایک فرق ہے، اسلام کے علاوہ دنیا میں جتنے ضوابط زندگی پیش کیے گئے ان سب کی بنیاد، انسان کے اپنے دماغ کی پیداوار اور تجربات پر ہے، اس لیے مزید غور و فکر اور جدید تجربات اور معلومات کی روشنی میں اگر ان ضوابط کے اندر کسی ترمیم کی ضرورت ہوئی تو کر لی گئی اور بعض نئے اصولوں کا اس میں پیوند لگا لیا گیا جس پر اس ضابطۂ زندگی کے پرجوش نمائندوں اور گہرے سے گہرے عقیدت کیشوں نے بھی بسا اوقات کسی احتجاج کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن اسلام کا معاملہ بالکل برعکس ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ میرے اصول اور میرا پیش کردہ مسلک حیات کسی انسانی ذہن و دماغ کا نتیجہ نہیں بلکہ اس علیم و خبیر کا تجویز کردہ ہے جو واقفِ اسرار ہے، جو بنی نوع انسان کی تمدنی ضروریات، فطری مطالبات اور انفرادی و اجتماعی مصالح کا صحیح اندازہ داں ہے اور جس کی نگاہ سے انسانی فطرت کا کوئی گوشہ مخفی نہیں۔ اس لیے یہ مسلک حیات، فطرت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے، عالمگیر اور جاودانی ہے، زمان و مکان کی قیود اور قومی و جغرافیائی حدود سے ماورا ہے، غیر متبدل ہے اور انسانی علوم و افکار اور تجربات اس کی کسی ایک اصل میں بھی ترمیم نہیں کر سکتے اور اگر کسی نے اس مسلک کی اطاعت کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی یہ جسارت کرنی چاہی تو اس کا شمار اس کے باغیوں میں ہے نہ کہ اطاعت کیشوں میں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا یہ رویہ بہت سخت ہے۔ لیکن یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اسلام کا منکر ہو یا حقیقت اور [باطل] میں فرق کرنا نہ جانتا ہو اور علم الٰہی کو علم انسانی پر قیاس کرتا ہو۔ اگر وہ اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ اسلام کے پیش کیے ہوئے [اصول]وں کا سرچشمہ علم الٰہی ہے تو اس کے کسی نقطہ میں تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس کرنا بدترین سفاہت ہے اور اس [مسل]ک حیات کا ایک جانی دشمن بھی از روئے انصاف اس کو یہ حق دینے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ ایک طرف تو وہ اسلام [سے ع]قیدت اور پیروی کا دم بھرے اور دوسری طرف اس کے اصولوں پر عمل جراحی کرتا پھرے۔ ہاں اس کو یہ آزادی [حاص]ل ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو نہ مانے اگر اس کے دعوے کی صداقت میں اس کو تردد ہو اور اس کا سلک زندگی اس کے [نزدی]ک قابل ترمیم و اصلاح یا ناقابل عمل نظر آتا ہو۔

اس فرق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر کسی اور بااصول جماعت کے لیے بالکل [م]تضاد اصول اور طریقۂ زندگی سے تعاون یا مصالحت ممکن ہو تو ہو مگر اسلام کے نام پر بننے والی جماعت کے لیے تو کسی [غیر] اسلامی نظام زندگی سے مصالحت یا مداہنت کا تصور بھی ممکن نہیں۔ لیکن زمانہ کا انقلاب دیکھیے۔ یہ جماعت بھی آج انحطاط [و] تنزل کے دھکے کھاتے کھاتے بالکل اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں اسے اپنے اجتماعی مقصد زندگی کا نام تک یاد نہیں اور خود فراموشی و خودکشی کے عبرتناک مظاہرہ میں سرگرم عمل ہے۔ ابتدا میں، ہر بااصول زندہ جماعت کی طرح، یہ جماعت [بھی] اپنے اصولِ حیات اور مسلک زندگی کا سچا عشق و یقین اور بے مثل جذبۂ جاں نثاری لے کر اٹھی اور اس طرح اٹھی [کہ ب]ڑی سے بڑی جانی و مالی مصیبتیں سامنے آئیں، سخت سے سخت خطرات کا مقابلہ ہوا، رات کی نیند اور دن کا سکون [حرا]م ہوگیا، قید و بند اور دار و رسن کی آزمائشیں عام ہوگئیں، تپتی ہوئی ریت اور دہکتے ہوئے کوئلوں کی سزائیں دی [جا]نے لگیں، گھر چھوڑنا پڑا، عزیز و اقارب سے علٰحدہ ہونا پڑا، پیٹوں پر پتھر باندھ باندھ کر بھوک کی آگ دبانی پڑی۔ مگر تاریخ [شا]ہد ہے، اور اس شہادت کی سچائی اور حقانیت کا انکار بڑے سے بڑا دشمن اسلام بھی نہیں کرسکا، کہ ہولناک مصائب کے [ا]منڈتے ہوئے طوفان میں بھی اس جماعت نے کبھی اپنے ایک اصول کو بھی مجروح نہ ہونے دیا اور نہ وہ اپنے موقف [سے] ایک انچ ہٹنے پر کبھی راضی ہوئی۔ حالانکہ اگر وہ ذرا بھی مصالحت اور مداہنت کو راہ دے دیتی تو یہ سارا ہنگامۂ مصائب [ختم ہو] جاتا، شب و روز کی بے اطمینانی امن و سکون سے بدل جاتی، معاشی خستہ حالیاں دور ہوجاتیں اور پورا عرب اس کی [سیا]سی برتری کو بھی بڑی آسانی سے قبول کر لیتا جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے اور قرآن کے اجمالی اشارات سے معلوم ہوتا ہے:-

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ — وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم ذرا مداہنت برتو تو وہ بھی مداہنت کی پالیسی اختیار کر لیں

لیکن اس کے پیرو جانتے تھے کہ یہ مداہنت ہمیشہ کی موت ہوگی اور اپنے اصولوں کو چھوڑنے کے بعد ہمارا وجود، اپنے مقصد [کے لح]اظ سے، بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی بار بار تنبیہ آتی رہتی تھی کہ:-

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ [أَهْوَاءَ]هُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ...... وَأَنِ [احْكُمْ] بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ

پس اے پیغمبر! ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور اس حق کو چھوڑ کر، جو تمھارے پاس آیا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو ...... اور ان کے معاملات میں اس قانون کے

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكَ (مائدہ - ۷)

مطابق فیصلہ کرو جس کو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور ان کی خواہشات نفس کا لحاظ نہ کرو اور دیکھو! ہوشیار رہو، کہیں یہ لوگ تم کو اس راہِ حق اور ان قوانین ہدایت سے ذرہ برابر بھی برگشتہ کر کے فتنہ میں نہ ڈال دیں جن کو اللہ نے تم پر نازل کیا ہے۔

اس لیے اس جماعت کے رہنما اور پیکر عزم و یقین پیرو، سب کے سب آگ و خون کے طوفانوں میں بھی اپنے مرکز پر جمے رہے اور حالات کی کوئی ناسازگاری یا مصلحت انھیں اپنے مسلک سے یک سرمو بھی نہ ہٹا سکی اور نہ اپنے اصول کے بارے میں انھوں نے وقتی طور پر بھی، مداہنت سے کام لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے تمام ہنگامی مسائل، مادی مصالح، ظاہری تدابیر اور دنیوی مفاد سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور ایک جنون ہے جس نے انھیں "عقل و دانش" کا دشمن بنا ڈالا ہے، چنانچہ اس زمانہ کے سیاست دانوں اور مدبروں کا متفقہ فیصلہ بھی ان کے بارے میں یہی تھا کہ غَرَّ هٰٓؤُلَاۤءِ دِیْنُهُمْ (انھیں ان کے دین نے فریب میں مبتلا کر دیا ہے) مگر جلد ہی دنیا نے اس "خود فریبی" کا انجام دیکھ لیا اور سیاسیات عالم میں وہ انقلاب آیا جس کی منطقی توجیہ کرنے میں عروج و زوال امم کے نکتہ دانوں کی عقلیں دنگ ہیں۔ جن کو اپنے گھروں میں بھی سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی، قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت ان کے قدموں میں آپڑے اور پوری ایک صدی بھی گذرنے نہ پائی تھی کہ وہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے براعظموں کے بیشتر حصوں پر چھا گئے۔ اور یہ سب کچھ اس یقین و ایمان اور وفاداری و فداکاری کے طفیل ہوا جو ان کے دلوں میں اپنے اصول و مقاصد کے لیے موجود تھی اور جس نے انھیں اپنے مسلک زندگی کے لیے جینا اور مرنا سکھا دیا تھا۔

اس کے بعد اس جماعت پر وہ دور آیا جب اس کے افراد کے ذہنوں میں اصول و مقاصد کے نقوش ماند پڑنے لگے اور مختلف خارجی اسباب کے باعث ان کے اندر مداہنت کی بیماری جڑ پکڑنے لگی جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی گئی، غیر اسلامی اصول و نظریات مسلمانوں میں کثرت سے پھیلنے لگے جن کی روک تھام کے لیے علماء حق کی طرف سے بہتری کوششیں بھی ہوتی رہیں مگر ناتربیت یافتہ عوام الناس کی خام مذہبیت اور حکومتوں کی فرض ناشناسی نے ان کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہ ہونے دیا اور یہ بیماری آہستہ آہستہ اسلامی اصول کی جڑیں کھوکھلی کرتی رہی۔ لیکن جب تک اس جماعت کا سیاسی اقتدار قائم رہا، ان اصولوں کے بارے میں اس نے بحیثیت مجموعی خود فراموشی اور خودکشی کی راہ نہیں اختیار کی۔ لیکن، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، یہ مداہنت اور مصالحت کی پالیسی بجائے خود موت کا پیش خیمہ ہے۔ جس سرچشمہ سے جماعت کی سیاسی طاقت کو غذا ملتی تھی، جب اس سے اس نے اعراض برتنا شروع کیا تو اس کا لازمی نتیجہ سیاسی زوال کی شکل میں نمودار ہوا جس کے بعد ہی اس پر تنزل اور انحطاط کا آخری دور شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ یہ جماعت اپنے آپ کو پہچانتی بھی نہیں، اس کے افراد کی غالب ترین اکثریت اپنے اصول و مقاصد، اپنے مسلک اور اپنے وجود کی غرض و غایت کو اس طرح فراموش کر چکی ہے کہ اگر ان چیزوں کو اس کے سامنے رکھا جائے تو نہ صرف ان سے اجنبیت اور بیگانگت محسوس کرتی ہے بلکہ پوری طمانیت قلب اور ادعائے تحقیق کے ساتھ اس کو غیر اسلام ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے اور جو چیز ان اصولوں کی عین ضد ہے اس کو اسلام کا منتہائے مقصود قرار دینے پر مصر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تمام ترجد و جہد اپنے ہی مقصد حیات کی پامالی پر مرکوز ہے اور خوش فہمی یہ ہے کہ یہ اسلام اور جماعت مسلمین کی سرفرازی کا باعث ہوگا۔ وَحَسْبُهُمْ

یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔

ایک تھوڑی سی تعداد ایسے لوگوں کی بھی اس جماعت میں موجود ہے جو خود فراموشی اور خودکشی کے اس مقام تک ابھی نہیں پہنچی ہے، اس کی نگاہ اپنے نصب العین کے جلووں سے ابھی تک آشنا ہے، وہ اسلام کے اصول و مقاصد کی یاد اپنے سینوں میں دبائے ہوئے ہے۔ مگر یہ یاد محض ایک "متبرک یادگار" بن کر رہ گئی ہے جس میں زندگی کی حرارت یا تو مفقود ہو چکی ہے یا اتنی خفیف کہ محسوس نہیں ہوتی۔ الا ماشاء اللہ۔ حالات کی ناسازگاری، مخالف قوتوں کی قہاری اور ماحول کی نامساعدت نے سروں میں وہ سودا باقی نہیں رہنے دیا جس کے بغیر کسی اصول یا مقصد کا نام لینا ہی حرام ہے۔ ان لوگوں نے مداہنت اور مصالحت کی پُرامن روش اختیار کر رکھی ہے اور اس امر کی پوری احتیاط کرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان پر سیاست و تدبر کی زبان سے غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ کی پھبتی نہ کس دی جائے۔

ان حالات میں یہ جماعت اگر دنیوی جاہ و اقبال کی مالک ہوتی تو بھی اسلام کو اس سے کوئی بحث اور دلچسپی نہ ہوتی اور نہ اس کا مجرد سیاسی اقتدار اس کی نظروں میں کوئی وقعت رکھتا، اس کو تو جو کچھ بحث و دلچسپی ہے صرف اپنے نصب العین کی اقامت سے ہے، اس نصب العین کو پس پشت ڈال کر اگر اس کے نام لینے والوں نے دولت کونین بھی حاصل کر لی تو اس کے کس کام کی؟ مگر بدقسمتی سے یہ چیز بھی آج اس جماعت کو حاصل نہیں۔ اس نے اپنے اصول زندگی کو ترک اور فراموش کر کے جو کچھ پایا وہ ذلت اور محکومی کا وہ داغ ہے جو ہر جماعت کی پیشانی پر تو لگ سکتا ہے مگر سلطانِ کائنات کی پارٹی —— حزب اللہ —— کی پیشانی پر کبھی نہیں لگ سکتا۔

قرآنی فلسفۂ عروج و زوال امم یہاں ایک ایسا سوال پیدا ہوتا ہے جو آجکل عام مسلمانوں کے ذہنوں میں بار بار کھٹکتا اور ان کے لیے بڑی حیرانی کا باعث بنا ہوا ہے، وہ رہ رہ کر یہ سوچتے ہیں کہ آخر ہماری موجودہ زبوں حالی کا سبب کیا ہے؟ یہ ہمیں تسلیم ہے کہ ہم بدعمل ہو گئے ہیں، ہمارے ایمان میں کمزوری آگئی ہے، ہمارے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں، ہم احکام دین سے غافل ہیں، یہ سب کچھ صحیح، مگر پھر بھی ہم ہی توحید کے تنہا علمبردار ہیں، ہم اگر اپنے سر جھکاتے ہیں تو خدا ہی کے سامنے جھکاتے ہیں۔ اس کے رسول کا حلقۂ اطاعت ہے تو صرف ہماری گردن میں ہے، اس کے احکام پر اگر کچھ عمل کرتے ہیں تو ہم ہی کرتے ہیں —— اور ہمارے بالمقابل ساری دنیا کا فرد مشرک ہے، خدا کی باغی اور توحید کی منکر ہے، رسول کی مخالف اور قرآن کی دشمن ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم پست وہ سربلند، ہم مفلس اور وہ دولتمند، ہم ذلیل و خوار اور وہ صاحبِ اقتدار، ہم غلام و محکوم اور وہ آزاد و حکمران۔ حالانکہ ہم بہرحال غیروں کی بہ نسبت اللہ سے زیادہ قریب ہیں اس لیے ان کے مقابلہ میں ان الٰہی انعامات کے ہم زیادہ مستحق تھے نہ کہ وہ!

یہ سوال عروج و زوال امم کے اس فلسفہ سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے جس کو قرآن حکیم نے بیان فرمایا ہے ورنہ طبعی اور اخلاقی، دونوں حیثیتوں سے ہم ٹھیک اسی مقام پر ہیں جہاں ہونا چاہیے تھا۔ اس کشمکشِ حیات میں دو قسم کے قوانین مصروف عمل ہیں۔ ایک تو قوانین طبعی، دوسرے قوانین اخلاقی[1] قوموں کے ابھارنے اور گرانے میں یہ دونوں

[1] اخلاقی سے ہماری مراد قرآنی اور دینی اخلاق ہیں، نہ کہ افادی تجربی اخلاق، ورنہ افادی اور تجربی اخلاق سے عاری ہو کر (بقیہ بر صفحہ ۵۸)

قسم کے قوانین کام کرتے ہیں، مگر دونوں میں ایک فرق ہے، اور وہ یہ کہ تنہا قوانین طبعی ایک قوم کو میدان مقابلہ میں فتح و غلبہ دلا سکتے ہیں لیکن قوانین اخلاقی میں قدرت نے یہ قوت نہیں رکھی کہ وہ تنہا کسی قوم کو اٹھا کر تخت سلطانی پر بٹھا دیں۔ قوانین اخلاقی کو قوموں کی باہمی کشمکش اور جنگی معرکوں میں "خصوصی اختیار (Veto Power)" کی حیثیت حاصل ہے، یعنی اگر دونوں فریق جنگ صرف مادی تیاریوں کے ساتھ نبرد آزما ہوں تو فتح اس کی ہوگی جو زیادہ اسباب و ذرائع جنگ کے ساتھ میدان مقابلہ میں آیا ہوگا اور اگر ایک طرف مادی قوتیں ہوں اور دوسری طرف محض اخلاقی اور روحانی قوتیں ہوں تو فریق ثانی کا شکست کھانا یقینی ہے، لیکن اگر مادی قوتوں اور اسباب و ذرائع کے اعتبار سے دونوں فریق برابر ہوں مگر ساتھ ہی ایک فریق اخلاقی آلات سے بھی مسلح ہے تو اس کا غالب ہونا بھی یقینی ہے بلکہ قرآنی تصریحات تو یہ بتاتی ہیں کہ اگر مادی وسائل کے اعتبار سے وہ فروتر بھی ہو، حتیٰ کہ اگر فریق مخالف کا دسواں حصہ ہو تو بھی اللہ تعالیٰ کی غیبی اور مافوق الفطری اعانتیں اس کو کامرانی اور فتح مندی سے ہمکنار کر دیتی ہیں، لیکن شرط یہی ہے کہ ایک طرف تو اس نے اپنے امکان اور مقدور بھر مادی وسائل اور تدابیر سے کام لینے میں دریغ نہ کیا ہو اور دوسری طرف قرآنی مطالبات کے مطابق اپنے ایمان کو صحیح اور اعمال کو صالح بنا لیا ہو۔ یعنی یہ کہ اس میں اپنے اصولوں کا حقیقی عشق اور اپنے مسلک زندگی کا زندہ جنون موجود ہو۔ تائید غیبی اور اعانت مافوق الفطری کا یہی وعدہ ہے جو قرآن کی ان آیات میں کیا گیا ہے:-

۹) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ (انفال - ۸)	اور کافر ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ وہ بازی لے گئے، نہیں وہ ہم کو عاجز نہ کر سکیں گے۔
۱۰) كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ	کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر بحکم خدا، غالب ہوئی ہیں۔
۱۱) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (انفال - ۸)	اے نبی تمہارے لیے اللہ کافی ہے اور تمہارے پیرو مسلمانوں کے لیے۔
۱۲) لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران - ۱۴)	نہ سست پڑو اور نہ غمگین ہو، تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔
۱۳) إِنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ	یقیناً زمین کے وارث میرے صالح بندے ہی ہوں گے۔
۱۴) وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (مائدہ - ۸)	اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کو اپنا ساتھی بنائے گا (وہ بامراد اور سربلند ہوگا) کیونکہ اللہ ہی کی جماعت غالب رہنے والی ہے۔

اس اعانت غیبی کے ظہور کی مثالیں ہر دور میں پائی جا سکتی ہیں، خود اس امت کی ابتدائی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ بدر و احد اور احزاب و حنین کے معرکوں میں خدا کی "غیر مرئی افواج" نے جو کچھ کیا اس پر قرآن تک کی شہادت

ملحوظ رہے کہ محض قوانین طبعی کے بل پر بھی کوئی قوم فتح و غلبہ نہیں حاصل کر سکتی۔ یہاں ہم نے افادی اور تجربی اخلاق کو بھی قوانین طبعی کے ضمن میں شمار کیا ہے۔ یہاں عام اقوام کے عروج و زوال سے ہم بحث نہیں کر رہے ہیں بلکہ امت مومنہ کے عروج و زوال تک یہ بحث محدود ہے۔

موجود ہے جس کا انکار کرنے کے لیے پہلے قرآن کا انکار کر لینا ضروری ہے۔

نعمت بقدر رحمت لیکن جہاں اس جماعت کو قدرت کی یہ خصوصی نظرِ عنایت حاصل ہے، وہیں اس کی ذمہ داریاں بھی بہت نازک ہیں، اور اس کو اس وعدۂ خاص کے ساتھ ایک وعیدِ خاص بھی سنا دی گئی ہے جس کی طرف سے اس نے اپنے کان بند کر لیے ہیں لیکن یہی کان بند کر لینا اس کے لیے بڑی غلط فہمیوں اور ہلاکتوں کا باعث بن گیا اور وہ سوال پیدا کر گیا ہے جس کو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں، اس کی محبوبیت اور مبغوضیت، اور اس کی جزا و سزا کا یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ جس فرد یا گروہ پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم جتنا ہی زیادہ ہوتا ہے، اس فضل و کرم کی ناشکری اور احکامِ الٰہی سے بغاوت کے وقت اس کی گرفت بھی اتنی ہی زیادہ سخت اور ہولناک ہوتی ہے، اور محکومی و نامرادی کی جو سزا وہ دوسری قوموں کو برے اعمال کی پاداش میں دیا کرتا ہے، ٹھیک انھی برے اعمال کے ارتکاب پر اس قوم کو اس سے دوگنی یا کئی گنی سزائیں دیتا ہے جو اس کے انعامات سے سرفراز ہو۔ اس آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ محبوب اور مقرب بندہ جو عالمِ وجود میں آیا وہ محمد رسول اللہ صلعم تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ان انعامات سے نوازا جو کسی کو بھی نصیب نہ ہوئے اور جن پر اس نے اپنی نعمت کی تکمیل کر دی، مگر ساتھ ہی انھیں یہ بات بھی سنا دی گئی تھی کہ:

وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا إِذًا لَأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا (بنی اسرائیل ۸)

اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم ان کفار کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے (اگر ایسا ہوتا تو) یقیناً ہم اس وقت تم کو زندگی اور موت دونوں میں (یعنی دونوں جہان میں) دوہرا عذاب چکھاتے، پھر تم ہمارے مقابل کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔

ازواج مطہرات کو جہاں یہ رتبہ بخشا گیا تھا کہ وہ امہات المومنین ہیں اور ان کی حیثیت عام عورتوں جیسی نہیں ہے (يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ) اور یہ کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی صدقِ دل سے تابعداری کریں اور اچھے کام کریں تو عام لوگوں کی بہ نسبت ان کو دوگنا اجر ملے گا (وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُؤْتِهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيمًا (احزاب ۴) وہیں اس حقیقت سے بھی انھیں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ:

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (احزاب ۴)

اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کسی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوگی اس کو دوگنا عذاب دیا جائے گا۔

یہودی قوم وہ قوم ہے جس پر انعاماتِ الٰہی کی بارش ہوتی رہی، جس کو دشمن سے بچانے کے لیے سمندر خشک کر دیا گیا، جس کی معاشی مشکلات کے وقت من و سلویٰ کا نزول ہوتا رہا اور بقول بائبل جس کی بیاباں نوردی کے وقت خود خداوندِ عالم بدلیوں کی شکل میں اس پر سایہ کرتا ہوا چلتا، اور جس کو، بقول قرآن، تمام اقوامِ عالم پر فضیلت دی گئی تھی لیکن جب اسی محبوب اور لاڈلی قوم نے اپنے عہد کو فراموش کر دیا، اپنی ذمہ داریوں کو پسِ پشت ڈال دیا، احکامِ الٰہی سے سرتابی کر بیٹھی اور فسق و فجور میں غرق ہو گئی تو اس پر اللہ کا غضب اس طرح ٹوٹ پڑا جس کی نظیر پیش کرنے سے پوری تاریخ انسانی قاصر ہے۔ جتنی یہ قوم سربلند تھی اتنی ہی ذلیل ہو گئی، جس قدر محبوب تھی اسی قدر مغضوب ہو گئی۔

غرض یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نہ بدلنے والی سنت ہے کہ اس کی "نعمت بقدر رحمت" ہوا کرتی ہے اور یہ سنت بالکل مطابق فطرت ہے۔ ہم ایک اجنبی سے اس حسن سلوک کے امیدوار نہیں ہوتے جس کی امید ہمیں اپنے اعزہ سے ہوتی ہے۔ ایک غیر شخص اگر ہماری باتوں کو نہیں مانتا یا اس کی تکذیب اور مخالفت کرتا ہے تو ہم اس پر زیادہ رنجیدہ یا مشتعل نہیں ہوتے لیکن یہی بات اگر اپنے کسی نمک خوار غلام یا ناز پروردہ بیٹے کی طرف سے وجود میں آئے تو اس وقت ہمارے غم وغصہ کی انتہا نہیں رہتی اور ہم اس کی اس حرکت کا وہ جواب دیتے ہیں جو ایک غیر آدمی کو کبھی نہیں دے سکتے۔ کیونکہ غیر کی مخالفت کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ ایک سچی بات کا منکر اور دشمن ہے، لیکن اس یگانے کی مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مخالفتِ حق کے ساتھ ساتھ نمک حرامی بھی ہے، جو ضمیر انسانی کی سب سے بڑی اور گھناؤنی رذالت ہے۔ بالکل یہی اصول اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں برتتا ہے اور ان افراد یا اقوام کو، جو اس کی عنایات اور افضال کا مورد ہونے کے باوجود اس کے احکام کی مخالفت پر اتر آتی ہیں، عام حالات کی بہ نسبت دگنی سزائیں دیتا ہے کیونکہ وہ بیک وقت دو جرموں کی مرتکب ہوتی ہیں ایک تو مخالفتِ حق کی، دوسرے نمک حرامی کی۔

ہماری موجودہ حالت امت مسلمہ کو اسی سنت الٰہی کی روشنی میں اپنے ماضی اور حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس نے اس امت کو وہ ساری نعمتیں بخشیں جو اس سے پہلے دوسری تمام اقوام کو دی گئی تھیں اور اس کے علاوہ وہ نعمتیں بھی جو اب تک کسی قوم کو نہیں ملی تھیں؟ آخر یہ سارے عالم کی امامت کا منصب[1] اور خیر الامم[2] کا خطاب، یہ امت وسط[3] اور شہداء علی الناس[4] کے القاب، یہ اکمال دین[5] اور اتمام نعمت[6] کے انعامات اس سے پہلے بھی کسی امت کو ملے تھے؟ یقیناً نہیں۔ پھر غور کیجیے کہ اس امت کی ذمہ داریاں کتنی بھاری ہیں اور ان ذمہ داریوں کو پس پشت ڈالنے کے نتائج کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ جو قانون خداوندی اپنے محبوب پیغمبر اور اس کی محترم ازواج کے لیے اس طرح تیغ بے نیام تھا وہ دوسروں کے بارے میں کب کوئی نرمی دکھا سکتا ہے۔ پس یہ امت آج اپنے کو جس حال میں پا رہی ہے وہ اسی اصول کے مطابق ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک نصب العین اور ایک ضابطۂ حیات عطا فرمایا تھا اس ضابطہ کا نام دین الحق ہے اور اس کی تفصیلات کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ یہ قرآن اپنے کو اس میثاق کی دستاویز قرار دیتا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں سے لیا ہے اور جس کی پابندی کا ہر مسلمان نے اپنے رب سے معاہدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میثاق کو بندوں کے لیے ایک نعمت قرار دے کر اور یہ بتا کر کہ تمہاری کامیابی و ناکامی کا انحصار اسی میثاق کی پابندی پر ہے، فرمایا ہے کہ:-

---

لہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ الخ (تم وہ بہترین امت ہو جو تمام لوگوں (کی امامت و رہنمائی) کے لیے معرض وجود میں لائی گئی ہے، تم کو نیکی کا حکم دینا چاہیے الخ۔ ٹہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور درمیانی امت بنایا تاکہ تم سب لوگوں کے لیے حق کے گواہ بنو) اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں۔)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (مائدہ - ۲)

اور اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے اس کو یاد رکھو اور اس میثاق کو نہ بھولو جس کو اس نے تم سے باندھا ہے جبکہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا۔

تمام احکام قرآنی اسی معاہدۂ عبد و معبود کی دفعات ہیں جن میں سے ہر ایک کے متعلق حکم ہے کہ اس کو پورا کیا جائے اور ہر حال میں ٹھیک ٹھیک اس کی پابندی کی جائے۔ (یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ۔ اے ایمان لانے والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو) پھر ایک جامع ہدایت یہ کر دی گئی کہ:-

اتَّبِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (اعراف - ۱)

تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا اسی کی پیروی کرو، اور اس کو چھوڑ کر (دوسرے جھوٹے) خداوندوں کا اتباع نہ کرو۔ (خواہ یہ خداوند اوثان و اصنام ہوں، خواہ امراء و ملوک، خواہ آباء و اجداد ہوں خواہ اپنا نفس)

قرآن کے اس مطالبہ کو سننے کے بعد دو ہی راہیں اختیار کی جا سکتی ہیں، یا تو اس کا انکار کر دیا جائے یا پھر غیر مشروط طریقہ پر سر تسلیم خم کر دیا جائے اور ہر اس پابندی کو عملاً قبول کر لیا جائے جو رب کائنات کی طرف سے نازل اور عائد کی گئی ہو۔ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس واضح حقیقت کے ادراک سے عاجز نہیں رہ سکتا۔ اس لیے وہ شخص بدترین جہالت اور سفاہت کا ثبوت دے گا جو بعض پابندیوں کو تو مانے اور بعض سے گریز کرے۔ یہ پوزیشن عقل انسانی کے نزدیک بھی بالکل مضحکہ خیز اور ناقابل تسلیم ہے اور قرآن کے نزدیک بھی۔ چنانچہ قرآن اپنے اس مطالبہ کے ساتھ ہی ان لوگوں کو، جو یہ بین بین کی روش اختیار کرتے ہیں، ان لفظوں میں زجر و ملامت کرتا اور اس کے خوفناک نتائج سے یوں متنبہ کرتا ہے:-

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (بقرہ - ۱۰)

کیا تم کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے؟ سو ایسا کرنے والوں کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوں اور آخرت میں ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ اس قانون جزا کی زندہ شہادت ہے۔ ان کو خدا نے ایک کتاب دی تھی اور اس لیے دی تھی تاکہ اس کے احکام کی پابندی کریں اور اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر اپنی زندگی کا نظام چلائیں مگر انھوں نے اس کتاب کے ساتھ سلوک یہ کیا کہ ایک طرف تو اس میں تحریف کرنے لگے۔ دوسری طرف جو کچھ بھی اصل تعلیم باقی رکھ چھوڑی تھی اس کے بھی ایک بڑے حصہ کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر دیا۔ جیسا کہ قرآن بتاتا ہے:-

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ (مائدہ - ۳)

یہ لوگ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں اور جو تعلیم انھیں دی گئی تھی اس کا ایک حصہ بھلا چکے ہیں۔

"بھلا دینے" کا یہ مطلب نہیں کہ کتاب کا یہ حصہ ان کے حافظہ سے محو ہو گیا تھا۔ نہیں، وہ تو تحریری شکل میں موجود تھا، اور کتاب الٰہی ہدایت حاصل کرنے کے لیے آتی ہے، نہ کہ حافظہ کرنے کے لیے، سو اصل مقصود اس کتاب سے وہ بخوبی حاصل کر سکتے تھے لیکن اس کتاب کے اجارہ دار فریسیوں نے کیا یہ کہ مختلف سیاسی، معاشی اور دوسری اغراض و مصالح کے

پیش نظر بہت سے احکام کو معطل کر دیا، کتنے ہی قوانین تھے جن کو فاسق امراء کی خاطر بدل کر نرم بنا ڈالا اور کتنی ہی آیتیں تھیں جن کے مطالب و مقتضیات کو دوسروں سے چھپا کر رکھتے اور معاملات زندگی میں ان کو زیر بحث آنے ہی نہ دیتے۔ قرآن مجید نے ان کی اسی مجرمانہ حرکت کا اعلان کیا جب اس نے کہا:۔

..... تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا (انعام - ۱۱)

جس (توراۃ) کو تم متفرق اوراق میں رکھکر لوگوں کو دکھاتے ہو اور (اس کے مطالب و احکام کا) بڑا حصہ چھپا جاتے ہو۔

پھر اسی چیز کو ایک دوسرے انداز میں یوں کہا کہ:۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (آل عمران - ۱۹)

اور یاد دلاؤ اس وقت کو جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ دیکھو! تمہیں اس کتاب کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرنا ہوگا اور اسے چھپا کر نہ رکھنا۔ مگر انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی سی قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔

"پس پشت ڈال دیا" کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اللہ کی کتاب ان کے پاس موجود تھی مگر جب زندگی کے معاملات سامنے آتے تو اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے جزدانوں میں لپیٹ کر کہیں حفاظت سے رکھے رہتے۔

کتاب الٰہی کے ساتھ ان کا یہی طرزِ عمل تھا جس کو فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ کے جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور جس کی عملی تفسیر یہود کے ان اخلاقی ذمائم اور شیطانی اعمال سے ہوتی ہے جن کی تفصیل سے قرآن بھرا پڑا ہے، گویا عملی طور پر وہ توراۃ کے ایک حصہ کا انکار کر رہے تھے جس کا انجام اس ذلت اور مسکنت کی صورت میں نمودار ہوا جو خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی سب سے نمایاں مثال ہے۔

غرض قرآن کا مطالبہ کامل حوالگی کا ہے یعنی جو کچھ بھی وہ کہے اس پر اور صرف اسی پر عمل ہونا چاہیے۔ اس نے اپنے متبعین کے لیے جو حدیں، زندگی کے مختلف شعبہ جات میں قائم کر دی ہیں، ان سے آگے قدم اٹھانے کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں ایسا کرنے والوں کو وہ ظالم قرار دیتا ہے۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ اس لیے قرآن پر ایمان لانے اور مسلم ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو یا اس کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ جزو کو کبھی ترک نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آج صورت واقعہ کیا ہے؟ دماغ کو تمام خارجی تاثرات سے آزاد کر کے مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ پر دل سے آخر تک نظر ڈال جائیے اور اس کے بعد اپنی روزمرہ کی زندگی کا گہرا جائزہ لیجیے اور پھر اندازہ کیجیے کہ قرآن کے کتنے احکام پر عمل ہو رہا ہے؛ چھوڑ دیجیے ان لوگوں کو جو "مسلمان" ہوتے ہوئے بھی اسلام کے علانیہ باغی اور اس کے اصولوں کے مجانی منکر ہیں یا جن کی زندگی کے لمحات ایک ایک کر کے اسلامی قوانین کے توڑنے اور ہوائے نفس کے اتباع میں صرف ہوتے رہتے ہیں اور جن کو فقہی اصطلاحات میں فاسق و فاجر کہا جاتا ہے۔ ان افراد اور حلقوں کی طرف نگاہ دوڑائیے جو نیکی اور تقدس اور ایمان و عمل کے لحاظ سے مردانِ کامل کہے جاتے ہیں۔ یہاں بھی آپ کو جو کچھ دکھائی دے گا ... ان لوگوں کی زندگی ان احکام الٰہی کے ... ہے جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے، نماز اور روزوں کی پوری پوری پابندی ہوتی ہے، اوراد و وظائف کی کثرت ہے، زکوٰۃ و صدقات بھی

ادا ہو رہے ہیں، جھوٹ، غیبت، بدگوئی اور بہتان تراشی سے زبان آلودہ نہیں ہونے پاتی، کبر و غرور، نمود و ریا، خیانت، بدعہدی، ظلم و غصب، رشوت و حرام خوری اور فتنہ و فساد کے دھبوں سے ان کے ایمان کا دامن پاک رہتا ہے۔ باقی رہے اجتماعی احکام و مسائل، سو یہاں بھی ان سے غفلت اور بے اعتنائی کا وہی حال ہے جو غیر متقی محمدیوں میں نظر آتا ہے۔ قرآن نے اگر زندگی کے صرف انفرادی پہلو سے ہی بحث کی ہوتی تب تو بلا شبہہ اس طرح اتباع قرآن کا حق ادا ہو جاتا مگر وہ تو زندگی کے اجتماعی مسائل کو بھی اتنی ہی اہمیت کے ساتھ لیتا ہے جتنی اہمیت سے انفرادی مسائل کو۔ اس نے نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کے فرائض ادا کرنے، اور دیانت، امانت، اخلاص، وفائے عہد، حسن سلوک، اکل حلال اور صدق مقال وغیرہ اخلاق فاضلہ پر کاربند ہونے کی ہدایتیں دینے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق اور حاکمیت و فرمانروائی کا مستحق نہیں اس لیے اسی کو اپنا آقا اور سلطان مانو۔ (اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ، اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ) (اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔ خدا ہی کی بندگی کرو اور تمام باطل معبودوں کو چھوڑ دو)۔ خدائی اور فرمانروائی کے ان تمام جھوٹے مدعیوں کے دعاوی تسلیم کرنے سے انکار کر دو جو خدا کی بادشاہت کے باغی ہو کر اس کی رعایا پر اپنا حکم چلانا چاہتے ہیں۔ (وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ) ان لوگوں کا کہنا نہ مانو جو اللہ کے حقوق سے غافل اور اس کی حدود کو توڑنے والے ہیں۔ (وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ) جب فیصلہ کرو تو احکام الٰہی کے مطابق کرو۔ (فَاحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ) اور جب اپنا فیصلہ کراؤ تو انھی احکام کے ماتحت کراؤ، ورنہ غیر الٰہی قوانین کی عدالت میں اپنا معاملہ لیجانے والا منافق ہے (يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ) اور قوانین الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والا ظالم، فاسق، اور کافر ہے (وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ …… الْفٰسِقُوْنَ …… الْكٰفِرُوْنَ)۔ کسی برائی، کسی ظلم اور کسی عدوان کے پروان چڑھانے میں کسی طرح کا تعاون نہ کرو (لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ) کفر کے علمبرداروں سے لڑو یہاں تک کہ کفر کا علم سرنگوں ہو جائے اور اللہ ہی کی اطاعت رہ جائے (وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ) تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے وہ اللہ اور اس کے رسول کا محارب ہے، اس کو قتل کر دو (اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا الخ) جو چوری کرے اس کے …… ہاتھ کاٹ دو (وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا)۔ جو بدکاری کرے اس کو سو کوڑوں کی سزا دو (اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ) جو کوئی کسی پاکدامن پر زنا کا جھوٹا الزام لگائے اس کو اسی درے لگاؤ۔ (وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً) جو کوئی کسی کو عمداً قتل کر دے، اس کی بھی گردن اڑا دو (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ الخ)۔

ان بہت سے احکام میں سے چند ہیں جو ہماری اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو بطور مثال بیان ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب کے سب اسی قرآن میں موجود ہیں جس میں نماز روزے کے احکام درج ہیں، اس لیے اس جماعت کے لیے جس نے اللہ کی کتاب پر پورا پورا عمل کرنے کا اقرار کیا ہے، یہ سارے احکام بھی اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح وہ دوسری قسم کے

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنی اساسی اہمیتوں کے پیش نظر ان میں سے اکثر احکام تو ایسے ہیں جو مدار ایمان اور شرط نجات ہیں اور ایک مسلمان کے لیے اولین توجہ کے مستحق، لیکن خالص "دینی" اور "متقی" حلقوں میں بھی ان پر عمل کا سراغ ملنا تو درکنار، عمل کی خواہش کا وجود بھی عنقا ہے۔ آج ہمارا معبود اور شہنشاہ اللہ تعالیٰ ضرور ہے مگر مسجد کی چار دیواریاں اس کی معبودیت اور شہنشاہیت کی آخری حدیں ہیں اور مسجد سے باہر ہمارے ارباب امر و حکم وہ لوگ ہیں جو ہماری ہی طرح مخلوق ہیں اور خود بھی اسی ایک آقا کی غلامی اور اسی ایک حاکم علی الاطلاق کے قانون کی پیروی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو اللہ و رسول کے علانیہ باغی اور کفر و ضلال کے امام ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو "مسلمان" ہیں لیکن ایسے مسلمان جنھوں نے اللہ کے ان حقوق فرمانروائی کو، جن کا تعلق دنیا میں انسانوں کی اختیاری زندگی سے ہے، اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ قریب قریب پوری امت مسلمہ انہی دو قسم کے ارباباً من دون اللہ کو اپنا صاحب امر و حکم بنائے ہوئے ہے، اب اس کے لیے قانون وہ ہے جو یہ خداوندان ارضی نافذ کریں نہ کہ وہ جو کتاب و سنت میں ہے۔ پھر جب انسانی زندگی کے بنیادی مسائل میں سے اس مرکزی مسئلہ میں کہ انسان کا اصل حاکم اور قانون ساز کون ہے، اس امت نے پہلے مفاہمت اور بالآخر تعاون کی پالیسی اختیار کر لی اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے ہاتھوں میں اپنے نظام سیاست کی باگیں دے کر انہی کو اپنا اصل آمر و ناہی تسلیم کر لیا تو اس کے وہ بہت سے مسائل زندگی جن کا تعلق براہ راست حکومت سے ہوتا ہے آپ سے آپ غیر قرآنی بنیادوں پر طے ہونے لگے۔ اب اس کے اصول زندگی، اس کے نظریات سیاسی، اس کے تصورات معاشی اور اس کے افکار عمرانی کی بنیاد ہی بدل گئی اور اس کی زندگی کا پورا ڈھانچہ اور مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کا طرز ہی کچھ اور ہو گیا۔ اب اس کو اللہ وحدہ لاشریک لہ کی غیر منقسم حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت میں اعتقاد ہے اب وہ اس نظام زندگی کو، جو اپنے اصول و فروع میں سرتاپا غیر اسلامی، غیر قرآنی بلکہ کافرانہ ہے، نہ صرف انگیز کر رہی ہے بلکہ اس کی مشین چلانے میں مسابقت دکھا رہی ہے، اب اس کے افراد نہایت اطمینان کے ساتھ اللہ کے نازل کردہ قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ کرتے اور کراتے ہیں حالانکہ انھیں علم ہے کہ اس معاملہ میں اللہ کا حکم یہ نہیں ہے، اب ارتداد، سرقہ، زنا، قذف اور قتل کے جرائم کی پاداش کہیں بھی قتل، قطع ید، جلد اور قصاص و دیت کی شکل میں نہیں دی جاتی حالانکہ انھوں نے اپنے فرمانروائے حقیقی سے عہد کیا تھا اور حلف وفاداری اٹھایا تھا کہ ہم ان تعزیرات اور حدود کو قائم کریں گے۔ اس طرح قرآن کا ایک بڑا حصہ صرف کتابت اور تلاوت کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے جس کو اس کے ماننے والوں کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر انسان کے اندر تعلیمات قرآنی کا حقیقی فہم اور اسلام کی صحیح بصیرت موجود ہو اور تاویلات و تسویلات نفس نے اس کی روح ایمانی کو تھپکیاں دے کر سُلا نہ دیا ہو تو وہ بیک نظر محسوس کر سکتا ہے کہ قرآن کے ساتھ بڑی حد تک وہی سلوک کیا جا رہا ہے جو اہل کتاب نے تورات اور انجیل کے ساتھ کیا تھا۔ چونکہ قرآن اللہ تعالیٰ کا آخری ہدایت نامہ تھا جس کے باعث اس نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اس لیے یہ تو ممکن نہیں کہ گذشتہ صحف سماوی کی طرح اس کتاب میں بھی لفظی تحریفات ہو جائیں لیکن اس کے علاوہ اور کوئی ظلم اور خیانت ایسی نہیں ہے جو دوسری امتوں نے اپنے صحیفوں کے ساتھ روا رکھی ہو

اور مسلمان اس سے باز رہتے ہوں۔ عملی طور پر انھوں نے قرآن کے ایک حصہ کو فراموش کر دیا ہے، مراحل زندگی میں اس کو آگے رکھنے کے بجائے پیٹھ پیچھے رکھ چھوڑا ہے اور کچھ اقرار اور کچھ انکار کی روش پر پورے اطمینان کے ساتھ چلے جا رہے ہیں اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ قدرت فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ اور فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ نیز اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کا الزام، ایک مدعی دوسرے مدعی میں بھی، ان پر عائد نہ کرے اور اس انجام بد تک نہ پہنچائے جو اس کا قانون چاہتا ہے۔

شاہراہِ نجات اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت حال کا علاج کیا ہے اور اس ملت نے اپنے آپ کو آگ کے جس گڑھے میں لا ڈالا ہے اس سے نکلنے کی سبیل کونسی ہے؟ اس سوال کا حل بھی ہم کو اسی کتاب کا قبول کرنا چاہیے جس کو ہم سچی ہدایت اور یقینی علوم کا تنہا منبع قرار دیتے ہیں اور جس کی ہر بات کو بلا چون و چرا تسلیم کرنے کا ہم نے عہد کیا ہے۔ جس وقت یہ کتاب نازل ہو رہی تھی، اس وقت پرانی آسمانی کتابوں کے پیرو، یہود و نصاریٰ، کچھ اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے۔ جیسا کہ اوپر کے اجمالی اشارات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب اس نے ان کی گمراہیوں اور اعتقادی و عملی بے عنوانیوں، نیز ان کے نتائج بد کا تفصیلی ذکر کیا تو ان کی رگوں میں جاہلی حمیت کی آگ بھڑک اٹھی اور ضد میں آ کر انھوں نے صدائے حق کے استیصال و ابطال کی کوششیں شروع کر دیں۔ سیاسی اور جنگی کوششوں کے علاوہ مناظروں اور مجادلوں کے معرکے بھی گرم کرنے لگے۔ ان تمام ہنگاموں کے پیچھے کچھ تو جاہلی عصبیت اور جوشِ عناد کارفرما تھا اور کچھ آسمانی نوشتوں کے حامل ہونے کا ناز بے جا اور ابناء اللہ اور احباء اللہ ہونے کا فریب نفس۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بے اصل دعاوی اور ان کی کٹ حجتیوں کے جواب میں فرمایا:۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (مائدہ: ۱۰)

اے پیغمبر ان لوگوں سے صاف کہہ دو کہ اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے اترا ہے قائم نہ کرو

یعنی تم اپنی موجودہ پوزیشن میں رہتے ہوئے ہرگز اس امر کے مستحق نہیں ہو کہ دلیل و برہان کے ساتھ دعوتِ حق کے بارے میں کلام کر سکو، تم نے وہ بنیاد ہی کھود کر پھینک رکھی ہے جس پر تمھارے وجود ملی کی عمارت کھڑی تھی۔ اس معاملہ میں تم بحث و جدال کے حقدار اسی وقت ہو سکتے ہو جب تم ان تمام ہدایات پر کاربند ہو جاؤ اور اپنی زندگیوں کو ان تمام احکام کا پابند بنا دو جو سلطان حقیقی کی جانب سے تم پر مختلف وقتوں میں نازل ہوتے رہے ہیں۔ تم نے کتاب الٰہی کے جن حصوں کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر رکھا ہے، ان کو نافذ کرو، جن اصول و مقاصد کو تمھارے سامنے رکھا گیا تھا ان پر جم جاؤ، اور دین کی جن صداقتوں کا تمھیں علم دیا گیا تھا، ان کی حفاظت و بقا اور تبیین و اشاعت کا بھولا ہوا فریضہ یاد کر لو۔

پھر اس دینی و دنیوی ہلاکت سے جس کو ان لوگوں نے اپنی بدکرداریوں اور غلط کاریوں کے عوض خرید رکھا تھا، نجات کی جو شاہراہ قرآن نے تجویز کی وہ یہ تھی:۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ

اگر یہ اہل کتاب ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی

سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ وَلَوْ اَنَّهُمْ
اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ
مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ
(مائدہ - ۱۰)

برائیاں ان سے محو کر دیتے اور نعمت بھری جنتوں میں ان کو داخل کرتے
اور اگر وہ توراۃ اور انجیل اور ان (ہدایتوں اور کتابوں) کو جو ان کے
رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں، قائم رکھتے تو ضرور ایسا
ہوتا کہ ان کے اوپر سے بھی رزق برستا اور نیچے سے بھی ابلتا۔

مرض کی یکسانی چاہتی ہے کہ علاج بھی ایک ہی ہو، ہلاکت و نامرادی جس راہ سے اہل کتاب کے یہاں آئی تھی، آپ نے دیکھا کہ اہل قرآن کے یہاں بھی اسی راہ سے آئی، اس لیے ضرور ہے کہ اس سے نجات بھی اسی طریقہ سے حاصل کی جائے جس کی اہل کتاب کو تلقین کی گئی تھی۔ قرآن کہتا ہے ۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ اس کی بات کے سامنے کسی اور کی رائے سننے اور ماننے کے ہم مجاز نہیں ۔۔۔۔ کہ اہل کتاب نے کتب الٰہی کے کچھ حصوں کو ترک اور فراموش کر دیا، جس کا نتیجہ، رحمتِ الٰہی سے بُعد اور غضب الٰہی کے نزول کی شکل میں نمودار ہوا، جس سے بچاؤ کی واحد شاہراہ الٰہی کتابوں کا "قائم" کرنا تھا اور اب اس قرآن کو ماننے اور "قائم" کرنے میں ہے۔ اگر ہمارے دل و دماغ قرآن حکیم کے اشارات سمجھنے کی صلاحیتوں سے بالکل محروم نہیں ہو چکے ہیں، تو ہمارے لیے اس پیغام کا سمجھ لینا چنداں دشوار نہیں جو اس کے اس کھلے ہوئے اشارے میں موجود ہے۔ جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے گوشِ عبرت بخشا ہے وہ قرآن کے انہی لفظوں میں سے یہ آواز بھی سن سکتا ہے کہ:۔

"اگر قرآن کے پیرو ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے محو کر دیتے اور نعمت بھری جنتوں میں ان کو داخل کرتے۔ اور اگر وہ قرآن کو قائم کرتے تو ضرور ایسا ہوتا کہ ان کے اوپر سے بھی رزق برستا اور نیچے سے بھی ابلتا۔"

نیز :۔

"اے اہل قرآن! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ قرآن کو "قائم" نہ کرو۔

"قائم کر دینے" یا اقامت کے لفظی معنی ہیں سیدھا کرنے اور کھڑا کرنے کے، جب جسمی اشیاء کے لیے اس لفظ کا استعمال ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی کجی دور کر کے اس کو سیدھا بنا دیا یا اس کو کھڑا کر دیا، لیکن جب معانی کیلیے اس کا استعمال ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس چیز کو کامل اقتدار کے ساتھ اس کی مکمل ترین اور حسین ترین شکل میں اس طرح پورا کر دیا جائے جیسا کہ اس کا حق ہے۔ بازار کی "اقامت" کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو اس تمام ضروری ساز و سامان اور حسن انتظام سے مالا مال کر دیا جائے جس کا بازار میں ہونا ممکن ہے۔ نماز کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ دواماً اس کو ظاہری آداب اور باطنی محاسن سے اس طرح آراستہ رکھا جائے کہ کہیں کوئی نقص نہ باقی رہے اور نماز کا جو مقصود ہے وہ پورا پورا حاصل ہو جائے۔ پس اقامت قرآن کا مدعا یہ ہوا کہ اس کے جتنے احکام ہیں، سب کے سب نافذ ہوں، اس کے جتنے اصول ہیں ان سب کو اور صرف انہی کو مدار زندگی بنا لیا جائے، اس کی کسی ہدایت سے بال برابر بھی انحراف نہ کیا جائے، زندگی کے ہر مرحلہ میں، ہر شعبہ میں، ہر معاملہ میں صرف وہی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے جو اس نے دیا ہے۔ اور پوری سوسائٹی پر وہ رنگ چھا جائے جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس طرح پر کہ دیکھنے والوں کو یہ پورا ماحول قرآنی اور یہ پوری سوسائٹی ایک متحرک قرآن کی صورت میں نظر آئے۔ اسی کا نام اقامت قرآن ہے جس کو ہم اقامت دین بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ

جو کچھ قرآن میں ہے اسی کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ اس لیے اقامت قرآن اور اقامت دین در اصل ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔

پس اقامت قرآن یا اقامت دین ہی وہ واحد نسخہ شفا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے آنے والے امراض کو دور کرنے کی خاطر پہلے ہی سے تجویز فرما دیا تھا، اور یہ بتا دیا تھا کہ یہی وہ شے ہے جس پر تمھاری دنیوی فلاح، تمھاری اخروی سعادت اور تمھارے ملی تشخص، ان تینوں چیزوں کا انحصار ہے۔ تم کو جب بھی ان چیزوں کی تلاش ہو، اس کے لیے یہی راستہ اختیار کرنا۔ ورنہ باقی ہر طرف سراب ہی سراب ہے، جہاں سوائے حیرانی اور سرگشتگی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ گویا پھر اسی مقام پر واپس جانے کا حکم دیا ہے جہاں سے ہم ہٹ آئے ہیں۔ اس لیے کہ پہلے بھی تو یہی اقامت دین ہماری زندگی کا تنہا وظیفہ تھا، چنانچہ کہا گیا تھا کہ:-

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا .... ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (روم-۳۰)
سو تو اپنے رخ کو یکسو ہو کر دین (اسلام) کی طرف سیدھا کر.... یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہ خطاب پیغمبر کی طرف، اور اس کے توسط سے ایک ایک فرد امت کی طرف ہے۔ اس میں واضح طور پر مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہر ایک قانون، ہر ایک ضابطہ اور ہر ایک طرز زندگی سے منہ موڑ کر اپنی تمام اطاعتوں کو اسی ایک طریق حیات یعنی دین اسلام کے لیے مخصوص کر دو اور دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو کہ ہر لمحہ تمھاری نگاہیں اسی دین کے اشاروں پر لگی رہیں اور تمھارا رخ اسی دین کے احکام و مطالبات کی طرف متوجہ رہے۔

پھر اس امت کے وجود کی غایت، جو ایسے افراد پر مشتمل ہو، یہ بتائی گئی تھی کہ:-

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (بقرہ — ۱۴۳)
اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور متوسط امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے (حق کے) گواہ بنو۔

یعنی اس حق پر جو پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے، صرف اپنے طور پر عمل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کے سامنے اپنی زبان اور اپنے عمل اور بوقت ضرورت اپنے مال و جان سے اس حق کی گواہی دینا تمھارا فرض منصبی ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ:-

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ۔
تم وہ بہترین امت ہو جو تمام نوع انسانی کے لیے ظہور میں لائی گئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

معلوم ہوا کہ اس امت کا مقصد حیات اور اس کا نصب العین صرف یہی متعین کیا گیا تھا کہ وہ تمام اقوام عالم کو حق کی طرف بلائے، معروف کو پھیلائے، نہ صرف پھیلائے بلکہ بزور حکم اسے نافذ کرے اور بدی کے خلاف نہ صرف وعظ و تلقین کرے بلکہ اسے حکماً روک دے جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ زمین پر خدا کے دین کو قائم اور سب کو اسی کا محکوم بنا دے۔ کیونکہ جس "حق" کا گواہ بنا کر اسے بھیجا گیا ہے وہ اسی "دین حق" کا نام ہے اور جس "معروف" کے نافذ کرنے کا اس کو حکم دیا گیا ہے وہ انہی اوامر کا نام ہے جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں یا ان کے الفاظ سے مستنبط ہوتے ہیں اور جس منکر کے استیصال

کی ذمہ داری اس کے سر ڈالی گئی ہے اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو احکام و شرائع دینی کے خلاف اور مزاج شریعت کے ناموافق ہیں۔

مقصد حیات اور نصب العین کی اس تعیین کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس امت کو جو عروج و اقبال بھی بخشا گیا تھا وہ اسی نصب العین سے وفاداری کا صلہ تھا، اور اس سے اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کے جتنے وعدے کیے تھے وہ سب اسی اقامت دین کی شرط سے مشروط تھے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی کہ تم ہی سربلند ہوگے اور تمہارے مقابلہ میں تمہارے اعداء کا انجام شکست اور محکومیت ہوگا تو اسی کے ساتھ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ کی شرط بھی لگا دی گئی تھی۔ یہ مشروط وعدہ ہنگامی نہیں بلکہ ابدی تھا جس کی شہادت اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے متعلق پیشنگوئی فرماتے ہوئے کہا تھا کہ الائمۃ مِنَ القریش ما اقام الدین (خلفا قریش میں سے ہوتے رہیں گے جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھنے کا فرض ادا کرتے رہیں)

اس ساری بحث سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں:۔

اولاً یہ کہ اس امت کا نصب العین اللہ کے دین کی اقامت تھا، ثانیاً یہ کہ اس فریضہ کو انجام دینے پر اللہ تعالیٰ کی غیبی اعانتیں اس کے شامل حال ہوئیں اور وہ دنیا میں بے مثل قوت و اقبال سے سرفراز ہوئی۔ ثالثاً یہ کہ اس امت کے عروج و زوال کا انحصار محض طبعی اسباب و قوانین پر نہیں ہے، بلکہ اخلاقی قوانین پر، یعنی اس فرض ہی کے بجا لانے پر ہے جو اس کے وجود کا تنہا مقصود ہے، اگر اس نے اس فرض سے پہلو تہی کیا تو دوسری اقوام کی بہ نسبت وہ اللہ تعالیٰ کے دربار سے دوگنی سزا کی مستحق ہوگی۔ رابعاً یہ کہ اس امت کے موجودہ حالات، کتاب اللہ کو عملاً ترک اور فراموش کر دینے اور اقامت دین کے فرض سے بالکل غافل ہو جانے پر دلالت کرتے ہیں۔ خامساً یہ کہ از روئے قرآن اس امت کی موجودہ ذلت و نکبت کا علاج اپنے فرض کو دوبارہ پہچان لینے اور اللہ کی کتاب یعنی اللہ کے دین کو از سر نو قائم کر دینے میں ہے۔ سادساً یہ کہ اگر اس امت نے اپنی موجودہ شکست، ورنجت اور ذلت و محکومی کو دور کرنے کے لیے اقامت دین کی راہ سے الگ کوئی راہ اختیار کی تو اس کی تمام تدبیریں اور کوششیں نہ صرف یہ کہ ضائع جائیں گی بلکہ اس کو زندگی کی عظمتوں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے اور دور پھینک دیں گی اور وہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں، دین کا سر رشتہ چھوڑ کر اور اس کی اقامت کا فریضہ فراموش کر کے، کبھی بھی گوئے سبقت نہیں لے جا سکتی۔ اور اگر بظاہر کوئی سربلندی اس کو ملے گی بھی تو غیروں کا عطیہ ہوگی جس کا وجود بھی غیروں کے رحم و کرم پر ہوگا اور یہ بجائے خود ایک بڑی ذلت ہے

فرض ناشناسی اور حقائق سے چشم پوشی

ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسے شخص کے لیے جو اللہ اور اس کے رسول اور قرآن پر ایمان رکھتا ہو، جو مسلمان جینا اور مسلمان ہی مرنا چاہتا ہو اور جس کو کل قیامت کے دن اپنے اعمال کی جوابدہی کا پورا احساس ہو، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہر طرف سے اپنی آنکھیں پھیر کر، ہر آواز کے لیے اپنے کان بند کر کے، ہر تسویل نفس اور ہر وسوسۂ شیطانی سے دل کو پاک کر کے اور سود و زیاں کے تمام اندیشوں سے بے پروا ہو کر اس صراط مستقیم یا اس شاہراہ نجات پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لے اور اپنے جسم و دماغ کی ساری قوتیں اس

دینِ حق کے قائم کر دینے میں لگا دے۔ وہ اپنے فہم و تدبر سے کام لے کر اس کے لیے مناسب وقت تدبیریں سوچ سکتا ہے، حالات زمانہ کے لحاظ سے ایک خاص طریقۂ عمل اختیار کر سکتا ہے، ماحول کے تقاضے سے کوئی مخصوص پالیسی مرتب کر سکتا ہے لیکن اپنے اس نصب العین اور مقصدِ زندگی میں ترمیم کرنا یا اس کو ملتوی کر دینا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ وہ اس راہ سے ہٹ کر اور اس نصب العین کو چھوڑ کر جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کا قدم ہوگا۔ اس وقت اس کی مثال اس نادان اندھے کی سی ہوگی جو کسی گہرے کھڈ کی طرف بڑھا جا رہا ہو اور اس کا بہی خواہ رہبر چلا چلا کر ادھر جانے سے منع کر رہا ہو اور صحیح راہ پر لانے کی کوشش کر رہا ہو مگر وہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے اس رہبر کی باخبری، اس کی راست گوئی، اس کی خیر خواہی اور اس کے خلوص کا قصیدہ پڑھ رہا ہے اور ساتھ ہی دوسری طرف اسی سمت بڑھے جانے پر اصرار کر رہا ہے، محض اس بنا پر کہ اس سمت کی زمین اسے کچھ ڈھلوان معلوم ہو رہی ہے جس پر قدم آسانی کے ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور اس کی مخالف سمت کی زمین کچھ بلند محسوس ہوتی ہے جس پر قدم رکھنے میں چڑھائی کی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے آج یہ پوری امت بالکل اسی اندھے کا پارٹ ادا کر رہی ہے۔ وہ ہر اس سمت دوڑ پڑنے کے لیے تیار ہے جس پر کسی قوم کو سرگرمِ سفر دیکھ پائے۔ صرف اس وجہ سے کہ اس کو یہ راہ بظاہر سہل اور ہموار اور دل کش نظر آتی ہے گرچہ وہ ٹھیک ہلاکت و نامرادی کی جہنم تک منتہی ہوتی ہو۔ اگر کسی سمت اس کے اقدام اٹھنے سے انکار کرتے ہیں تو وہ وہی سمت ہے جو اقامتِ دین کی سمت کہلاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ راہ مشکلات کے کانٹوں سے بھری ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ قرآن اس کو ہلاکت کی تمام راہوں سے روک کر اسی ایک راہ کی طرف بلاتا ہے مگر وہ سنی ان سنی کر دیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں ہی تیرا بہی خواہ ہوں، وہ جواب دیتی ہے کہ یہی تو ہمارا ایمان ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں ہی تیرا ہادی اور نجات دہندہ ہوں، وہ جواب دیتی ہے، اس سے کس کافر کو انکار ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کبھی غلط بات نہیں کہتا، کبھی اپنے دعاوی کی بنیاد وہم و گمان اور خرص و تخمین پر نہیں رکھتا۔ وہ جواب دیتی ہے کہ لاریب! قرآن کہتا ہے کہ میرے پاس اور صرف میرے ہی پاس علمِ حقیقت ہے۔ میں ہمیشہ صحیح راہ بتاتا ہوں، نجاتِ انسانی کا راز صرف میری تعلیمات میں مضمر ہے، وہ جواب دیتی ہے کہ بلاشبہ! قرآن کہتا ہے کہ جو کچھ میرے سوا ہے، وہ سب باطل ہے۔ جو میرے خلاف ہے وہ سراسر جہل ہے، جو مجھ سے ہم آہنگ نہیں، اس میں تباہی و نامرادی کے علاوہ کچھ نہیں، وہ جواب دیتی ہے کہ بالیقین! ___ لیکن جب وہ کہتا ہے کہ تیرے لیے میرے پاس صرف ایک پیام ہے، اقامتِ دین کا پیام، تو اس کی زبان، جو ابھی تک اس کے ہر دعوے کی تصدیق کرنے میں اتنی تیز تھی، معاً بند ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ اس کا دماغ حیلوں اور تاویلوں کا ایک لشکر تیار کر کے سامنے آ جاتا ہے تاکہ اس اضطراب کو کچل ڈالے جو اس منافقانہ خاموشی کے باعث اس کی روح کی گہرائیوں میں رونما ہوتا ہے۔ مجرم انسان، اگر اس کے اندر غیرت اور عزتِ نفس کی کوئی رمق باقی ہو، لوگوں کے سامنے مجرم کی حیثیت سے آنا کبھی گوارا نہیں کرتا۔ یا تو اس غیرت اور عزتِ نفس کی بیدار حس اس کو مجبور کر دیتی ہے کہ اپنے اس جرم کا کفارہ ادا

کرے اور اپنے عمل کے ذریعہ اپنے دامن سے اس داغ کو دھو دے، یا پھر اس حس کے کمزور ہونے کی شکل میں، اس کی تمام دماغی قابلیتیں اس بات پر صرف ہونے لگتی ہیں کہ کسی طرح اس جرم کو عین حق اور صواب ثابت کر دے۔ اس وقت اس کا نفس اس کو بے گناہی کا فریب دینے میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے اور اس کے حکم سے اس کا دماغ تاویلوں کا ایک خوشنما نقاب تیار کر دیتا ہے جس کو وہ اپنے چہرے پر ڈال کر اپنے آپ کو یہ محسوس کرا لیتا ہے کہ میں برسرِ حق ہوں۔ اس کے بعد اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ ساری دنیا کو ایسا ہی محسوس کرا دے، تاکہ اس کے داغ گناہ کی طرف کوئی انگلی اٹھانے والا نہ رہ جائے۔

قرآن کی علم بردار اور دین اسلام کی پیروی کا دم بھرنے والی امت اپنے فریضۂ ملی اور مقصدِ زندگی کی بجا آوری میں کچھ اسی قسم کے مجرمانہ ادعائے بیگناہی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ صدیوں کے انحطاط اور زوال نے اس کے احساس خودی کو بری طرح مجروح کر ڈالا اور ان جذبات عزم و ہمت سے سینوں کو ویران کر دیا ہے جو ایک نصب العین کی اقامت کے لیے ضروری ہیں۔ اور نصب العین بھی اقامت دین کا نصب العین، جو کبھی بھی آسان نہ تھا اور جس میں جان و مال کی بازی، عیش و آرام کی قربانی اور امیدوں اور تمناؤں کی پامالی شرط اول قدم ہے۔ اس کے بجائے اس کے کہ وہ اپنے جرم کو تسلیم کر کے تلافی مافات کی کوشش کرتی اور اپنی ذمہ داریوں کا بار اٹھا لیتی، سرے سے اپنی کوئی ذمہ داری ہی نہیں تسلیم کرنا چاہتی، اور طرح طرح کی دور از کار تاویلوں سے اپنے رہے سہے احساس فرض کو دبا رہی ہے

گریز کی راہیں آیئے ان تاویلوں کی یا ان کے پیش کرنے والوں کے بقول ان محکم دلائل کی حیثیت اور حقیقت پر غور کریں جو اس ترک فرض کے جواز میں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ ایک ایماندار اور صداقت شعار انسان کے لیے پورے قرآن پر عمل کرنا کسی حال میں بھی ناممکن نہیں، اور جن کو اللہ نے حسن عمل اور خشیت و انابت کی توفیق بخشی ہے وہ آج بھی پورے دین پر عامل ہیں اور دوسروں کو بھی "امر بالمعروف" کرتے رہتے ہیں۔ رہ گئے قرآن کے وہ احکام جن کا تم نے اوپر حوالہ دیا ہے، ان کا تعلق حکومت اسلامی سے ہے اور ان کے مخاطب مسلمانوں کے اولو الامر ہیں، عوام نہیں ہیں۔ اس وقت چونکہ اسلامی حکومت قائم نہیں اس لیے ان احکام کے اجرا و نفاذ کی ذمہ داریوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر کچھ اوامر ایسے ہیں بھی جن کا تعلق براہ راست عامۃ المسلمین سے ہے، لیکن جن پر عمل نہیں ہو رہا ہے مثلاً تحاکم الی الطاغوت اور حکم بامر الطاغوت وغیرہ سے اجتناب، تو لیا وہ اضطراراً کر رہے ہیں اور بحالت اضطرار ممنوعات بھی مباح ہو جاتے ہیں۔ اس لیے قرآن کے ایک حصہ کو ترک یا فراموش کر دینے کا الزام سراسر بہتان ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلاشبہ از روئے کتاب و سنت ملت اسلامیہ کا فرض یہی ہے، لیکن موجودہ ناسازگار حالات میں اس نصب العین کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں، اس لیے اس وقت اس کے لیے جد و جہد کرنا وقت اور قوت کو

ضائع کرنا ہے۔ اور اس کا اعلان و اظہار کرنا نہ صرف مصلحت کے خلاف اور عدم تدبر کی دلیل ہو بلکہ مفاد ملت کے لیے سراسر مضر اور مہلک ہے۔ اس لیے سردست کچھ ایسی دوسری تجاویز اختیار کی جائیں جو ممکن العمل ہوں اور تجربات سے مفید ثابت ہو چکی ہوں اور جو ساتھ ہی آگے چل کر ہمارے اصلی مشن کے لیے حالات نسبتاً کچھ زیادہ ساز گار کر دیں اس وقت اس کے لیے براہ راست جد و جہد شروع کی جائے گی۔

ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو صفائی کے ساتھ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ نصب العین بالکل برحق ہے مگر ہم صدیقؓ اور فاروقؓ نہیں ہو سکتے، ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبر کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے اب وہ زمانہ نہیں آ سکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو تربص کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان کو ملت کی موجودہ اجتماعی معصیت اور اس کے واحد نصب العین سے انکار نہیں، مگر پہلے وہ دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ اس نصب العین کے داعی اور مبلغ عمل کے میدان میں کتنی تیز گامی اور ثبات قدمی دکھاتے ہیں۔ چونکہ انھیں اس امر میں شک ہے کہ آزمائشوں کے وقت یہ اقامت دین کے داعی میدان میں جمے رہیں گے، اس لیے ان کے لیے اس جد و جہد میں شریک ہونے کا ابھی کوئی سوال نہیں۔

ایک بہت بڑا گروہ حضرت امام مہدی کے ظہور کا منتظر ہے، اس کو اس نصب العین کے برحق ہونے کا پورا یقین ہے مگر اس کا خیال یہ ہے کہ اس کے مکلف ہم نہیں ہیں، اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے امام مہدی کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس لیے ہم کو خواہ مخواہ یہ درد سر نہیں خریدنا چاہیے۔

یہ سارے گروہ اور ان کے یہ خیالات مسلمانوں کے ان طبقوں اور حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہبی اور دیندار حلقے کہے جاتے ہیں۔ رہ گیا وہ گروہ جو دین کے حلقہ کو اپنی گردن سے اتار کر پھینک چکا ہے اور جو اپنے مسائل زندگی میں قرآن و سنت کو اقتدار تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، تو اس کے خیالات سے ہم اس وقت تعرض نہیں کرنا چاہتے ہمارے مخاطب اس وقت صرف وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول کے فیصلہ کو آخری فیصلہ مانتے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے معاملات و مسائل میں شریعت کی ہدایات اور احکام کے سوا کسی اور حجت اور سند کے محتاج نہیں

باطل کے ساتھ اسلام کا طرزِ عمل لیکن اس لمبی بحث کو شروع کرنے اور ان افکار پریشاں پر تبصرہ کرنے سے پہلے اسلام کی ایک اصولی ہدایت ذہن نشین کر لینی چاہیے جو ہماری زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر دلیل راہ کا کام دیتی ہے اور التباس حق و باطل کے تاریک سے تاریک مواقع میں بھی اسلام کی صراط مستقیم آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ اس اصولی ہدایت کو سمجھ لینے سے اس بحث کی بے شمار الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ اسلام نے ہم کو حق کی پیروی اور باطل سے اجتناب کا حکم دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے فرائض میں یہ چیز بھی شامل کی ہے کہ:۔

لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر ولتاخذن على يد المسئ ولتاطرنه على الحق — تم ضرور معروف کا حکم دیتے رہنا اور بدی سے روکتے رہنا، بدکار کا ہاتھ پکڑ لینا اور اس کو حق کی طرف موڑ دینا۔

اور اگر اس فریضہ کو ادا نہ کیا گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس سے بھی خبردار کر دیا گیا ہے۔

او لیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض ولیلعنکم کما لعنہم (ترمذی)
ورنہ اللہ تعالیٰ باطل پرستوں اور بدکاروں کے دلوں کا زنگ معصیت حق پرستوں کے دلوں پر بھی چڑھا دے گا یا تم پر اسی طرح لعنت کر دے گا

ایک دوسری حدیث میں اس نہی عن المنکر کے طریق کار کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ ولیس وراء ذالک حبۃ خردل من الایمان
تم میں جو کوئی بدی کو دیکھے تو چاہیے کہ اسے ہاتھ سے مٹا دے اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو زبان سے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے۔ اس کے بعد ذرہ برابر بھی ایمان کا درجہ نہیں۔

ان ارشادات میں ہم کو اپنی حیات ایمانی کے چند اساسی اصول ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ منکر سے بچنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا استیصال کرنے رہنا بھی ایک فریضۂ دائمی ہے۔ دوسرے یہ کہ منکر کو برداشت کرنا — اس سے رغبت رکھنا نہیں بلکہ اس کو برداشت کر لینا ہی اجتماعی ہلاکت کے خطرہ کا لازم ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر کسی شخص کے دل میں منکر سے نفرت اور اس کو حق سے بدل ڈالنے کی تڑپ نہیں تو وہ ایمان سے بے بہرہ ہے۔

اب ہم ترتیب وار ہر گروہ کے خیالات اور دلائل کو اصول و نصوص کی میزان میں تولنا چاہتے ہیں تاکہ ان کا صحیح وزن معلوم ہو سکے اور ننگا ہوں کے سامنے سے وہ پردہ اٹھ جائے جس کو سہولت پسندی اور ضعف عزم اور قلت احساس فرض کے ہاتھوں نے حقیقت کے چہرے پر ڈال رکھا ہے۔

(۱) کیا موجودہ عمل بالقرآن کافی ہے؟ اس امر کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ قرآن و سنت میں صرف نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ ہی کے فرائض کا ذکر ہے اور مومن سے انہی احکام کی بجا آوری کا مطالبہ کیا گیا ہے یا ان کے ماسوا جو احکام ہیں وہ نعوذ باللہ محض "بھرتی کے مضامین" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ان میں علمی طور پر جو فرق مراتب چاہیں قائم کر لیں اور ان کے اجر و ثواب میں بھی باہم جو نسبت چاہیں متعین کر لیں، لیکن عملی طور پر کسی تفریق کے نہ آپ حقدار ہیں اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ ایک غلام کا فرض اپنے آقا کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل ہے۔ اس کو یہ حق کبھی نہیں پہنچتا کہ ضروری اور غیر ضروری کی بحثیں پیدا کر کے بعض احکام کو تو مانے اور بعض سے اغماض کر جائے۔ آقا کا حکم بہر حال حکم ہے جو ہر صورت میں پورا ہونا چاہیے۔ آپ نے بھی اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور ہمہ وقتی غلامی کا عہد کیا ہے۔ اب (بطور مثال) اس آقا کی طرف سے دو حکم آتے ہیں ایک تو یہ کہ نماز پڑھو، دوسرے یہ کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اگر آپ ان میں سے پہلے حکم پر عمل کرتے ہیں اور دوسرے کو سن کر خاموش ہو رہتے ہیں تو آپ اپنے اس طرز عمل کو آقا کی کامل اطاعت اور اس کی کتاب الاحکام — قرآن — کی پوری پابندی کہہ سکتے ہیں؟ پھر یہ کیا ستم ہے کہ قرآن کے ایک دو نہیں بیسیوں احکام بالکلیہ متروک و مہجور ہو کر رہ گئے ہیں اور پھر بھی آپ کو خوش فہمی ہے کہ ہم عمل بالقرآن کے مطالبہ سے پوری طرح عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ آخر ایک مومن کا ضمیر اپنے فرض کی ادائگی پر کس طرح مطمئن ہو جاتا ہے جبکہ وہ اپنے اوپر اور اپنے گرد و پیش [illegible] طاغوت کا تخت خداوندی بچھا ہوا پاتا ہے اور معبود حقیقی کے بے شمار احکام کو معطل اور اس کی قائم کی

ہوئی حدود کو ٹوٹتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن اس طاغوتی خداوندی کے تخت کو الٹ دینے، معطل شدہ احکام الٰہی کو نافذ کر دینے اور حدود اللہ کے توڑنے والوں پر ان تعزیرات کے جاری کرنے کا عزم اس نوادائے فرض پر آمادہ یا کم از کم بے چین نہیں کر دیتا جن کے جاری کرنے کا حکم اسے ملا ہے۔

عذرِ گناہ اس کے جواب میں جو عذر پیش کیے جاتے ہیں وہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے شاہکار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم تو ان احکام کے سرے سے مکلف و مخاطب ہی نہیں۔ ان کے نفاذ کی ذمہ داری تو مسلمانوں کے اولوالامر پر ہے۔ آج چونکہ اسلامی حکومت موجود نہیں اس لیے ان احکام کی تکلیف ہی ساقط ہو گئی ہے۔ حالانکہ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے مسلمانوں کے اولوالامر! تم چور کے ہاتھ کاٹ دو یا زانی کو کوڑے مارو بلکہ فَاقْطَعُوْا، فَاجْلِدُوْا وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں جن کے مخاطب سارے اہل ایمان ہیں[۵۱]۔ اور جن پر عمل کرنے کی اصل ذمہ داری پوری امت مسلمہ پر ہے نہ کہ کسی خاص فرد یا چند افراد پر۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ان قوانین کا اجراء اولوالامر ہی کریں گے کیونکہ نظم مملکت کا تقاضا یہی ہے، اس کے بغیر حکومت کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہی اولوالامر ان احکام کے مخاطب اول ہیں، نہیں، مخاطب اول تو پوری جماعت ہے اور یہ اولوالامر جماعت کے نمائندوں کی حیثیت سے ان کا نفاذ کرتے ہیں۔ پس جب جماعت کے یہ نمائندے موجود نہ ہوں تو اس ذمہ داری کا رخ آپ سے آپ اپنے مخاطب اول یعنی جماعت کی طرف ہو جاتا ہے۔ گویا ان احکام کی نوعیت فرض کفایہ کی سی ہے کہ اگر اولوالامر کے گروہ نے ان پر عمل کر دیا تو ساری امت کی طرف سے یہ فرض ادا ہو جاتے ہیں، ورنہ، بصورت دگر، پوری جماعت کے سر یہ فرائض رہ جاتے ہیں اور ایک ایک فرد اس ترک امر الٰہی کی پاداش میں ماخوذ ہوگا۔

اس بارے میں اگر کوئی وزنی بات کہی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ ہمارے پاس وہ سیاسی اقتدار کہاں ہے جو ان احکام کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔ یقیناً یہ بات سنجیدہ غور و فکر کی محتاج ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے احکام کے نفاذ کے سلسلہ میں گرچہ اصل مخاطب اور ذمہ دار پوری جماعت ہے مگر ان کا نفاذ جب ہوگا تو ایک قوت قاہرہ یعنی حکومت ہی کے ذریعہ ہوگا۔ افراد کو اس کا اختیار نہیں دیا جا سکتا ورنہ اگر ہر فرد بجائے خود اس فرض کو ذاتی طور پر انجام دینے لگے تو زمین فتنہ و فساد سے بھر جائے اور اجتماعی زندگی تباہ اور نظم جماعت پارہ پارہ ہو جائے۔ اس لیے ایسے احکام کے اجراء یا یوں کہیے کہ قرآن کے ایک بڑے حصہ پر عمل کے لیے سیاسی اقتدار کا وجود ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سیاسی اقتدار کے نہ ہونے کی صورت میں ہماری اور آپ کی ذمہ داریوں میں کمی آجاتی ہے یا وہ اور زیادہ سخت اور گراں ہو جاتی ہیں؟ آیا ہم کو خدا کا "شکر" ادا کر کے اس امر پر اظہار اطمینان کرنا چاہیے کہ

---

[۵۱] چنانچہ اہل تفسیر آیت سرقہ کی تاویل میں فرماتے ہیں:- یقول جل ثناؤہ ومن سرق من رجل او امرأۃ فاقطعوا ایھا الناس یدہ... ...... فلا تفرطوا ایھا المؤمنون فی اقامۃ حکمی علی السراق وغیرھم من اھل الجرائم الذین اوجبت علیھم حدوداً فی الدنیا۔ یعنی اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ "اے لوگو! جو مرد یا عورت چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو...... اے مومنو! چوروں اور ان تمام مجرموں پر جن کے لیے میں نے دنیا میں سزائیں مقرر کر دی ہیں، میرے احکام جاری کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرنا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۰ پر)

یا قرآن کے ایک حصہ پر تو عمل کرنے سے آزادی ہو گئی یا اس اقتدار کے حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے پروردگار کے کتنے ہی احکام پر عمل پیرا ہونے کی سعادت سے محروم ہیں؟ نہ صرف سعادت سے محروم ہیں بلکہ اس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور کتاب الٰہی کو ترک اور فراموش کرنے کی قدیم سنت ضلال دہرانی پڑ رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے دماغ کو منطقیانہ قیل و قال سے پاک کریجیے اور اپنے قلب اور ضمیر کی آواز پر کان لگا کر سنیے کہ وہ ان سوالوں کا کیا جواب دے رہے ہیں؛ یقین جانیے جس قلب میں بھی ایمان کی حرارت موجود ہوگی وہ کبھی سکون اور اطمینان کے ساتھ اس صورت حال کو برداشت کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ اس لیے ان احکام کو نافذ کرنے والی قوت کے حاصل ہونے کی شکل میں اگر امت پر صرف یہ ایک فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کو نافذ کرے تو اس کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں اس کی ذمہ داریاں دو چند ہو جاتی ہیں پہلے تو اس قوت کو حاصل کرنا اور پھر ان احکام کو نافذ کرنا۔ یہ اصول کسی بحث کا محتاج نہیں کہ جو چیز کسی فرض کی ادائگی کا ذریعہ یا موقوف علیہ ہوتی ہے، اس کی ادائگی خود فرض ہوتی ہے۔ آپ اس شخص کو ملامت کرنے میں شاید ایک لمحہ بھی توقف نہ کریں گے جو نماز اس عذر سے نہیں پڑھتا کہ اسے قرآن یاد نہیں یا جائے نماز ناپاک ہے، اور فوراً اس پر یہ الزام عائد کر دیں گے کہ یہ اپنا فرض ادا کرنے سے جی چرا رہا ہے اور اس کے دل میں نماز کی کوئی اہمیت اور محبت نہیں، ورنہ ایسا عذر لنگ اور مضحکہ خیز بہانہ نہ کرتا اور دنیا کے سارے کاروبار چھوڑ کر سب سے پہلے قرآن یاد کرنے کی کوشش یا جائے نماز پاک کرنے کی تدبیر کرتا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اوامر قرآنی کے ایک بڑے حصہ کو معطل کر کے آپ صرف اس بنا پر مطمئن بیٹھے ہیں کہ اس کے لیے جس سروسامان کی ضرورت ہے، وہ میسر نہیں۔ اور پھر بھی آپ کی معصومیت اور آپ کے تقویٰ پر آپ کی نگہ احتساب کوئی حرف نہیں رکھتی اور آپ کو اپنے اس عذر میں کوئی بے وقعتی اور اس بہانہ میں کوئی مضحکہ خیزی نظر نہیں آتی۔ اگر یہ سروسامان میسر نہیں تو کیا آپ کا ـــــ بشرطیکہ اپنے عہد کا پاس اور اپنے فرض کا صحیح احساس موجود ہو ـــــ یہ اولین فرض نہیں ہو جاتا کہ اپنی ساری قوتیں اور تدبیریں صرف کر کے اس سروسامان کو حاصل کریں؟ خواہ اس کوشش میں آپ کو کیسی ہی مالی اور جانی قربانیاں کیوں نہ دینی پڑیں، اس لیے کہ یہ جان اور یہ مال آپ کی ملکیت نہیں کہ انھیں سینت کر رکھا جائے بلکہ جس روز آپ نے ایمان کا اقرار کیا اسی روز یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے آپ سے اپنی رضا کے عوض خرید لیں اور اب وہ آپ کے پاس اسی آقائے دو جہاں اور مالک جسم و جان کی امانت ہیں جس نے اپنے اوامر کی بجا آوری کا ہم سے اور آپ سے میثاق لیا ہے اور یہ امانتیں ہمارے پاس صرف اس غرض سے رکھی ہیں کہ ان اوامر کی بجا آوری میں حسب ضرورت صرف کر دی جائیں۔ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (اللہ نے مومنوں کی جان اور مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے) پس جو چیز خدا کی خریدی ہوئی اور آپ کے پاس بطور امانت رکھی ہوئی ہے اس کو عند المطالبہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرنا بدترین قسم کا کمینہ پن اور خیانت ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹) دیکھیے ایک جگہ "فاقطعوا" کے مخاطب حقیقی کی تصریح 'ایہا الناس' کے لفظ سے کی ہے، اور دوسری جگہ "ایہا المومنون" کے لفظ سے، "یا اولی الامر" کہیں نہیں کہا گیا۔ پھر مزید وضاحت یہ کر دی کہ یہ مخاطبت صرف اسی آیت سرقہ میں نہیں ہے بلکہ تمام تعزیرات اسلامی میں یہی اصول کارفرما ہے

اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شخص اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کر رہا ہے جس کے پاس خدا نے اپنی چند امانتیں اس لیے رکھ چھوڑی ہیں کہ جب اس کی اطاعت امر کی راہ میں کوئی مانع پیش آئے تو وہ ان کے ذریعہ اس مانع کو دور کرنے کی سعی و جہد کرے لیکن اس کا حال یہ ہے کہ موانع پیش آنے کی صورت میں بجائے اس کے کہ وہ ان امانتوں سے کام لے کر انھیں دور کرے اور اپنے آقا کا حکم بجا لائے، کرتا یہ ہے کہ موانع کی شکایت کر کے اس حکم ہی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتا ہے اور ان امانتوں کو غاصبانہ طور پر اپنی خواہشوں کی چاکری میں لگا لیتا ہے۔

قانونِ اضطرار کی غلط تطبیق | یہ عذر تو ان احکام کے متعلق تھا جن پر کا فرانہ اقتدار بالا کے باعث عمل ہو ہی نہیں سکتا، رہ گئے بعض وہ احکام جن پر عمل کرنے سے یہ اقتدار کفر بھی مانع نہیں ہے لیکن جو عمل بالقرآن کے ادعا کے باوجود بالکلیہ متروک ہیں مثلاً تحاکم الی الطاغوت اور حکم بامر الطاغوت سے اجتناب وغیرہ، قرآن کا ترک کر دینا بھی اس وجہ سے کامل عمل بالقرآن میں خارج نہیں تصور کیا جاتا کہ ایسا اضطرار اً کیا جاتا ہے اور اضطرار کی حالت میں ارتکاب حرام گناہ نہیں۔ لیکن ایسا یا تو اپنی اجتماعی ذہنیت کے غلط مطالعہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے یا پھر رخصت اضطرار کی لازمی حدود و قیود سے انتہائی ناواقفیت کی بنا پر۔ قانونِ اضطرار کے الفاظ یہ ہیں :-

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (بقرہ ۲۱)

البتہ جو شخص مجبور ہو جائے (اور بحالت مجبوری حرام کھا کر اپنی جان بچا لے) بشرطیکہ اس حرام شے کے کھانے کی رغبت نہ رکھتا ہو اور نہ اس مقدار سے زیادہ کھانا چاہتا ہو جتنی کی زندگی بچانے کے لیے ضرورت ہے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (اللہ اس کو معاف کر دے گا کیونکہ) وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان الفاظ سے جہاں بحالت مجبوری ایک ممنوع فعل کے ارتکاب کی رخصت معلوم ہوتی ہے، وہیں اس رخصت کے لیے تین شرطوں کی قید بھی ثابت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ مجبوری واقعی ہو اور طلب و تجسّسِ حلال کی تمام تدبیریں اس حد تک بیکار ہو چکی ہوں کہ بس لقمہ حرام کے سوا اب جان بچانے کا اور کوئی ممکن ذریعہ رہ نہ گیا ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ استعمالِ حرام "غَيْرَ بَاغٍ" ہو یعنی دل میں اس کی کوئی رغبت نہ ہو بلکہ جو ارتکاب حرام کیا جائے پورے احساس ناگواری اور شدید جذبۂ نفرت و کراہت کے ساتھ کیا جائے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ یہ ارتکاب حرام بھی بس اسی حد تک کیا جائے جس حد تک جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔ اگر ان تین شرطوں کے ساتھ کوئی شخص ایک فعل حرام کا مرتکب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو قابل معافی قرار دیتا ہے، لیکن اگر ان تینوں شرطوں میں سے ایک شرط بھی تشنۂ تکمیل رہ گئی تو پھر یہ وعدۂ عفو درگذر بھی شرمندۂ ایفا نہ ہو گا۔ شریعت اس وقت اپنی یہ رخصت واپس لے لے گی اور ایسا کرنے والا اس کی نگاہ میں نافرمان اور قابل مواخذہ قرار پائے گا۔

قانونِ اضطرار کی اس توضیح کی روشنی میں اپنے اجتماعی طرز عمل کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لیجیے، اور پھر اپنی ملت کے ان خدا پرستوں کی تعداد بتائیے جو خداوندانِ باطل کے عرش فرمانروائی کے زیر سایہ رہنے، مسرفین کی اطاعت کرنے، طاغوت کا حق غلامی تسلیم کرنے، اسمبلیوں میں جا کر قانون ساز اور شارع دین بننے، طاغوتی عدالتوں میں اپنے معاملات

لے جانے یا طاغوتی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں وہی مجبوری، وہی احساسِ ناگواری اور وہی جذبۂ کراہت محسوس کرتے ہوں جو ایک مومن کو سور کی بوٹی حلق سے نیچے اتارنے میں محسوس ہو سکتی ہے۔ آخر کروڑوں انسانوں کا یہ انبوہ گراں غیر اللہ کی حاکمیت اور مسرفین کی اطاعت کو حقیقتاً اسی اضطرار کے ساتھ برداشت کر رہا ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے؟ کیا مسلمانوں کے یہ غول در غول جو صبح سے شام تک طاغوتی عدالتوں کا طواف کیا کرتے ہیں، یہ سب واقعۃً اپنے اس فعل کو حرام ہی سمجھتے ہیں اور اس کو محض انتہائی مجبوری کے وقت ہی اختیار کرتے ہیں اور ان میں اپنی اغراضِ نفس کی پیروی، حدود اللہ سے بے اعتنائی اور احکامِ شریعت سے سرتابی کا کوئی داعیہ پنہاں نہیں ہوتا؟ اور وہاں صرف اس لیے جاتے ہیں کہ ان کی جان و مال کی حفاظت کا کوئی امکانی راستہ باوجود جستجو کے نہیں ملتا؟ اور پھر یہ جج اور مجسٹریٹ صاحبان جو اپنی زندگیاں آئینِ طاغوت کے مطابق "دادِ انصاف" دینے میں گزار دیتے ہیں۔ درحقیقت مخمصہ کے شکار اور کسی مجبوری کے مارے ہوئے ہیں؟ اور جس وقت وہ اللہ جل مجدہٗ کے قوانین پسِ پشت ڈال کر شیاطینِ انس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں تو کیا ان کا دل اس فعل کی حرمت کا مقر اور اپنی اس فاسقانہ روش پر متنفر ہوتا ہے اور وہ بالکل غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ہو کر بادلِ ناخواستہ اور بصد استکراہ اس ظلم و فسق کے اسٹیج پر بیٹھتے ہیں جس کو کرسیٔ عدالت کہا جاتا ہے اور جہنم کے ان دہکتے ہوئے انگاروں کو ہاتھ میں لیتے ہیں جن کو روپے کے نام سے اس کارگزاری کے عوض انھیں دیا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً یہ سب لوگ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کی رخصت اور آمرزش کے مستحق ہیں اور ملت کو ترکِ کتابِ الٰہی کا ملزم گرداننا سراپا ظلم و بہتان ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔ مگر حقائق کا کیا کیا جائے کہ وہ ہماری اس خواہش سے ایک فی صدی بھی موافقت نہیں کرتے۔ اک ذرا انصاف سے کام لے کر واقعات پر نگاہ ڈالیے، تو مشاہدہ آپ کو اس حقیقت کے ماننے پر مجبور کر دے گا کہ اب تو ان عدالتوں میں جاتے وقت یا ان کی کرسیوں پر بیٹھتے وقت شرطِ اضطرار کی ضرورت کا تصور تک نہیں پیدا ہوتا، ان کرسیوں تک وہ مسلمان پہنچتا ہی کب ہے جو معاشی خستہ حالیوں کے باعث جسم و جان کا رشتہ نہ برقرار رکھ سکتا ہو اور اب اس کے سوا اس کے لیے اور کوئی چارۂ کار ہی نہ رہ گیا ہو کہ بقائے حیات کے لیے یہ رزقِ خبیث قبول کرے۔ ان جگہوں تک تو وہی پہنچ پاتے ہیں جو پہلے ہی سے آسودہ حال ہوں یا کم از کم یہ کہ اس مہلک افلاس میں مبتلا نہ ہوں جس کو مخمصہ کہا جا سکے۔ اس لیے از روئے واقعہ یہ سب کچھ نہایت ٹھنڈے دل سے اور بالکل جائز سمجھ کر کیا جا رہا ہے۔ اولاد کو تعلیم دے کر تیار ہی اسی لیے کیا جاتا ہے کہ ان کرسیوں تک پہنچ سکیں اور جو پہنچ جاتا ہے وہ ترقیٔ درجات کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ حالانکہ اگر واقعی اضطراری حالت کی وجہ سے اس نے یہ ذریعۂ معاش اختیار کیا ہوتا تو اس کے ایمان کا طبعی اقتضا یہ تھا کہ اس میں ترقی کرنے کی جد و جہد کرنے یا اس پر مطمئن ہونے کے بجائے اسے چھوڑ دینے اور کوئی جائز وسیلۂ رزق اختیار کرنے کے لیے بے چین رہتا مگر ایسے لوگ چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی شاید نہ مل سکیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کھلی ہوئی طاغوت نوازی کو اضطرار کا نام کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر فی الحقیقت ہم غیر اللہ کی حاکمیت کو حرام سمجھتے اور ہماری غیرتِ ایمانی اس سے متنفر ہوتی تو یوں گھروں کے عیش اور مدرسوں کی قیل و قال اور حجروں کی ہائے وہو میں

سکون قلب کے ساتھ مشغول نہ رہتے۔ اگر ہم سے کچھ نہ بن پڑتا تو کم سے کم یہ تو ہونا چاہیے تھا کہ اس منکر عظیم کے ساتھ کسی قسم کا تعاون یا مداہنت کرنے کے بجائے اس کے خلاف زبان اور دل سے انتہائی نفرت کا اظہار کرتے، کہ بقول رسولؐ یہ ایمان کی آخری حد ہے مگر یہاں حال یہ ہے کہ نہ صرف اس سے کسی نفرت اور کراہت کی ضرورت نہیں محسوس کی جا رہی ہے بلکہ اس کو برا ہی نہیں سمجھا جاتا اور اس کے قیام کے لیے حلف وفاداری اٹھائی جاتی ہے اور اس کی بقا کے لیے جسم و دماغ کی ساری قوتیں نثار کی جا رہی ہیں۔ کیا ایک مبغوض شے سے یہی برتاؤ کیا جا سکتا ہے؟ آخر اتنی بڑی عظیم الشان برائی کے ساتھ ایمان کے اس کم سے کم مقتضا کا تو اظہار ہونا چاہیے جس کی حدیث بالا میں وضاحت کی گئی ہے؟ یا اس سے بھی کم ایمان کا کوئی اور درجہ ہے؟ اضطرار کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے ورنہ اگر اس کے دامن میں اتنی وسعت ہے جتنی آپ نے سمجھ رکھی ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا کی کوئی برائی اور قرآن کی کوئی قانون شکنی بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں رہ سکتی اور ایک متبع قرآن اپنے نفس کی پیروی بالکل اسی بے باکی سے کر سکتا ہے جس بیباکی سے ایک منکر آخرت کرتا ہے اور اخلاق و خدا پرستی کے وہ سارے اصول و ضوابط بیکار ہو کر رہ جائیں گے جن کی تعلیم و تبیین کے لیے قرآن کا نزول اور صاحب قرآن صلعم کی بعثت ہوئی ہے۔ لیکن یاد رہے اضطرار کی یہ وہ تاویل ہے جس سے اللہ اور رسول بالکل بری ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب ایک برائی کسی سوسائٹی میں نمودار ہوتی ہے تو ابتدا میں سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر اس پر نفرت اور ملامت کا اظہار کرتا ہے۔ اگر یہ جذبۂ نفرت و ملامت قوی ہو تو وہ برائی دب جاتی ہے، اور اگر یہ جذبہ اتنا کمزور ہو کہ اس برائی کو برگ و بار لانے سے نہ روک سکے تو اس کے جراثیم تیزی سے پھیلنے لگتے ہیں، اب اگر اس سوسائٹی کے خواص اپنے امکان بھر اس برائی کا استیصال نہ کریں بلکہ اس کے خلاف صرف اظہار خیال کر دینے ہی کو کافی سمجھیں تو رفتہ رفتہ ان کی نگاہیں بھی اس سے مانوس ہوتی چلی جاتی ہیں، اور زیادہ دن نہیں گذرنے پاتے کہ وہ برائی برائی نہیں رہ جاتی اور خاص و عام سب اسی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں، اس وقت وہ معاشرہ کا جزو لاینفک بن جاتی ہے اور اس پر استحسان یا کم از کم اباحت کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے اور اس کے لیے اپنے مسلّمہ اصول اخلاق میں ترمیم اور تغیر تک گوارا کر لی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاں اس بات کی ہدایت کر دی گئی تھی کہ نیکی کو پھیلاتے اور برائی کو مٹاتے رہنا، وہیں اس خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اگر تم نے منکرات اور فواحش کی روک تھام نہ کی تو تمہارے دلوں تک وہ اپنے جراثیم پہنچا دیں گے اور تم خدا کی عنایات سے محروم اور اس کی لعنتوں کے مستحق ہو کر رہ جاؤ گے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس زریں ہدایت کو اپنے دماغوں میں محفوظ نہ رکھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان کے دل، ان کے دماغ، ان کے نقطہ ہائے نظر اور ان کے انداز فکر بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں اور جس چیز سے نفرت ہونی چاہیے تھی اس سے رغبت کی جا رہی ہے، جس چیز سے بھاگنا چاہیے تھا اس کی طلب میں دوڑ لگائی جا رہی ہے، جس چیز کو پیروں تلے روند ڈالنا چاہیے تھا وہ دانتوں سے پکڑی جا رہی ہے۔ ان کے پیغمبر نے یہ بتلا دیا تھا کہ ایمان کی آخری حد یہ ہے کہ ہر برائی سے دل میں نفرت رکھی جائے، ایسی نفرت جو اس برائی کو مٹا دینے کے لیے اکساتی رہے۔ ورنہ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں، یعنی کسی برائی کو نہ صرف برضا و رغبت قبول کرنے ہی کو منافی ایمان قرار دیا ہے بلکہ اس کو دیکھ کر اپنے اندر جذبۂ نفرت کا نہ محسوس کرنا بھی ویرانی قلب اور محرومی ایمان کی یقینی علامت بتایا ہے۔ مگر اب

اس تعلیم کے علمبرداروں کو اس امر پر بڑا اصرار ہے کہ ہم بلا اظہار کراہت اور بغیر کسی احساس نفرت کے غیر اللہ کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں پر رکھیں گے، خود قانون ساز اور شارع دین بنیں گے، طاغوت کو اپنا حکم بنائیں گے طاغوتی قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ کریں گے اور پھر بھی ہمارا دین نہ جائے گا، نہ ایمان خراب ہوگا، نہ ہماری توحید اور عبودیت میں فرق آئے گا، نہ اتباع قرآن میں فتور واقع ہوگا، نہ ہم پر کتاب الٰہی کے ترک و نسیان کا الزام وارد ہوگا، نہ ہم نقض میثاق کے مجرم ہوں گے، کیونکہ ہم حالتِ "اضطرار" میں ہیں۔ ع وائے گر پس امروز بود فردا۔

اس خیال خام اور فریب نفس کے مفاسد کا پورا پورا اندازہ آپ کو اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ ان مذکورہ بالا احکام قرآنی کے چھوڑ بیٹھنے کے ان دوررس نتائج کو سامنے رکھ لیں جو ہمارے انفرادی اور اجتماعی مسائل زندگی کے اندر رونما ہوتے ہیں۔ غیر اللہ کی حاکمیت میں ایک وفادار رعایا بن کر رہنے کے معنی یہی نہیں ہیں کہ ہم نے ایک صریح حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب ہماری زندگی شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی جو اسلام کے مطلوبہ قالب سے بالکل مختلف ہوگا، اب ہمارے معاشرہ کی تاسیس ہمارے تمدن کی اٹھان، ہمارے نظام تعلیم کی تعمیر اور ہمارے مسائل معاش و اقتصاد کی تنظیم ایسی بنیادوں پر ہوگی، جو ہماری خواہشوں کے علی الرغم، ہم کو اپنے اجتماعی مسلک اور اپنے تصورات زندگی سے دور پھینکتی چلی جائیں گی، غیر الٰہی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے اور کرانے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ بس ایک گناہ سرزد ہو رہا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان بہت سے احکام اسلامی کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور ان کی وقعت دلوں سے محو ہو جائے جو ہمارے معاملات زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم اپنے دین اور قرآن کو سمیٹ کر مسجدوں اور حجروں میں بند کر دیں اور دین کے صرف اتنے حصہ پر اکتفا کر لیں جس کا تعلق چند مخصوص مذہبی رسوم و شعائر اور عبادات سے ہے۔ چنانچہ اب یہ سارے نتائج قیاس کے دائرہ سے نکل کر واقعات کے عالم میں آ چکے ہیں۔ اس ملت کے علمبرداروں نے قرآن کے ایک بڑے حصہ کو حکومت اور اولو الامر کے نام پر ترک کر کے اور عدم استطاعت اور اضطرار کے بہانے پیدا کر کے جن کا رہائے ناکردنی کو اختیار کیا ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے بے شمار احکام اور اصول زندگی سے ان کا رشتہ کٹ گیا اور دین کے صرف ایک محدود حصہ پر وہ عمل کر سکنے کے قابل رہ گئے۔ ابتدا میں دین کے ان بنیادی اصولوں اور اس کے مقتضیات سے اس جبری علیحدگی پر خود ہی ایمان مضطرب ہوئی مگر امتداد زمانہ نے اس اضطراب کو سکون و اطمینان سے بدل دیا، اور اب انجام کار دماغوں پر غیر شعوری طور سے یہ وہم مستولی ہو گیا ہے کہ دین انہی چند عبادات کا نام ہے جن کو ہم ادا کر رہے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کا تعلق دنیا اور دنیاداری سے ہے۔ اس لیے اس قسم کے احکام و اصول قرآنی کے متروک ہو جانے کے باوجود ہمارا تدین غیر مشکوک اور ہمارا اتباع قرآن کامل ہے۔ دراصل یہی تصور دین ہے جس نے ان احکام متروکہ کی اہمیت ہماری نگاہوں میں گھٹا دی ہے اور اس حد تک گھٹا دی ہے کہ دلوں میں ان کے لیے کوئی اضطراب، کوئی تمنا اور کوئی حسرت باقی نہیں رہنے دی۔ مسجد کی ایک اینٹ بھی اگر کھود کر پھینک دی جائے تو اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانوں کی گردنیں خون کے دریا بہانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں مگر اللہ کی بے شمار حدود کی بے حرمتی کو دیکھ کر تڑپنے کے لیے

ایک دل اور بہنے کے لیے ایک قطرۂ اشک بھی تیار نہیں۔ اس فرق کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ دین کا کام سمجھا جاتا ہے اور یہ دنیا کا۔ لیکن چونکہ ان حدود و احکام کا ذکر بھی اسی قرآن میں موجود ہے جس میں ان چند مخصوص عبادات اور ہر اس حکم کے اتباع کا عہد کیا گیا ہے جو قرآن میں ہے، اس لیے زبان سے یہ کہنے کی جرأت تو نہیں ہوتی کہ یہ حدود و احکام دین سے خارج ہیں لیکن جب اطاعت امر اور ادائگی فرض کا سوال پیدا ہوتا ہے تو غیر شعوری طور پر دین کا یہی محدود تصور اور سہل پسندی کا مخفی جذبہ کبھی قانون اضطرار کی آڑ لینے پر مجبور کرتا ہے اور کبھی احکام کی ذمہ داری سے فرار کی سعی کی جاتی ہے۔

غرض غیرت ایمانی کی کمی، احساس فرض کی پژمردگی اور سہل پسندی و دنیا پرستی نے کافرانہ اقتدار اور کافرانہ اصول نظریات کے سامنے سپر ڈال دینے پر آمادہ کیا، اس آمادگی نے قرآن کے ایک بڑے حصہ کو چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اس مجبوری، یا یوں کہیے کہ جبری ارتداد نے اپنی خدا پرستی اور بے گناہی کا بھرم رکھنے اور اپنی نگاہوں سے آپ اپنی خطا کا صورت چھپانے کے لیے دین کا تصور محدود اور بے روح کر دیا، ایسا محدود کہ جن احکام پر عمل نہیں ہو رہا ہے، ان کو دین ہی سے خارج کر دے اور ایسا بے روح کہ زندگی کے میدان وہ کہیں، ہماری اغراض کے برخلاف، مزاحم نہ ہو سکے۔ پھر اس خود ساختہ اور بے روح تصور دین نے ملت کی تمام فرض ناشناسیوں، کمزوریوں اور بے عملیوں کی شناعت کا احساس فراموش کرا دیا۔ سب سے آخر میں سیاسی اقتدار کے فقدان اور اضطرار کے حیلے آئے اور انھوں نے اس پورے سلسلۂ اوہام پر حقانیت کا پردہ ڈال دیا۔ اب یہ تمام خود ساختہ اور فاسد نظریات ایک دوسرے سے غذا حاصل کر رہے ہیں اور سب نے مل کر مغالطوں کا ایسا جال تیار کر دیا ہے جس کے گھیرے میں عقلیں چکرا رہی ہیں، اور ان کے سامنے راہ حقیقت اس طرح مسدود ہے کہ اب ان میں تلاش منزل کے محرکات بھی دم توڑ رہے ہیں۔ اگر انسان میں اپنی غلطی کا احساس زندہ ہو تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اس کی اصلاح کرے گا لیکن اگر یہ احساس مردہ ہو گیا اور اس کی نظر میں غلطی غلطی نہ رہ گئی تو پھر اس کے تائب ہونے کی تمام توقعات سراب ثابت ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر اس ملت نے اپنی کامل تباہی اور دین و دنیا دونوں کی رسوائی کا تہیہ نہ کر لیا ہو تو اپنی بے گناہی کے زعم باطل سے اس کو جلد از جلد باز آجانا اور اپنا جرم تسلیم کر لینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا قانون ہدایت بھی عجیب شان بے نیازی رکھتا ہے۔ ایک ہی چیز ہوتی ہے جس سے کسی کے سامنے ہدایت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ حقیقت کو پا لیتا ہے، مگر وہی چیز دوسروں کو ضلالت کے فتنہ میں مبتلا کر دیتی ہے اور وہ راہ راست سے اور دور ہو جاتے ہیں۔ اس قانون کا راز اللہ جل مجدہٗ کی اس سنت عدل میں ہے کہ جو حق کی سچی طلب رکھتا ہے اسی کے سامنے راہ حق باز کی جاتی ہے اور جو حق سے بے اعتنائی برتتا ہے، اس کے سامنے حق کی تجلی کبھی نہیں چمکتی۔ آفتاب کی شعاعیں ایک عالم کو منور کر دیتی ہیں مگر چشم بوم اپنی کورنگاہی کی بنا پر اس کے فیضان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی یہی حال آفتاب ہدایت کی شعاعوں کا بھی ہے۔ قرآن نے اپنی صفت جہاں یہ بتائی ہے کہ میں لوگوں کے لیے مشعل ہدایت ہوں، وہیں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ بہتوں کے لیے وسیلۂ غوایت بھی ہوں۔ اس کے اس قول میں اسی قانون ہدایت کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ اسی شخص کو راہ راست دکھاتا ہے جو دیکھنا چاہے اور اسی وقت دکھاتا ہے جب دیکھنے کی حقیقی آرزو ہو۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا یہ قانون صرف کفار کے لیے ہے اور مومن

چونکہ اس پر ایمان لاچکے ہیں، اس لیے اب وہ اس قانون سے آزاد ہیں۔ نہیں، یہ کافر اور مومن سب کے لیے عام ہے۔ ایک مومن بھی قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود دراصل زندگی میں اس قرآن سے اسی وقت کسب ہدایت کرسکتا ہے جب وہ پورے اخلاص قلب کے ساتھ اس کی طلب بھی کرے۔ ورنہ جس وقت بھی، اور زندگی کے جس معاملہ میں بھی، اس نے اس سے رہنمائی کی خواہش نہ کی، اور غیر مشروط طور پر اس کی اقتدا کرنے اور اس غرض سے اس کا زاویۂ نگاہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی، وہاں یقیناً وہ اس کو گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دے گا، اور اس امر کا کوئی لحاظ نہ کرے گا کہ وہ میرا منکر نہیں بلکہ ماننے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ ایمان لانے اور ہدایت یاب ہونے کے بعد بھی اپنے قلب و نظر کو کجروی سے مامون نہ سمجھے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ خدایا میرے سامنے سے ہدایت کی روشنی گم نہ ہونے پائے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا۔

قرآن کے ان احکام و فرامین کے بارے میں جو اس وقت زیر بحث ہیں، بالکل اسی مجرمانہ بے اعتنائی سے کام لیا جارہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں سے سمت منزل کی رہنمائی ہو رہی تھی، ٹھیک اسی جگہ سے بھٹکنے کا سامان فراہم کرلیا گیا۔ قرآن میں جو یہ الفاظ آتے ہیں کہ اے مومنو! ایک خدا کی فرماں روائی کے آگے خود جھکو اور سارے عالم کو جھکا دو۔ اے ایمان لانے والو! کفر کے علمبرداروں سے لڑ کر فتنہ کا سر کچل دو۔ اے ایمان رکھنے والو! معروف کا حکم دو اور منکر سے روک دو۔ اے مسلمانو! چور کا ہاتھ کاٹ دو اور زانی کو درے لگاؤ۔ وغیر ذالک، تو اس انداز خطاب کی اصل بنیاد ایک ایسی عظیم الشان حقیقت پر تھی کہ اس کا صحیح تصور ہی اس کارگہ حیات میں مومن کا مقام متعین کردینے کے لیے کافی تھا۔ اگر ہم طلب حق لے کر قرآن پر نگاہ ڈالتے تو پاتے کہ یہ طرز خطاب اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس امت کی حیثیت ایک حکمران پارٹی کی ہے اور اس کا مقام رہبانیت کے حجروں میں یا محکومی کے جوے تلے نہیں ہے بلکہ امامت و جہانبانی کے تخت پر ہے اور اس مسند امامت سے نیچے وہ اس کی حیثیت کو فرض ہی نہیں کرتا، نہ اس سے کم پوزیشن میں کبھی اس کو دیکھنا چاہتا ہے۔ سوچیے تو سہی زندگی کا کتنا بلند، حریت آموز اور جاں بخش تصور تھا جو اس اسلوب بیان میں موجود تھا اور قلب مسلم کو کیسے پاکیزہ اور عالی عزائم سے معمور کردینے والا سبق تھا جو اس اشارۂ قرآنی میں چھپا فکر و نظر کا منتظر ہے۔ مگر قصور نظر کا برا ہو زندگی کا پیغام بھی ہمارے لیے موت کا پروانہ بن گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ رب العزۃ کے اس طرز خطاب کے راز کو سمجھ کر اپنا کھویا ہوا مقام اور بھولا ہوا فریضہ یاد کیا جاتا اور اپنی کوتاہیوں پر نادم ہو کر ان کی تلافی کی سعی کی جاتی اور پھر اس مقام کی بازیافت کی سرفروشانہ جدوجہد کی جاتی جہاں ہمارا شہنشاہ مطلق ہم کو دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر ہوا یہ کہ یہی انداز خطاب ہمارے لیے بے عملی کے جواز کی سند اور اقامت حق کی راہ کا روڑا بن گیا۔ اور یہ کہہ کر کہ چونکہ ان احکام کے مخاطب حکام خلافت ہیں اور اس وقت ہم کو خلافت کا اقتدار حاصل نہیں، ہم نے اپنی ذمہ داری کا بوجھ اتار کر پھینک دیا۔ یہ طرز فکر و عمل بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک مسلمان جب قرآن و سنت پر نظر ڈالے اور دیکھے کہ مسلمان کی تعریف اور اسلام کا معیار یہ ہے کہ وہ متقی اور صالح ہو، متواضع اور مجاہد ہو، تمام اخلاق حسنہ سے متصف اور خصائل بد سے مجتنب ہو، حدود اللہ کا پابند اور تمام حقوق کا پورا کرنے والا ہو، یہ دیکھ کر وہ اس معیار تک پہنچنے کی اس بنا پر کوشش نہ کرے کہ میں ضعیف الایمان بھلا اس مقام تک کب پہنچ سکتا ہوں، ایمان کا یہ معیار بلند تو

تو بس صحابہ ہی کے لیے مخصوص تھا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ طرزِ فکر کتنا غلط ہے۔ اگر کوئی مسلمان قرآنی معیارِ ایمان سے فروتر ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس معیار تک پہنچنے کی ہر ممکن سعی کرے نہ کہ مشکلات کی فہرست سنا کر مطمئن ہو رہے۔

بالکل یہی روش آیت اضطرار کے بارے میں بھی اختیار کی گئی۔ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کی شرط لازم میں غیرتِ حق کے تحفظ کا جو راز پنہاں تھا اور زندگی کے نازک سے نازک اور ناموافق سے ناموافق مواقع میں بھی اپنے مقام کی عظمت برقرار رکھنے اور اپنے مطمحِ نظر کا پاس رکھنے کا جو اصول پوشیدہ تھا اس کی طرف تو نظر نہیں گئی یا پہنچی ہوئی نظر کو بند کر لیا گیا لیکن فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ کی آڑ لے کر اباحت کا دروازہ کھول لیا گیا۔ بلاشبہ اس آیت میں بحالتِ مجبوری ایک فعلِ حرام کے ارتکاب کی گنجائش عطا کی گئی ہے لیکن یہ اس آیت کا صرف ایک پہلو ہے اور اس کا دوسرا پہلو، جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ لائقِ اعتنا ہے، نظروں سے بالکل اوجھل ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ تم کبھی، کسی حال میں بھی، کسی امرِ منکر پر قلب کی ادنیٰ سے ادنیٰ رضامندی کے ساتھ نہیں جم سکتے۔ بلکہ اگر کبھی ایسی صورت پیش آجائے تو اپنے تمام افکار کو اسی ایک فکر میں تحلیل کر دینا کہ کسی طرح اس دامِ بلا سے نجات مل جائے جس میں سوءِ اتفاق نے لا پھنسایا ہے اور جب تک یہ نجات نہ مل سکے بس یوں سمجھنا کہ مردار کا سڑا ہوا گوشت ہے جس کو دانتوں سے نوچ رہا ہوں یا خنزیر کی بوٹیاں ہیں جن کو نگل رہا ہوں، یا عفونت بھری غلاظت ہے جس میں جسم اور کپڑے لت پت ہو گئے ہیں۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اس حرام سے دور ہو جانے کی بالکل اس طرح بے تابانہ کوشش کرو گے جس طرح کسی آدمی کا پاؤں نکیلے اور تپتے ہوئے سنگریزوں پر پڑ جاتا ہے تو وہ تلملا کر فوراً ہی اس کو اٹھا لینے اور کسی نرم اور ہموار زمین پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس آیت کا دیا ہوا یہ درس اگر ہم کو یاد ہوتا تو اس وقت ہماری دنیا یہ دنیا نہ ہوتی اور وہ شکست خوردہ ذہنیت، وہ پست نقطۂ نگاہ اور وہ ایمان سوز طرزِ فکر ہماری قوتوں کو اس طرح مفلوج نہ کر دیتا جسے ہمارے نفس نے کلامِ الٰہی کو اپنا آلۂ کار بنا کر ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے۔ اور کروڑوں انسانوں کی اتنی بھاری جمعیت، اضطرار کے نام پر قرنوں تک منکرات اور خبائث کے ساتھ اس طرح کی قابلِ شرم سازگاری نہ دکھاتی کہ اتباعِ قرآن کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اس کا قافلہ کفر و فسق کی بنائی ہوئی روش پر پورے ذوق و شوق کے ساتھ چلا جا رہا ہے، اور اس کے دل میں کبھی کوئی غیرت، کوئی نفرت اور کوئی بے چینی نہیں محسوس ہوتی۔ منکرات کے ساتھ سازگاری دکھانے کے بجائے ہم ان کے خلاف مجسم احتجاج ہوتے، ہمارا ذوقِ ایمانی ہماری زندگی کو تلخ بنا دیتا اور ہماری غیرتِ اسلامی ہم کو مجبور کر دیتی کہ اس غلاظتِ کفر کو، جس طرح بھی ہو سکے، اپنے دامن سے دھو کر دم لیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم کو اضطرار کی رخصت تو یاد رہ گئی مگر غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کی شرط اور اس شرط کے لوازم اور مقتضیات کو دانستہ یا نادانستہ بالکل نظر انداز کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تریاق زہر کا کام دینے لگا۔

پس اس امت کے لیے ترکِ کتابِ الٰہی کے جرم اور اس جرم کی رسوا کن سزاؤں سے نجات پانے کی اگر کوئی راہ ہے تو صرف یہ کہ وہ اپنی تمام تر کوششوں کو اس صورتِ حال کے بدل ڈالنے پر مرتکز کر دے جس میں وہ اپنے حاکمِ اعلیٰ کے فرامین سنتی ہے مگر عمل نہیں کرتی یا نہیں کر سکتی، نہ یہ کہ اضطرار اور عدمِ استطاعت کا بہانہ کر کے اپنے جرم پر پردہ ڈال کر مطمئن ہو رہے۔ یہ اطمینان دراصل ایمان کے کھوکھلے ہونے یا دین کی بصیرت سے محروم ہونے کی دلیل ہے اور فریبِ نفس کا ایسا خطرناک طلسم ہے جو اگر پوری قوت سے نہ توڑا گیا تو قلبِ ملت کی وہ ضعیف ترین دھڑکنیں بھی ختم ہو جائیں گی جو ابھی تک کبھی کبھی محسوس ہو جاتی ہیں۔

(باقی)

رسائل و مسائل

علمبرداران حق کا قافلہ کس منزل میں

ذیل کے چند خطوط کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوسکے گا کہ تحریک اسلامی کو قبول کر لینے کی وجہ سے ہمارے رفقا کن کن مشکلات میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ بس جہاں کوئی سلیم الفطرت انسان خلوص و دیانت کے ساتھ خدا کا کام کرنے اٹھا، خدا کے بندے اس کے راستہ میں طرح طرح سے حائل ہونے لگے۔ طرفہ تماشا یہ کہ اس تصادم کا آغاز بالعموم گھر کی چار دیواری سے ہوتا ہے، ماں اور باپ، بہن اور بھائی ہی اعلان جنگ کرنے میں سبقت کرتے ہیں۔

مگر یہ سب کچھ توقع کے خلاف نہیں ہے، اس راہ میں ہمیشہ یہی پیش آیا ہے اور آج بھی یہی پیش آسکتا ہے۔ خوش بخت ہیں وہ لوگ جو غیر اللہ کے مظاہرۂ غیظ و غضب کا مقابلہ کرنے کے لیے خدا سے استقامت کی توفیق پائیں۔

سوال:- میں اپنے حالات مختصراً پیش کرتا ہوں۔ مجھے بتلایئے کہ کونسا طریق کار اختیار کروں کہ میرے اسلام میں فرق نہ آئے۔

(۱) والدین اٹھتے بیٹھتے اصرار کر رہے ہیں کہ ملازمت پر واپس چلا جاؤں۔ بحالت موجودہ وہ نہ صرف اپنا بلکہ خدا کا نافرمان بھی گردانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف ایسے وقت پر والدین کی نافرمانی جائز ہے جب وہ یہ کہیں کہ خدا کو نہ مانو۔ باقی تمام امور میں والدین کا حکم شرعی طور پر واجب التعمیل ہے۔ عنقریب وہ اعلان کرنے والے ہیں کہ نوکری پر چلا جاؤں تو بہتر ورنہ میرا ان سے کوئی تعلق نہ رہ سکے گا۔ بس وہ اتنی رعایت مجھے دیتے ہیں کہ اگر میں مستقل طور پر ملازمت اختیار کرنا نہیں چاہتا تو کم از کم سال ڈیڑھ سال اور اختیار کیے رکھوں، حتیٰ کہ میرے چھوٹے بھائی بی۔ اے کر لیں اور میری خالی جگہ کو پر کر سکیں۔ اس سلسلہ میں گناہ وہ اپنے سر لیتے ہیں۔

(۲) ادھر عوام میں میری بے اثری بڑھ رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس ذوق و شوق سے دوران ملازمت میں لوگ میری بات سنا کرتے تھے یا حمایت کا دم بھرا کرتے تھے اب وہ ختم ہو رہا ہے۔ بلکہ میری باتوں کا ان پر الٹا اثر ہوتا ہے۔

(۳) بڑے بھائی بتلاتے ہیں کہ اگر نوکری حرام ہے تو زمینداری کونسی حلال ہے۔ ہماری زمین سرکار ــــ (ایک ریاست) نے ہمارے آباؤ اجداد کو بخشش کے طور پر دی تھی وہ تو تمہارے نظریہ کی رو سے حلال آمدنی قطعاً نہیں دے سکتی۔ علاوہ بریں اسلام میں زمیندارہ سسٹم سرے سے ناجائز ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے دادا نے اپنی جائداد بروئے شریعت تقسیم نہیں کی تھی۔ ان کی وراثت صرف نرینہ اولاد میں چلی ہے اور مستورات کو محروم رکھا گیا ہے۔ پھر نوکری کو حرام کہنے کے بعد ایسی جائداد پر کوئی شخص کیسے بسر اوقات کر سکتا ہے؟

(۴) مسلمانوں کی اکثریت جہالت اور شرک میں مبتلا ہے۔ قبروں پر حاجات لے کر جانے اور نہ جانے کا سوال بہت اہمیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس سلسلہ میں اگر مصلحۃً سکوت کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حق کو قبول کرنے کے ساتھ لوگ شرک کرنے کی گنجائش کو بھی بحال رکھیں یوں بھی مصلحت اندیشی تا کجے۔ آخر بھانڈا پھوٹتا ہے اور لوگوں کو معلوم ہوئے رہتا ہے کہ ہم قبروں پر جا کر حاجات طلب کرنے کے خلاف ہیں۔ جہاں یہ بات کھلی بس فوراً ہی آدمی کو وہابی کا سرٹیفکیٹ ملا اور کسی کو وہابی قرار دینے کے بعد لوگ اس کی بات سننے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس سے بدکنے لگتے ہیں کہ کہیں یہ ہمارے عقائد کے اس محل پر پتھر نہ پھینک مارے جس کی تعمیر میں ان کے آباؤ اجداد نے پسینے بہائے ہیں اور جس کی حفاظت میں عمریں گذار دی گئی ہیں۔ میں بھی اب اسی خدشہ کا ہدف بن رہا ہوں۔

جواب:۔ آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ اب اسی مرحلہ پر پہنچ گئے ہیں جس سے میں نے آپ کو یہاں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ میں اس معاملہ میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ آپ کیا رویہ اختیار کریں۔ اس کا فیصلہ آپ کو بالکل اپنے قلب و ضمیر کی آواز پر کرنا چاہیے اور اپنی ہمت کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ بہرحال جو فیصلہ بھی آپ کریں، ٹھنڈے دل سے کریں اور خدا سے دعا مانگتے رہیں کہ آپ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس کے بعد پسپائی کی نوبت آئے۔ پسپا ہونے سے اقدام نہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

فیصلہ کو آپ کے اپنے ضمیر پر چھوڑنے کے بعد میں صرف ان دلائل کا جواب دیے دیتا ہوں جو آپ کے مقابلہ میں پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) عذاب و ثواب کوئی کسی کا دنیا میں نہیں اٹھا سکتا۔ ہر شخص اپنے عذاب و ثواب کا خود حامل ہے۔ میرے کہنے سے اگر آپ کوئی گناہ کریں تو میں کہنے کا گنہگار ہوں گا اور آپ کرنے کے گنہگار ہوں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کے کرنے کا گناہ بھی کہنے والے کی طرف منتقل ہو جائے۔

(۲) والدین کی فرمانبرداری صرف اسی حد تک ہے جس حد تک ان کی فرمانبرداری سے خالق کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو۔ اگر وہ کسی معصیت کا حکم دیں تو ان کی اطاعت کرنا صرف یہی نہیں کہ فرض نہیں ہے بلکہ الٹا گناہ ہے۔

(۳) جس فعل کو آپ خود معصیت سمجھتے ہوں اسے ڈیڑھ یا دو سال تک صرف اس لیے کرتے رہنا کہ خاندان کا ایک اور فرد آپ کے بجائے اس معصیت کے لیے تیار ہو جائے، بالکل ایک غلط فعل ہے۔ اگر آپ اپنے عقیدہ میں صادق ہیں تو آپ کی یہ دلی خواہش ہونی چاہیے کہ نہ صرف آپ خود اس سے بچیں بلکہ خدا کا ہر بندہ اس سے محفوظ رہے۔

(۴) یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں زمینداری سرے سے ناجائز ہے۔ زمین کی شخصی ملکیت کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور اگر کوئی شخص خود کاشت نہ کر سکتا ہو تو بٹائی پر دوسرے کو دینا جائز ہے۔ البتہ ہندوستان میں زمینداری کی بعض شکلیں ایسی ضرور رائج ہو گئی ہیں جو جائز نہیں ہیں۔ اگر شرعی طریقہ پر آپ زمینداری کریں اور ناجائز فائدے اٹھانے سے بچیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

(۵) جو جائداد کسی شخص کو آباؤ اجداد سے ملی ہو اس کی سابق تاریخ دیکھنے کا شریعت نے اسے مکلف نہیں کیا۔ اس معاملہ میں قرآن کا قانون گذشتہ پر گرفت نہیں کرتا بلکہ حال اور مستقبل کی اصلاح ہی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جب وہ جائداد اس کی ملکیت میں آئے اس وقت سے وہ اس میں شرعی طریقہ پر تصرف کرے اور سابق میں جن

لوگوں نے اس کو غلط طریقہ سے حاصل کیا تھا اور اس میں غلط تصرفات کیے تھے ان کے معاملہ کو خدا پر چھوڑ دے۔ البتہ اگر کوئی چیز آپ کے قبضہ میں ایسی ہو جس کے بارے میں آپ کو متعین طور پر معلوم ہو کہ اس میں فلاں فلاں لوگوں کے غصب شدہ حقوق شامل ہیں اور وہ لوگ بھی موجود ہوں، نیز ان کا حصہ بھی متعین طور پر معلوم ہو تو اپنی حد تک ان کے حقوق واپس کر دیجیے۔

(۶) ملازمت کے زمانہ میں آپ کے ذاتی اور خاندانی اثر کی بدولت جو لوگ آپ کا اثر قبول کر رہے تھے وہ حقیقت میں دین کی دعوت سے متاثر نہیں ہو رہے تھے، وہ جاہ و مال کے بت کی پوجا کر رہے تھے اور آئندہ بھی اگر آپ اس پوزیشن پر رہیں تو یہ دھوکا نہ کھائیے گا کہ لوگوں کو آپ خدا پرست بنا رہے ہیں۔ سچے خدا پرست تو وہی لوگ ہوں گے جو آپ کی دنیوی پوزیشن کو دیکھ کر نہیں بلکہ آپ کی دعوت کی سچائی اور آپ کے تقویٰ کو دیکھ کر متاثر ہوں۔ میرے نزدیک تو آپ صحیح معنوں میں دعوتِ حق کے داعی اسی وقت بنیں گے جب تمام اعزازات آپ سے چھن جائیں، زمین آپ کو جگہ دینے سے انکار کر دے اور وہ سب جو کل تک آپ کے سامنے جھکے پڑتے تھے، آپ کو رد کرنے اور آپ سے منہ پھیرنے پر اتر آئیں۔ یہ صورت حال ہے تو بہت خطرناک لیکن اس راہ میں یہی کچھ مفید ہے۔ اگر خدا نے آپ کو اتنی طاقت دی کہ آپ اسے برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں تو اس کا حقیقی فائدہ آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا اور اسی وقت آپ کو اللہ تعالیٰ جھوٹے رفیقوں کی رفاقت سے بچا کر سچے رفیق بہم پہنچائے گا۔

(۷) عوام کے عقائد پر خواہ مخواہ بادل و ہلہ ضرب لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے لیکن اپنے عقائد پر پردہ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ "وہابیت" کے الزام سے بچنے کا اہتمام نہ کیجیے۔ لوگوں نے درحقیقت مسلمان کے لیے یہ دوسرا نام تجویز کیا ہے۔ وہ گالی مسلمان کو دینا چاہتے ہیں لیکن مسلمان کہہ کر گالی دیں تو اپنا اسلام خطرہ میں پڑتا ہے اس لیے وہابی کہہ کر گالی دیتے ہیں۔ اس حقیقت کو جب آپ سمجھ جائیں گے تو پھر وہابی کے خطاب سے آپ کو کوئی رنج نہ ہوگا۔ جو عقائد اور جو اعمال مشرکانہ ہیں ان سے بہرحال پرہیز کیجیے اور توحید کو اس کے اصلی تقاضوں کے ساتھ بے تکلف بیان کیجیے۔ شرک اور مشرکانہ باتوں سے پرہیز اور توحید اور مقتضیاتِ توحید کی پابندی اگر وہابیت ہے تو خدا اپنے ہر بندے کو وہابی ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور غیر وہابی ہونے سے بچائے۔

سوال:- صوبجاتی اجتماع سے واپس آنے پر میں یکایک ان پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا ہوں جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ آپ کی شدید مصروفیات کا علم رکھنے کے باوجود ان احوال کا تفصیلی تذکرہ آپ ہی کے اس ارشاد کی بنا پر کر رہا ہوں کہ اس نوعیت کے امور سے آپ کو پوری طرح مطلع رکھنا ضروری ہے۔ خیر تو ۱۹ اکتوبر کو والد مکرم کا جو گرامی نامہ موصول ہوا ہے وہ لفظ بلفظ درج ذیل ہے:-

"برخوردار نور چشم ——— بعد دعائے ترقیٔ درجات کے واضح ہو کہ اب تم خود مختار ہو گئے ہو، ہماری سرپرستی کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم مکان پر بیمار پڑے ہیں اور تم کو جلسوں کی شرکت لازم اور ضروری۔ اب اللہ کے فضل سے نوکر ہو گئے۔ ہم نے اپنی تمام کوشش سے تعلیم میں کامیاب کرایا اور اس کا نتیجہ پایا۔ عالم باعمل ہو گئے کہ باپ کا حکم ماننا ظلم اور حکم خدا کے خلاف قرار پایا۔ اوروں کا حکم ماں باپ

زیادہ افضل! غیر تمہاری کمائی سے ہم نے اپنی ضعیفی میں بڑا آرام پایا۔ آئندہ ایک پیسہ بھی ہم لینا نہیں چاہتے۔ تم تمہارا جی چاہے کرو اور جہاں چاہے رہو، خواہ سسرال میں یا کسی اور جگہ۔ البتہ ہم اپنی صورت اس وقت تک نہیں دکھلانا چاہتے جب تک جماعت سے استعفا نہ دیدو۔ تم نے برابر اس مراق میں (یعنی تحریک اسلامی کی خدمت میں) سب تعلیم کا کام خراب کر دیا۔ مگر ہمارا نصیحت کرنا بیکار ہے۔ بس یہ واضح رہے کہ ہمارے سامنے نہ آنا۔ ہمارا غصہ بہت خراب ہے۔ فقط

والد مکرم کے اس خط کا جواب راقم الحروف نے یہ لکھ دیا:۔

"محترمی! کل آپ کا گرامی نامہ بدست .... موصول ہوا۔ اسے دیکھ کر اور آپ کی بیماری کا حال معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا۔ یقین جانیے مجھے خبر تک نہ تھی کہ آپ بیمار رہیں۔ نہ آپ نے کوئی خط لکھا نہ مجھے کسی اور ذریعہ سے حال معلوم ہوا ورنہ میں یقیناً وہاں نہ جاتا۔ یہ ایک عذر شرعی تھا جس کی بنا پر سفر کو ملتوی کیا جا سکتا تھا۔

والدین کے احسانات اور ان کی مہربانیوں کا کون انکار کر سکتا ہے۔ پھر آپ نے تو اعلیٰ تربیت کا اور دینی تعلیم سے آراستہ کیا۔ اسی تعلیم سے مجھے یہ یقین حاصل ہوا کہ دین کو دنیا میں غالب کرنا، خدا کے کلمہ کو بلند کرنا، دنیا میں اسلام کا سکہ چلانا اور اس کے لیے کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ میں نے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈالی اور مجھے ایک ہی جماعت اس مقصد کے لیے صحیح طریقہ اور اصلی اور بہترین ڈھنگ سے کام کرتی ہوئی نظر آئی اور وہ جماعت "جماعت اسلامی" ہے۔ اس لیے اگر مجھے دین کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے کوشش کرنی ہے تو اس سے منسلک رہنا ضروری ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ دین کے غلبہ کی کوشش اگر مسلمان کی زندگی کا مقصد نہیں تو پھر اور کیا مقصد ہے!

والدین کا حکم ماننا ضروری! ان کی اطاعت فرض! لیکن کہاں تک؟ جب تک خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر دین کو غالب کرنا ضروری ہے تو وہ کیا یونہی آرام سے بیٹھے ہوئے، بے انتھک کوشش کیے ہوئے ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کوئی بہت سہل کام ہے؟ کیا دین کے لیے اتنی قوت اور اتنا وقت بھی صرف نہیں کرنا چاہیے جتنا ہم اپنے پیٹ کے لیے کرتے ہیں؟ کیا یہ کام تنہا ایک آدمی کے کرنے کا ہے؟ ـــــ بہرحال دین کے لیے جس جماعت میں بھی رہ کر کام کیا جائے گا اس میں وقت بھی صرف ہوگا، مال بھی خرچ کرنا ہوگا، تکلیف بھی ہوگی، کچھ دنیاوی کاموں کا حرج بھی ہوگا، اور کسی نہ کسی قوت سے تصادم کا ڈر بھی ہوگا اور آپ مجھے منع فرمائیں گے۔ پھر لِلّٰہ! آپ ہی بتائیے کہ اس کام کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ آپ کی سرپرستی سے محروم ہو جانا میری انتہائی بدنصیبی ہے۔ لیکن یہ تو خیال فرمائیے کہ آپ کس چیز سے مجھے منع فرما رہے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے، کہیں یہ حکم خدا کے خلاف تو نہیں ہے۔

قل ان کان اٰباءکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال ن اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ۔ واللہ لایھدی القوم الفاسقین (سورہ توبہ) ترجمہ:۔ اے نبی فرما دیجیے کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارے خاندان، تمہارے وہ اموال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور تمہاری وہ سوداگری جس میں گھاٹا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور تمہاری مرغوب آرام گاہیں تمہیں اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں سر توڑ کوشش کرنے کے مقابلہ میں محبوب تر ہیں تو انتظار کرو اس گھڑی کا کہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو جائے۔ اور یاد رکھو کہ اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں بخشتا۔

میں سخت حیرت، اور انتہائی افسوس کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ دین کے غلبہ کے لیے جو کوشش میں کر رہا ہوں اس پر آپ ناراض ہیں۔ آخر آپ ہی فرمایئے کہ اس صورت میں میرا فرض کیا ہے، مندرجہ بالا آیت کو ملحوظ رکھ کر سوچیے۔
حاضر ہونے کو جی چاہتا ہے مگر آپ کے عتاب سے خائف ہوں۔ دیکھیے آپ کیا اجازت عنایت فرماتے ہیں"۔

یہ جواب اس پس منظر کی بنا پر لکھا گیا تھا کہ والد صاحب وقت کی اضاعت، صرف مال اور خوف قوت تسلط کی بنا پر جماعت میں کام کرنے سے منع کرتے ہیں نیز یہ کہ ان کے اشارے پر..... ..... سے ایک بہت مدلل قسم کا طویل و عریض خط آیا تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ بہرحال حق و اسلام جماعت اسلامی میں منحصر نہیں، تنہا کام کیجیے یا کسی اور جماعت میں رہ کر۔
والد محترم کی طرف سے مجھے ابھی تک منقولہ بالا عریضہ کا جواب نہیں ملا ہے۔ اندریں حالات مناسب ہدایات سے مستفید فرمایئے۔

جواب:۔ آپ نے والدین کے عتاب پر جو جواب دیا ہے وہ بہت معقول ہے۔ مسلمان کی زندگی ایک نہایت متوازن زندگی کا نام ہے جس میں، تمام حقوق و فرائض کا مناسب لحاظ ہونا چاہیے اور کسی حق یا فرض کی اضاعت نہ ہونی چاہیے، الا یہ کہ ایک حق کو دوسرے حق پر اس حد تک قربان کیا جائے جس حد تک ایسا کرنا شرعاً ضروری ہو۔ والدین کا حق خدا کے حق کے بعد سب سے بڑا ہے، لیکن بہرحال خدا کے حقوق کے بعد ہی، اس پر مقدم کسی طرح نہیں ہے۔ پس جہاں خدا کا حق ادا کرنے کے لیے والدین کے حق میں کوئی کمی کرنا بالکل ناگزیر ہو وہاں موقع و محل کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھتے ہوئے صرف اسی حد تک کمی کی جائے، اور ساتھ ساتھ ان کے عتاب اور خشم کو نہایت تحمل اور تواضع کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ ان کی سختی کے مقابل میں اف تک نہ کیجیے، مگر جس چیز کو آپ اپنی دینی بصیرت کے مطابق دین سمجھتے ہیں اس سے والدین کو خوش کرنے کے لیے بال برابر بھی نہ ہٹیے۔ اولاد پر والدین کی خدمت، اطاعت اور ادب فرض ہے لیکن ان کی خاطر ضمیر کی قربانی فرض نہیں ہے، خصوصاً اس ضمیر کی جو دین کی روشنی سے منور ہو چکا ہو۔

اس معاملہ میں آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنی چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی متعدد صحابۂ کرام کو یہ مشکل پیش آچکی ہے۔ اس وقت حضورؐ کی رہنمائی میں صحابۂ کرام نے اپنے ان والدین کے ساتھ جو دین میں کسی نہ کسی طرح مزاحم ہو رہے تھے، جو طرز عمل اختیار کیا تھا اس کو ملحوظ رکھیے۔

سوال:۔ ہمارے ہاں کے ایک نوجوان رکن جماعت ...... میں اپنے بڑے بھائی کی زیر سرپرستی تجارت کر رہے ہیں لین دین میں احکام شریعت کی پابندی اور وقت پر نماز پڑھنے کے لیے چلے جانے کی بنا پر ان کے بڑے بھائی سخت برہم ہیں اور ان پر سختی کر رہے ہیں۔ اب تک ان کے کئی خطوط میرے نام آچکے ہیں جن میں انھوں نے لکھا ہے کہ تیری (یعنی راقم الحروف کی) وجہ سے میرا بھائی خراب ہو گیا ہے، اس پر دیوانگی طاری ہے۔ کاروبار میں اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی، رات دن تیرا وظیفہ پڑھتا ہے۔ تو شیطان ہے، انسان کی شکل میں ابلیس ہے، ماں باپ اور اولاد میں اور بھائیوں میں جدائی ڈالتا ہے، میرے بھائی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھ، اس کے نام نہ خط لکھ نہ ماہی اجتماع میں شرکت کی دعوت دے، بلکہ اس کو جماعت سے خارج کر دے ورنہ ——— !

اس سلسلہ میں مناسب ہدایات سے ہماری رہنمائی کیجیے۔"

جواب:۔ جہاں خاندان کے لوگ جاہلیت میں مبتلا ہوں اور راہ راست پر چلنے میں اپنے بھائی بندوں کی مزاحمت کرتے ہوں وہاں توفی الواقع جدائی ڈالنا ہی ہمارا کام ہے۔ ایسے اعزہ و اقربا اور دوستوں سے اہل ایمان کو ملانا نہیں، بلکہ توڑنا اور کاٹنا ہی ہمارے پیش نظر ہے۔ لہٰذا جو الزام ہمارے رفیق کے بھائی نے آپ پر لگایا ہے اس کی تردید کی ضرورت نہیں بلکہ صاف صاف اعتراف کی ضرورت ہے اور بہت نرمی کے ساتھ ان کو اس بات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ اس جدائی کو میل اور موافقت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو خدا پرستی اور دینداری میں مزاحم ہونے کے بجائے مددگار اور ساتھی بننے کی کوشش کریں ورنہ ہم اور ہمارے رفیق اپنے طرز عمل پر قائم رہیں گے اور آپ کو اختیار ہے کہ جو سلوک آپ کا نفس ہمارے ساتھ کرنا چاہتا ہے وہ کر گزریں۔

البتہ یہ خیال رکھیے کہ آپ کی طرف سے کوئی بات ضد یا اشتعال دلانے والی نہ ہو، بلکہ صبر و تحمل کے ساتھ اس شخص کے نفس کی اصلاح کرنے کی کوشش کیجیے جس کو جاہلیت کے غلبہ نے اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اس آیت کا مصداق بن گیا: ارأیت الذی ینھی عبداً اذا صلی۔

درحقیقت یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کو نماز کی پابندی تک گوارا نہیں ہے۔ خود پابندی کرنا تو درکنار، دوسرا اگر کرتا ہے تو اس پر بھی بگڑتے ہیں۔ ایسے مسلمانوں کی حالت پر اگر کبھی ہم تنقید کرتے ہیں تو ہمیں خارجیت کا طعنہ دیا جاتا ہے

سوال:۔ میں بغرض تعلیم اسی سال .... چلا گیا تھا۔ داڑھی رکھ کر گھر واپس آیا تو تمام دوست و احباب نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ خود والد مکرم بھی بشدت مجبور کر رہے ہیں کہ "داڑھی صاف کرا دو کیونکہ اس کی وجہ سے تم بڑے بوڑھے معلوم ہوتے ہو۔ اگر اصرار سے کام لوگے تو ہم تم سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔" گھر سے نکلنے پر دوست بہت تنگ کرتے ہیں اس لیے مجبوراً خانہ نشینی اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ اب چند اصحاب کی طرف سے یہ پیغام ملا ہے کہ "اگر آٹھ یوم میں ہمارا مطالبہ پورا نہ کیا گیا یعنی داڑھی نہ منڈوائی گئی تو تمام برادری سے متفقہ بائیکاٹ کرایا جائے گا۔ بڑی عمر میں یہ شوق رکھ لینا مگر اب اگر رکھو گے تو زبردستی سے کام لیا جائے گا۔" میں داڑھی کو پابندی احکام شریعت میں بہت مدد پاتا ہوں۔ مثلاً مجھے سینما بینی کا شوق تھا مگر اب داڑھی رکھنے کے بعد سینما ہال میں جانے سے شرم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب مخالفین کے دلائل سنتا ہوں تو کبھی کبھی یہ شبہہ ہوتا ہے کہ شاید یہی لوگ ٹھیک کہتے ہیں مگر پھر یہ جذبہ کام کرنے لگ جاتا ہے کہ چاہے پوری دنیا میری مخالفت پر اتر آئے، میرے رویہ میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ للہ میری رہنمائی کیجیے تاکہ مجھے اطمینان نصیب ہو۔

جواب:۔ جب آپ نے سنت رسول سمجھ کر یہ کام کیا ہے تو پھر کسی کے اعتراض و مخالفت کی پروا نہ کیجیے اور سب سے کہہ دیجیے کہ یہ داڑھی رہنے کے لیے آئی ہے، جانے کے لیے نہیں آئی، اس کے ہوتے ہوئے اگر آپ میرے ساتھ تعلق رکھ سکتے ہیں تو رکھیے ورنہ اگر آپ کے لیے سنت رسولؐ اس قدر ناقابل برداشت ہے کہ اس کی وجہ سے میرے ساتھ بھی تعلق رکھنا ناگوار ہے تو بخوشی قطع تعلق کر لیجیے، میرے لیے خدا اور رسول کافی ہیں۔

اختلافی مسائل پر امت سازی کا فتنہ

سوال:- مجھے مذہبی تنازع اور تفرقہ سے فطری بُعد ہے اور وہ تمام جزئی مسائل جن میں اختلاف کرنے کی گنجائش خود شریعت میں موجود ہے ان میں اختلاف کو جائز رکھتا ہوں۔ اسی طرح اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معاملہ میں دو یا تین طریقہ ہائے عمل ثابت ہوں تو ان سب کو جائز اور سنت کی حد کے اندر شمار کرتا ہوں۔ مثلاً نماز میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا میرے نزدیک دونوں برابر ہیں، چنانچہ میں ان دونوں صورتوں پر عمل کر لیتا ہوں، کبھی اس پر اور کبھی اس پر۔ مجھے اپنے اس مسلک پر پورا پورا اطمینان ہے اور میں نے اسے سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ مگر والد کرم نے جو رکن جماعت بھی ہیں محض نماز میں رفع یدین کا التزام چھوڑ دینے کی وجہ سے مجھے یہ نوٹس دے دیا ہے کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو پھر ہمارے تمہارے درمیان سلام کلام کا تعلق برقرار نہیں رہ سکتا۔ میں نے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوتی۔ اب یہ قضیہ میرے اور والد کرم کے حلقۂ تعارف میں بحث کا موضوع بن گیا ہے اور دونوں کی تائید اور تردید میں لوگ زور استدلال صرف کر رہے ہیں۔ مجھ پر جو بے سروپا اعتراضات عموماً ہو رہے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ تو حنفی ہو گیا ہے، تیرا دو طریقوں پر عمل کرنا دوعملی اور نفاق ہے، تم جماعت کی اکثریت سے مرعوب ہو گئے ہو، تمہارا اصل مقصود طلب زر اور حصول عزت ہے، تمھیں احناف نے یہ پٹی پڑھائی ہے، تو مودودی صاحب کا مقلد ہے، وغیرہ۔ ان اعتراضات میں سے دلچسپ ترین تو یہ تھا کہ ہمیں پہلے ہی مودودی صاحب سے یہ اندیشہ تھا کہ وہ جماعت اسلامی کے نام پر اہل حدیث کو حنفی بنا کے رہیں گے، چنانچہ یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ یعنی پہلے پہل تو اس جماعت میں آنے والے سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا فقہی مسلک جماعت میں آنے کے بعد بھی برقرار رہیگا، مگر جماعت میں آنے کے بعد ایسے طریقوں سے کام لیا جاتا ہے کہ کسی شخص کو خود کوئی احساس ہی نہیں ہوتا اور اس کا مسلک سراسر بدل جاتا ہے۔ میں حسب موقع ان سب اعتراضات کے جواب دیتا رہا ہوں، لیکن پھر بھی اپنے اطمینان کے لیے حسب ذیل امور کی وضاحت چاہتا ہوں:-

۱- والدین کے حقوق کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟ کیا وہ اولاد سے مسائل کی تحقیق کا اور اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرنے کا حق بھی سلب کر سکتے ہیں؟ کیا والدین کی مرضی کے خلاف مسلک اہل حدیث کی خلاف ورزی (یعنی ترک رفع یدین) کرنے پر "سخط الرب فی سخط الوالدین" کی وعید کا مستوجب ہو جاؤں گا؟

۲- ازروئے شریعت نماز میں رفع یدین کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا ترک رفع سے آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے؟

۳- کیا ایک رکن جماعت دوسرے رکن سے اس بنا پر مقاطعہ کر سکتا ہے کہ اس نے مزعومہ مسلک اہل حدیث کی خلاف ورزی کی ہے؟

جواب:- جس نزاع کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس کا حال پڑھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ مجھ کو اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی کہ ہماری جماعت میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو فقہی مسائل میں تعصب و تشدد کی اس حد کو پہنچے ہوئے ہوں گے۔ اگر آپ جیسا معتمد علیہ آدمی ان حالات کا راوی نہ ہوتا اور ایک دوسری اطلاع سے آپ کی تائید نہ ہو گئی ہوتی تو شاید

میں اس بات کو باور کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا کہ واقعی ہماری جماعت میں ایسی صورت حال پیدا ہوئی ہوگی۔ بہرحال اب کہ اس نزاع نے سر اٹھا ہی لیا ہے، میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ کی اصولی اور فقہی اور جماعتی حیثیت کو صاف صاف واضح کر دوں:

۱۔ اصولی حیثیت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ شرعی مسائل میں کسی شخص یا گروہ کا کسی خاص طریق تحقیق و استنباط یا کسی مخصوص مذہب فقہی کی پیروی کرنا اور چیز ہے اور اس کا اپنے اس خاص طریقہ یا مذہب کے لیے متعصب ہونا اور اس کی بنا پر جتھے بندی کرنا اور اس سے مختلف مذہب رکھنے والوں سے مغایرت و منافرت برتنا اور اس کی پابندی ترک کرنے والوں کو اس طرح ملامت کرنا کہ گویا ان کے دین میں کوئی نقص آ گیا ہے، بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ پہلی چیز کے لیے تو شریعت میں پوری پوری گنجائش ہے، بلکہ خود صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے طرز عمل سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے اور دین میں اس سے کوئی خرابی رونما نہیں ہوتی۔ لیکن دوسری چیز بعینہٖ وہ تفرق فی الدین ہے جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے اور اس تفرق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لوگ فقہی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھے ہیں، پھر ان مسائل میں ذرا ذرا سے اختلاف پر ان کے درمیان الگ الگ امتیں بنتی ہیں، پھر ان فروعی بحثوں میں وہ اس قدر الجھتے اور ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے امت مسلمہ کی زندگی کے اصل مقصد (یعنی اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین) کی خاطر مل کر جد و جہد کرنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔

مسلک فقہی کے اعتبار سے کسی کا طریق اہل حدیث یا طریق حنفی یا طریق شافعی وغیرہ پر چلنا بجائے خود کسی قباحت کا موجب نہیں، لیکن اگر یہ چیز آگے بڑھ کر یہ صورت اختیار کر لے کہ مسلمان فی الحقیقت ایک امت نہ رہیں، بلکہ اہل حدیث، احناف، شوافع وغیرہ ناموں کے ساتھ الگ الگ مستقل امتیں بن جائیں، اور شرعی اعمال کی جو خاص صورتیں ان مختلف گروہوں نے اختیار کر رکھی ہیں وہ ہر ایک گروہ کے مخصوص شعائر قرار پا جائیں جن کی بنا پر ان گروہوں میں مغایرت اور امتیاز واقع ہو، تو پھر یقیناً یہ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دین اسلام میں اس تقسیم اور تعصب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ رفع یدین کرنا یا نہ کرنا، آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا، اور ایسے ہی دوسرے امور صرف اسی وقت تک شرعی اعمال ہیں جب تک کوئی شخص ان کے ترک یا فعل کو اس بنا پر اختیار کرے کہ اس کی تحقیق میں حاملِ شریعت سے ایسا ہی ثابت ہے، یا یہ کہ ایسا کرنا دلائل شرعیہ کی بنا پر ارجح اور اولیٰ ہے۔ مگر جب یہی اعمال کسی مخصوص فرقے کے شعائر بن جائیں اور ان کا ترک یا فعل وہ علامت قرار پائے جس کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جانے لگے کہ آپ کس فرقہ میں داخل اور کس سے خارج ہیں اور پھر انہی علامتوں کے لحاظ سے یہ طے ہونے لگے کہ کون اپنا ہے اور کون غیر، تو اس صورت میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا، یا آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا یا ایسے ہی دوسرے امور کا ترک اور فعل دونوں یکساں بدعت ہیں اور بدترین قسم کی بدعت ہیں۔ اس لیے کہ سنت رسول اللہ میں بجائے خود تو ان اعمال کا ثبوت ملتا ہے، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان اعمال کو مسلمانوں کے اندر گروہ بندیوں اور فرقہ سازیوں کے لیے علامات اور شعائر بنایا جائے۔ ایسا کرنا در اصل حدیث کا نام لے کر صاحب حدیث علیہ السلام کے منشا کے بالکل برعکس کام کرنا ہے اور اس اصل کام کو غارت کرنا ہے جس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے۔

۲- اب اس سلسلہ کی فقہی حیثیت کو لیجیے۔ رفع یدین کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ مختلف طرزِ عمل منقول ہیں:

ا- ابن عمرؓ کی روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ تین مواقع پر رفع یدین کرتے تھے۔ افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت، رکوع میں جاتے ہوئے، اور رکوع سے اٹھ کر۔

ب- مالک بن حویرث کی روایت جس میں دو موقعوں پر رفع یدین کا ذکر ملتا ہے۔ افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت اور رکوع سے اٹھ کر۔

ج- وائل بن حُجر کی روایت جس میں چار مواقع پر اس کا ہونا مذکور ہے۔ افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت۔ رکوع میں جاتے ہوئے۔ رکوع سے اٹھتے ہوئے۔ سجدہ کے موقع پر۔

د- ابوحُمید ساعدی کی روایت، اس میں بھی چار مواقع پر رفع یدین کا ذکر ہے، مگر چوتھا موقع سجدہ کی بجائے تیسری رکعت میں قعدہ سے اٹھنے پر بیان کیا گیا ہے۔

س- عبداللہ ابن مسعود اور براء ابن عازب کی روایت جس میں صرف ایک مرتبہ رفع یدین کرنے کا ذکر ہے، یعنی افتتاحِ صلوٰۃ کے موقع پر۔

ان مختلف روایات میں سے (ا) کو امام شافعی، احمد، اور ابوثور نے، نیز اہل الحدیث اور اہل الظاہر کی اکثریت نے اختیار کیا اور ایک روایت امام مالک سے بھی یہی ہے کہ وہ اس کو ترجیح دیتے تھے۔ (د) کو اہل الحدیث کے ایک گروہ نے مرجح ٹھہرایا۔ اور (س) کو ابراہیم نخعی، شعبی، سفیان ثوری، ابوحنیفہ اور تمام فقہائے کوفہ نے ترجیح دی۔ لیکن یہ واضح رہے کہ سوال صرف ترجیح کا ہے نہ کہ ردّ و قبول کا۔ ائمہ سلف میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ جن مختلف طریقوں کا ذکر مذکورہ بالا احادیث میں آیا ہے ان میں سے کسی پر حضورؐ نے عمل نہیں کیا تھا، بلکہ کہتے صرف یہ ہیں کہ جس خاص طریقہ کو ہم نے مرجح قرار دیا ہے وہ حضورؐ کا عام معمول تھا اور دوسرے طریقوں پر آپ کبھی کبھی عمل کر لیتے تھے۔ پس جب معاملہ کی حقیقت یہ ہے تو ان طریقوں میں سے جس پر بھی کوئی عمل کر رہا ہے، حدیث ہی کی پیروی کر رہا ہے اور اس پر نکیر کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اتباعِ پیغمبر پر نکیر کی جاتی ہے جس کی جرأت مقلدین کو بھی زیبا نہیں کجا کہ اہلِ حدیث اس کا ارتکاب کریں۔ پھر اگر کوئی شخص ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر جامد ہونے کے بجائے وقتاً فوقتاً ان سب طریقوں پر عمل کرتا رہے جو حدیث میں مذکور ہیں تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ صحیح و مکمل پیروی ہوگی، اور لفظ عمل بالحدیث کا اطلاق اس طرزِ عمل پر زیادہ صحیح معنیٰ میں ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ابتدا ہی میں ایک طریقہ کو ترجیح دینے اور باقی سب طریقوں کو ترک کر دینے کے بجائے ان سب طریقوں کو نماز میں اختیار کرنے کی گنجائش رکھی جاتی تو شاید بعد کے ادوار میں وہ جمود و تعصب پیدا ہی نہ ہوتا جس کی بدولت نوبت یہ آگئی ہے کہ لوگ نماز کی جس صورت کے عادی ہیں اس سے ذرا سی مختلف صورت بھی جہاں انھوں نے دیکھی اور بس وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس شخص کا دین بدل گیا ہے اور یہ ہماری امت سے نکل کر دوسری امت میں جا ملا ہے۔

یہ رائے جو میں عرض کر رہا ہوں یہ صرف میری انفرادی رائے ہی نہیں ہے بلکہ پہلے بھی متعدد اہلِ تحقیق اسی خیال کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس وقت میرے پاس سفر میں کتابیں موجود نہیں ہیں .... اس لیے میں زیادہ وسیع

پیمانہ پر فوائد پیش نہیں کر سکتا، لیکن حجۃ اللہ البالغہ خوش قسمتی سے مل گئی ہے اس سے چند حوالے یہاں نقل کرتا ہوں۔ شاہ صاحب پہلے تو یہ اصولی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

الاصل ان یعمل بکل حدیث الا ان یمتنع العمل بالجمیع للتناقض (باب القضاء فی الاحادیث المختلفة)

اصولی بات یہ ہے کہ آدمی ہر حدیث پر عمل کرے، الا یہ کہ کسی مسئلہ میں سب حدیثوں پر عمل کرنا تناقض کی وجہ سے غیر ممکن ہو۔

پھر آگے چل کر فصل فی عدۃ امور مشکلۃ من التقلید واختلاف المذاہب میں فرماتے ہیں:-

ان اکثر صور الاختلاف بین الفقہاء لا سیما فی المسائل التی ظہر فیہا اقوال الصحابة فی الجانبین کتکبیرات التشریق وتکبیرات العیدین ونکاح المحرم وتشہد ابن عباس وابن مسعود والاخفاء بالبسملة وبآمین والاشفاع والایتار فی الاقامة ونحو ذلک، انما ہو فی ترجیح احد القولین وکان السلف لا یختلفون فی اصل المشروعیة وانما کان خلافہم فی اولی الامرین ونظیرہ اختلاف القراء فی وجوہ القراٰءۃ وقد عللوا کثیرا من ہذا الباب بان الصحابة مختلفون وانہم جمیعا علی الہدی۔

واقعہ یہ ہے کہ فقہا کے درمیان اختلاف کی اکثر صورتیں بالخصوص ان مسائل میں جن میں صحابہ کے اقوال دونوں طرف پائے جاتے ہیں مثلاً تکبیراتِ تشریق، تکبیرات عیدین، نکاح محرم، تشہد ابن عباس و ابن مسعود، بسم اللہ اور آمین کا اخفاء، تکبیراتِ اقامت میں کلمات کو ایک ایک مرتبہ یا دو دو مرتبہ پڑھنا وغیرہ، ان میں اختلاف دراصل اس امر میں ہے کہ دو اقوال میں سے کس کو کس پر ترجیح ہے ورنہ ان مختلف طریقوں کے بجائے خود مشروع ہونے میں سلف کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ ان کا اختلاف تو صرف اس اعتبار سے تھا کہ دو مختلف امور میں سے اولیٰ کونسا ہے، اور یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسے قرأت کی مختلف صورتوں میں قاریوں کے درمیان اختلاف ہے اس معاملہ میں بیشتر امور کے اختلاف کی وجہ سلف نے یہ بتائی ہے کہ صحابہ کرام خود ان میں مختلف تھے اور ظاہر ہے کہ صحابہ سب کے سب ہدایت پر تھے۔

پھر باب اذکار الصلوٰۃ وہیاٰتہا المندوب الیہا میں فرماتے ہیں:-

وہو (ای رفع الیدین) من الہیأت وفعلہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرۃ وترکہ مرۃ والکل سنة واخذ بکل واحد جماعة من الصحابة والتابعین ومن بعدہم وہذا احد المواضع التی اختلف فیہا الفریقان اہل المدینة والکوفة ولکل واحد اصل اصیل والحق عندی فی مثل ذلک ان الکل سنة

اور وہ (یعنی رفع یدین) نماز کی ان ہیئتوں میں سے ہے جن کو نبی صلعم نے کبھی کیا ہے اور کبھی نہیں کیا۔ اور یہ دونوں طریقے سنت ہیں، صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں میں سے ایک ایک جماعت نے ان میں ایک ایک طریقے کو اختیار کیا ہے، اور یہ من جملہ ان معاملات کے ہے جن میں اہل مدینہ اور اہل کوفہ کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے، لیکن ہر ایک کے لیے ایک ثابت شدہ اصل شریعت میں موجود ہے اور ایسے مسائل میں میرے نزدیک حق یہ ہے کہ سب مختلف طریقے یکساں سنت ہیں۔

شاہ صاحب کی ان تصریحات کے بعد اس امر کی ضرورت نہیں رہتی کہ میں آمین کے مسئلہ کے متعلق الگ بحث کروں۔ تاہم اس معاملہ میں صاحب البحر الرائق کا یہ قول نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ:-

والصواب ان الخبرین بالجہر بہا والمخافتۃ اور صحیح یہ ہے کہ آمین زور سے کہنے اور آہستہ کہنے، دونوں کی روایتیں صحیح
صحیحان وعمل بکل من فعلیہ جماعۃ من العلماء ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر علماء کی ایک ایک جماعت نے عمل کیا ہے۔

۳۔ ہماری جماعت کا ان اختلافی معاملات میں جو مسلک ہے اس کی توضیح اس سے پہلے بارہا کی جاچکی ہے، اور میں اب ایک مرتبہ پھر اسے صاف صاف الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں۔ اس جماعت میں اہل حدیث، احناف، شوافع اور ایسے ہی دوسرے فقہی طریقوں پر چلنے والے مسلمانوں کے لیے اپنے اپنے فقہی مسلک پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے، بشرطیکہ وہ ان مسلکوں میں سے کسی کے لیے متعصب نہ ہوں، اور ان اختلافات کو منافرت اور جتھہ بندی کا ذریعہ نہ بنائیں۔ جماعت کے اندر جو لوگ بھی شامل ہوں انھیں اسلامی عصبیت کے سوا اور ساری عصبیتیں اپنے اندر سے نکالنی ہوں گی خواہ وہ وطنی عصبیتیں ہوں، نسلی ہوں، طبقاتی ہوں یا گروہی۔ ان کو محبت اور دوستی کے رشتہ میں جوڑنے والی چیز اسلام کے سوا اور کوئی نہ ہو، اور ان کے اندر غصہ و نفرت کو بھڑکانے والی بھی اسلام سے دوری کے سوا کوئی دوسری چیز نہ ہو۔ کسی رکن جماعت کے لیے کسی دوسرے شخص کا اہل حدیث یا حنفی یا شافعی مسلک پر ہونا یا اختیار کر لینا نہ تو سبب محبت ہی ہو اور نہ سبب نفرت۔ اس لازمی و ضروری شرط کے ساتھ اہل حدیث اہل حدیث رہتے ہوئے اور حنفی حنفی رہتے ہوئے اور شافعی شافعی رہتے ہوئے جماعت اسلامی کا رکن ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص کسی مخصوص فقہی مذہب کے لیے متعصب ہو، اور اپنے مذہب کے پیروؤں سے محبت اور دوسرے طریقے والوں سے نفرت رکھتا ہو، اور حنفی، شافعی یا اہل حدیث ہو جانے کو جرم سمجھتا ہو اس کے لیے ہماری اس جماعت میں کوئی جگہ نہیں۔

۴۔ میرے متعلق اس نزاع کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس پر میں صبر کرتا ہوں اور ان لوگوں کے معاملہ کو خدا پر چھوڑتا ہوں جنھوں نے بغیر علم و تحقیق کے یہ بدگمانی لوگوں میں پھیلائی کہ میں اہل حدیث کو حنفی بنانے کی سازش کر رہا ہوں۔ کاش وہ لوگ جو فقہی جزئیات میں کتاب و سنت کی پیروی پر بڑا زور دیا کرتے ہیں، اخلاقی معاملات میں بھی کتاب و سنت کی کچھ پیروی کر لیا کریں۔

۵۔ آپ کے والد ماجد نے اس قضیہ میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس کی دو حیثیتیں ہیں، ایک رکن جماعت ہونے کی حیثیت سے اور ایک آپ کے والد ہونے کی حیثیت سے۔ جہاں تک پہلی حیثیت کا تعلق ہے اس پر میں نمبر ۳ میں روشنی ڈال چکا ہوں لہٰذا وہ براہ کرم اپنے متعلق فیصلہ کر لیں کہ آیا وہ اپنے رویہ کو بدلنا پسند فرماتے ہیں یا جماعت سے علیٰحدگی۔ رہی دوسری حیثیت، تو اس کے متعلق میں مختصر طور پر صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ جہاں تک اصول دین کا تعلق ہے، والدین کو نہ صرف یہ حق ہے بلکہ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اعتقادی ضلالت یا اخلاقی فساد سے روکنے کی کوشش کریں۔ لیکن جہاں تک فقہی معاملات کا تعلق ہے، والدین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اولاد کو اپنے مسلک خاص کی پیروی پر مجبور کریں۔ خصوصاً جبکہ اولاد صاحب علم ہو اور تحقیق کی بنا پر والدین سے مختلف کسی دوسرے مسلک فقہی کو اختیار کرنا چاہے تو والدین کے لیے یہ مطالبہ کرنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیق کے خلاف عمل کرے۔ اس معاملہ میں سلف کا صحیح اتباع یہ ہے کہ والدین اور اولاد دونوں کو تحقیق کی آزادی اور اپنی تحقیق پر عمل کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ اس حق کو سلب کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ایک شخص اہل حدیث یا حنفی یا شافعی ہو تو وہ اپنی آئندہ نسل کو بھی اہل حدیث، حنفی، یا شافعی بنانے پر اصرار کرے گا اور دو چار پشتیں گزر جانے کے بعد

پھر یہ محض فقہی مسالک نہ رہیں گے، بلکہ نسلی امتیں بن جائیں گی جن میں تعصب ہوگا، جمود ہوگا اور آبائی مسلک سے ہٹنا ارتداد کا ہم معنی قرار پائے گا۔ آپ خود ہی اپنے والد ماجد سے دریافت فرمالیں کہ آیا وہ اپنی آئندہ نسل کو اس فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں؟

سفر میں قصرِ صلوٰۃ

سوال: (۱) قصر صلوٰۃ انگریزی میلوں کے حساب سے کتنے لمبے سفر میں واجب ہے؟

(ب) کیا یہ فاصلہ یک طرفہ سفر کے لیے ہے یا آمد ورفت کی دوہری مسافت بھی شمار ہوگی؟

(ج) کیا ایک مقررہ حلقہ میں سفر کرنے پر بھی یہ رعایت حاصل ہوگی؟

جواب: (۱) فقہا کی آرا اس معاملہ میں مختلف ہیں۔ چنانچہ قصر صلوٰۃ کے لیے کم از کم ۹ میل اور زیادہ سے زیادہ ۴۸ میل کا نصاب سفر مقرر کیا گیا ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آنحضورؐ سے اس معاملہ میں کوئی صریح ارشاد منقول نہیں ہے، اور نص صریح کی غیر موجودگی میں جن دلائل سے استنباط کیا گیا ہے۔ ان کے اندر مختلف اقوال کی گنجائش ہے۔ صحیح یہ ہے کہ قصر کے لیے مسافت کا ایسا تعین جس میں ایک نقطۂ خاص سے تجاوز کرتے ہی قصر کا حکم لگایا جاسکے شارع کا منشا نہیں ہے، شارع نے "سفر" کے مفہوم کو عرفِ عام پر چھوڑ دیا ہے اور یہ بات ہر شخص خود بآسانی جان سکتا ہے کہ کب وہ سفر میں ہے اور کب سفر میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اگر شہر سے تفریح کے لیے نکلتے ہیں یا گاؤں سے خرید و فروخت کے لیے شہر جاتے ہیں تو کبھی بھی مسافر ہونے کا احساس ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے جب واقعۃً سفر درپیش ہوتا ہے تو ہم مسافرت کی کیفیت خود محسوس کرتے ہیں۔ اسی احساس کے مطابق قصر اور اتمام کیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ شرعی معاملات میں صرف اس شخص کا فتوائے قلب معتبر ہے جو شریعت کی پابندی کا ارادہ رکھتا ہو نہ کہ بہانہ بازی کا۔

(ب) اس حصہ کا جواب اوپر ہی کی سطور میں موجود ہے۔ ویسے جن فقہا نے مقدارِ سفر مقرر کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے پیش نظر یک طرفہ مسافت تھی۔

(ج) ہاں، مقررہ حلقہ میں سفر کرنے کی شکل میں بھی قصر صلوٰۃ کرنا چاہیے جس طرح اس حلقہ سے باہر کے سفروں کے دوران میں۔

ہندوستان میں گائے کی قربانی کا مسئلہ

سوال: مسلمان قوم اگر ہندوستان میں گائے کی قربانی کو روک دے تو اسلام کی نگاہ میں کوئی قیامت نہیں آجاتی خصوصاً جب کہ اس فعل میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ پھر کیوں نہ ایک ہمسایہ قوم کا اتحاد حاصل کرنے کے لیے رعایت سے کام لیا جائے؟ اکبر اعظم، جہانگیر، شاہ جہاں اور موجودہ نظام حیدرآباد نے عملی مثالیں اس سلسلہ میں قائم کی ہیں۔

جواب :۔ آپ نے جن بڑے بڑے "اماموں" کا نام لیا ہے، افسوس ہے کہ مجھے ان میں سے کسی کی تقلید کا شرف حاصل نہیں ہے۔ میرے نزدیک مسلمانوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کو راضی کرنے کے لیے اگر گائے کی قربانی ترک کی تو چاہے وہ کائناتی قیامت نہ آجائے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے، لیکن ہندوستان کی حد تک اسلام پر واقعی قیامت تو ضرور آجائے گی۔ افسوس یہ ہے کہ آپ لوگوں کا نقطۂ نظر اس مسئلہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کی عین ضد ہے۔ آپ کے نزدیک اہمیت صرف اس امر کی ہے کہ کسی طرح دو قوموں کے درمیان اختلاف و نزاع کے اسباب دور ہو جائیں، لیکن اسلام کے نزدیک اصل اہمیت یہ امر رکھتا ہے کہ توحید کا عقیدہ اختیار کرنے والوں کو شرک کے ہر ممکن خطرہ سے بچایا جائے۔

جس ملک میں گائے کی پوجا نہ ہوتی ہو اور گائے کو معبودوں میں شامل نہ کیا گیا ہو اور اس کے تقدس کا بھی عقیدہ نہ پایا جاتا ہو، وہاں تو گائے کی قربانی محض ایک جائز فعل ہے جس کو اگر نہ کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن جہاں گائے معبود ہو اور تقدس کا مقام رکھتی ہو، وہاں تو گائے کی قربانی کا حکم ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا۔ اگر ایسے ملک میں کچھ مدت تک مسلمان مصلحتاً گائے کی قربانی ترک کر دیں اور گائے کا گوشت بھی نہ کھائیں تو بہ یقینی خطرہ ہے کہ آگے چل کر اپنی ہمسایہ قوموں کے گاؤ پرستانہ عقائد سے وہ متاثر ہو جائیں گے اور گائے کے تقدس کا اثر ان کے قلوب میں اسی طرح بیٹھ جائے گا جس طرح مصر کی گاؤ پرست آبادی میں رہتے رہتے بنی اسرائیل کا حال ہوا تھا کہ "اُشربوا فی قلوبھم العجل"۔ پھر اس ماحول میں جو ہندو اسلام قبول کریں گے وہ چاہے اسلام کے اور دوسرے عقائد قبول کر لیں، لیکن گائے کی تقدیس ان کے اندر بدستور موجود رہے گی۔ اسی لیے میں ہندوستان میں گائے کی قربانی کو واجب سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی میرے نزدیک کسی نومسلم ہندو کا اسلام اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک وہ کم از کم ایک مرتبہ گائے کا گوشت نہ کھا لے۔ اسی کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جس میں حضور نے فرمایا کہ "جس نے نماز پڑھی جیسی ہم پڑھتے ہیں اور جس نے اسی قبلہ کو اختیار کیا جو ہمارا ہے اور جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا وہ ہم میں سے ہے"۔ یہ "ہمارا ذبیحہ کھایا" دوسرے الفاظ میں یہ معنی رکھتا ہے کہ مسلمانوں میں شامل ہونے کے لیے ان اوہام و قیود اور بندشوں کا توڑنا بھی ضروری ہے جن کا جاہلیت کی حالت میں کوئی شخص پابند رہا ہو۔

غیر محرم قریبی اعزہ سے پردہ کی صورت

سوال :۔ کیا شوہر بیوی کو کسی ایسے رشتہ دار یا عزیز کے سامنے بے پردہ آنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے جو شرعاً بیوی کے لیے غیر محرم ہو؟ نیز یہ بھی واضح فرمایئے کہ سسرال یا میکے کے ایسے غیر محرم قریبی رشتہ دار جن سے ہندوستانی نظام معاشرت کے تحت عموماً عورتوں میں پردہ کرنے کا رواج نہیں، ان سے پردہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور اگر کرنا چاہیے تو کن حدود کے ساتھ؟

جواب :۔ شوہر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا کے احکام کی خلاف ورزی پر بیوی کو مجبور کرے اور اگر وہ ایسا کرے تو مسلمان عورت کا فرض ہے کہ ایسے مطالبات پورے کرنے سے انکار کر دے۔

سسرال اور میکے میں عورتوں کا عموماً جن غیر محرم مگر قریبی رشتہ داروں کے ساتھ رہن سہن ہوتا ہے ان سے پردے کی نوعیت وہ نہیں ہے جو بالکل غیر مردوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ عورتیں ان کے سامنے بغیر زینت کے، سادہ لباس میں پورے ستر کے ساتھ آسکتی ہیں، مگر صرف اس حد تک ان کے سامنے رہنا چاہیے جس حد تک معاشرتی ضروریات کے لحاظ سے بالکل ناگزیر ہو۔ خلا ملا اور بے تکلفی اور ایک مجلس میں بیٹھ کر ہنسی مذاق اور تنہائی میں بیٹھنا اس قسم کے رشتہ داروں کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

اس معاملہ میں فی الواقع ہماری معاشرت میں بڑی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ گرچہ شریعت کا جو حکم ہے، میں نے بتا دیا ہے لیکن مسلمانوں میں رواج سے جو غیر شرعی حالات پیدا ہو گئے ہیں، ان کو دور کرنے کے لیے بڑی جرأت اور عزم کی ضرورت ہے۔ ایک طرف مسلمان غیروں سے اتنے پردے کا اہتمام کرتے ہیں جو کہیں کہیں خود شریعت کے مطالبات سے بڑھ جاتا ہے اور دوسری طرف رشتہ داروں کے معاملہ میں انھوں نے تمام حدود شرعیہ کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس معاملہ میں شاید ہم کو کسی وقت ایسا سخت طرز عمل اختیار کرنا پڑے گا جس سے بعید نہیں کہ ہمارے خاندانی تعلقات میں بہت سی تلخیاں پیدا ہو جائیں)۔

تزکیۂ نفس کی حقیقت

سوال:- یہاں کی مقامی فضا تصوف کے چرچے سے معمور ہے۔ اس وجہ سے اکثر طرح طرح کے پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت دو باتیں دریافت طلب ہیں:-

(ا) تزکیۂ نفس کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اس بارہ میں رسول اللہ کی تعلیم کیا تھی؟ متصوفین کا اس سلسلہ میں صحیح عمل کیا رہا ہے؟ نیز ایک مسلمان کو اپنی زندگی کے اس شعبہ میں کیا صورت اختیار کرنی چاہیے؟

(ب) کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی آج کل کے صوفیا کی طرح تزکیۂ نفس کیا کرتے تھے اور عالم بالا کے مشاہدات ہوتے رہتے تھے؟

جواب:- سوال کے پہلے جزو کے جواب میں یہ ذہن نشین کر لیجیے کہ عربی زبان میں تزکیہ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک پاک صاف کرنا۔ دوسرے بڑھانا اور نشو و نما دینا۔ اس لفظ کو قرآن مجید میں بھی انہی دونوں معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ پس تزکیہ کا عمل دو اجزا سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ نفس انسانی کو انفرادی طور پر اور سوسائٹی کو اجتماعی طور پر ناپسندیدہ صفات اور بری رسوم و عادات سے پاک صاف کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ پسندیدہ صفات کے ذریعے اس کو نشو و نما دیا جائے۔

اگر آپ قرآن مجید کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں اور حدیث میں صرف مشکوٰۃ ہی پر اس خیال سے نظر ڈالیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہ کونسی ناپسندیدہ صفات ہیں جن کو اللہ اور اس کا رسول دور کرنا چاہتے ہیں اور وہ کونسی پسندیدہ صفات ہیں جن کو وہ افراد اور سوسائٹی میں ترقی دینا چاہتے ہیں۔ نیز قرآن و حدیث کے مطالعہ ہی سے آپ کو ان تدابیر کی بھی پوری تفصیل معلوم ہو جائے گی جو اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں اور اس کے رسول نے استعمال

ہیں ترجمان القرآن میں اس مسئلہ پر بہت تفصیل سے لکھ رہا ہوں۔ کچھ حصہ لکھ چکا ہوں اور کچھ حصہ آئندہ لکھنے والا ہوں۔ آپ اس سلسلہ کو بغور مطالعہ کریں تو آپ کو سوال کا پورا جواب مل جائے گا۔ یہاں اشارۃً یہی بتا سکتا ہوں کہ اہل تصوف میں ایک مدت سے تزکیۂ نفس کا جو مفہوم رائج ہو گیا ہے اور اس کے جو طریقے ان میں چل پڑے ہیں وہ قرآن و سنت کی تعلیم سے بہت ہٹے ہوئے ہیں۔

دوسرے جزو کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام نے تو عالم بالا کے معاملہ میں صرف رسول کے اعتماد پر غیب کی ساری حقیقتوں کو مان لیا تھا اس لیے مشاہدے کی نہ ان کو طلب تھی اور نہ اس کے لیے انھوں نے کوئی سعی کی۔ وہ بجائے اس کے کہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرتے، اپنی ساری قوتیں اس جد و جہد میں صرف کرتے تھے کہ پہلے اپنے آپ کو اور پھر ساری دنیا کو خدائے واحد کا مطیع بنائیں۔

فہرست کتب مکتبہ جماعت اسلامی

تفہیمات	۸؍ ۱ روپیہ	اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر	عہ	سلامتی کا راستہ	۶؍	اسلام اور جاہلیت	۶؍
خطبات قسم اول	۸؍ ۱ روپیہ	تجدید و احیائے دین	عہ	اسلام کا نظریہ سیاسی	۶؍	نشان راہ	۶؍
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	عہ ۱ روپیہ	پردہ غیر مجلد	۸؍ ۱ روپیہ	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۶؍	جہاد فی سبیل اللہ	۶؍
″ ″ حصہ دوم	۸؍ ۱ روپیہ	″ مجلد	۸؍ ۲ روپیہ			نیا نظام تعلیم	۴؍
″ ″ حصہ سوم	۱۲؍ ۱ روپیہ	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	۹؍	انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۶؍	دستور جماعت اسلامی	۲؍
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	عہ	″ حصہ سوم	عہ			ایک نہایت ہی اہم استفتا	۲؍
حقیقت توحید	۲ روپیہ	دینیات (انگریزی مجلد)	۳ روپیہ	اسلام کیا ہے (انگریزی)	۲ روپیہ	نیشنلزم اینڈ انڈیا (انگریزی)	۹؍

دیگر اداروں کی کتابیں

جو

مکتبہ جماعت اسلامی، دار الاسلام میں موجود ہیں

عبادت	۲؍	اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۹؍	اسلام کا سیاسی نظام اور فلاح عالم	۸؍	تفسیر سورہ قیامہ	۸؍
خدا کی اطاعت کس لیے	۲؍	ایمان کی کسوٹی	۲؍	علما اور اسلام	۱۲؍	″ سورہ لہب	۶؍
مسلمان کا بنیادی عقیدہ (بڑا چارٹ)	۲؍	کلمہ طیبہ کے معنی	۲؍	مسلمان کی پہچان	۵؍	″ سورہ مرسلات	۵؍
″ ″ (چھوٹا)	۱؍	حقیقت شرک	۸؍ ۲ روپیہ	نظام اطاعت کی تین کڑیاں	۴؍	″ سورہ والتین	۶؍
خطبہ تقسیم اسناد	۲؍	اسلام اور اشتراکیت	عہ	مولانا سندھی کے افکار پر ایک نظر	۱۲؍ ۱ روپیہ	″ سورہ شمس	۶؍
راہ عمل	۶؍	اسلامی نظام	عہ	ذہنی زلزلے	۸؍ ۱ روپیہ	″ سورہ عبس	۶؍
				اقسام القرآن	۸؍		

مطبوعات

براہین وحی مرتبہ محمد اقبال سلیمانی صاحب، ۲۰۰ صفحات، چھوٹا سائز، قیمت مجلد ۲/۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ امت مسلمہ (ہند) امرتسر۔

یہ کتاب چند مختلف اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے جو نیاز صاحب فتحپوری مدیر "نگار" کے جواب میں لکھے گئے ہیں، نیاز صاحب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول اور ایک کبھی نہ جھوٹ بولنے والا بلند اخلاق انسان سمجھنے کے باوجود قرآن کو کلام الٰہی نہیں تسلیم کرتے اور اس کو رسول اللہ صلعم کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ نیاز صاحب جیسے "روشن خیال" اور "عقلیت پرست" انسان کے منہ سے۔ جو اپنی فکری ترکتازیوں کے سامنے خدا کی خداوندی سے بھی مرعوب نہیں ہوتا، اتنی مہمل اور غیر معقول بات کا نکلنا انتہائی حیرت کا موجب ہے۔ آپ رسول کو رسول اور بلند اخلاق اور صادق و مصدوق بھی قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی اس امر کا بھی یقین رکھتے ہیں کہ قرآن کلام خداوندی نہیں بلکہ رسول کے اپنے ذہن و دماغ کا نتیجہ ہے، حالانکہ قرآن میں جو چیز سب سے زیادہ واضح ہے وہ یہی ہے کہ رسول جو کچھ بھی قرآن کے نام سے لوگوں تک پہنچاتا ہے وہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام اور اسی کا اتارا ہوا کلام ہے۔ تو گویا آپ نعوذ باللہ زندگی بھر خدا پر افترا کرتے رہے اور ہر روز یہ جھوٹ بول کر لوگوں کو فریب دیتے رہے کہ یہ سب فرمودۂ خدا ہے، درانحالیکہ وہ سب اپنے ذہن و دماغ کا نتیجہ ہوتا تھا؟ کیا ایک بلند اخلاق اور سچے انسان کا یہی کیرکٹر ہوتا ہے؟

یہ عجیب "عقلیت" اور "روشن خیالی" ہے کہ ایک چیز کی صداقت پر آپ کا دل بھی نہیں ٹھکتا لیکن اس کے باوجود اس سے چمٹے رہنا آپ ضروری سمجھتے ہیں۔ موجودہ مادی تہذیب کی پیدا کی ہوئی ذہنی انارکی میں اگر کوئی شے قابل ستائش تھی تو صرف یہ کہ انسان اسی بات کو اپنائے جس پر اس کا ضمیر مطمئن ہو اور ان چیزوں کو علانیہ رد کر دے جن پر اس کو اطمینان نہ ہو۔ مگر اس تہذیب کے ہندوستانی پیروؤں کا باطن اس ایک جوہر سے بھی محروم ہے۔ اسلام کے مسلمہ اصولوں پر انہیں یقین نہیں مگر اس کے باوجود کچھ سیاسی، معاشرتی اور معاشی اغراض ہیں، جن کی خاطر وہ اپنی پیشانیوں پر اسلام کا لیبل چپکائے رہنے پر مجبور ہیں، اور ان میں اتنی جرأت نہیں کہ اسلام سے اپنے انقطاع کا اعلان کر دیں۔

اس کتاب کے شروع میں خود نیاز صاحب کے اقوال و دلائل بھی درج ہیں، ان کو پڑھ کر کوئی صاحب علم نیاز صاحب کی علمیت پر ماتم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو شخص "مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ" میں "هوىٰ" کا ترجمہ ہوائی باتیں کرے، "بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا" میں "بِأَنَّ" کے معنی "جیسے" بتائے۔ "فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ" کا ترجمہ "ایک تختی میں محفوظ ہے" کرے، اس کو قرآن حکیم کے اعجازی کلام پر رائے زنی کرنے کا کیا حق ہے؟ منافقین کے جس استدلال بالقرآن سے رسول نے امت کے لیے پناہ مانگی تھی، نیاز صاحب نے اس کی یہ ایک نمایاں اور تازہ مثال پیش کی ہے۔

اگرچہ ان مضامین میں ان کی ہفوات کا مکمل جواب موجود ہے مگر پھر بھی ضرورت ہے کہ اس کتاب کو نقلی اور عقلی دونوں

اعتبار سے اور زیادہ مدلل کرکے ان حلقوں میں پہنچانے کی سعی کی جائے جو نیاز صاحب کی خاص صیدگاہ ہیں، یعنی کالجوں میں اور نئے تعلیم یافتہ مگر دین کی فہم سے محروم حلقوں میں۔

مولانا سید سلیمان صاحب کا مقالہ اپنے دائرہ بحث کے لحاظ سے باعتبار نقل مفصل اور جامع ہے مگر ہم کو ان کی اس بات سے اتفاق نہیں کہ "اِنَّ الشَّيَاطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ میں "ایحاء" کا لفظ بطور طنز کے آیا ہے۔ [illegible] نہیں ہے بلکہ لفظ اپنے معنی کے بعض پہلوؤں سے مجرد کرکے خفیہ مشورہ [illegible] کے معنی میں بولا گیا ہے۔ ڈاکٹر ناثر صاحب کا مضمون باوجود مختصر ہونے کے بہت پرمغز اور مفید ہے، مگر انھوں نے آخر میں "نئی روشنی کے علمبرداروں" کو جو مشورہ دیا ہے وہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ یورپین مصنفین کے افکار اور "مذہبی تعلیمات" دونوں کو یکساں تنقید کا مستحق قرار دینا سخت ناانصافی ہے اور اس کے مشورے دینے کا مطلب یہ ہے کہ دین میں ایسا رخنہ پیدا کرنے کا سامان بہم پہنچایا جائے جس سے آئے دن نئے نئے نیاز نکلتے رہیں۔ دین کی تعلیم پر جرح و تعدیل اور بحث و تنقید ضرور کی جاسکتی ہے مگر اس کا مقام دائرۂ اسلام سے باہر ہے، اندر نہیں۔ اسلام کے اندر آنے کا مطلب تو یہ ہے کہ آدمی نے رسول کی تعلیمات کو بالکل برحق اور تنقید سے یکسر ماورا تسلیم کرلیا ہے۔ اب اگر وہ ان میں غور و فکر کرے گا تو صرف مزید اطمینان قلب اور شرح صدر کے لیے، نہ کہ ان کی صحت اور سقم معلوم کرنے کے لیے۔ جس کسی کو ان کی صحت جانچنی ہو وہ اسلام کے دائرے سے باہر رہ کر اچھی طرح جانچ لے، پھر اگر اس کو ان کی صحت اور صداقت کا اطمینان ہو جائے تو اندر آئے۔ ورنہ باہر کا باہر ہی رہے۔

کتاب کے آخر میں ایک مضمون "مدیر البیان" کا بھی ہے جس میں حسب توقع لیکن بلاضرورت احادیث پر [illegible] کی گئی ہے۔ احادیث کے بارے میں جماعت "امت مسلمہ" اور مدیر البیان کے خیالات کسی تعارف کے محتاج نہیں اور نہ ہی ترجمان کا مسلک اور اس کے دلائل کسی پر مخفی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ مضمون اس کتاب میں شامل نہ ہوتا یا وہ حصہ اس میں سے حذف کر دیا جاتا جس میں روایات پر رد و قدح کی گئی ہے، تو اچھا ہوتا۔ اس طرح کتاب کی افادیت، بے آمیز اور اس کی اشاعت، وسیع تر ہوتی۔

علما اور اسلام | تصنیف مولوی مظہرالدین صاحب صدیقی بی۔ اے، ۸۲ صفحات۔ قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت نشأۃ ثانیہ۔ جدید ملے پلی۔ حیدرآباد، دکن۔

یہ مختصر رسالہ اس سے پہلے "علمائے کرام کا مستقبل" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے، جس کو اب نئی ترتیب اور ترمیم و اضافہ کے بعد دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مولف کے طرز نگارش اور ان کی اسلامی فہم و بصیرت سے ناظرین ترجمان القرآن ناواقف نہیں ہیں۔ موصوف نے اس رسالہ میں اختصار کے ساتھ یہ بتلایا ہے کہ علمائے اسلام کا حقیقی منصب کیا ہے اور ایک ایسے دین کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے، جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے، ان کا مقام کتنا بلند، ان کی ذمہ داریاں کتنی گراں اور ان کے فرائض کتنے متنوع ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں اور اسلام کی تاریخ کے مختلف ادوار پر ایک اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ علما کس طرح بتدریج اپنے اس مقام سے علیحدہ اور اپنی ذمہ داریوں

سے غافل ہوتے گئے، یہاں تک کہ آج ان کا قدم اپنی منزل اور شاہراہ منزل سے بالکل ناآشنا ہو کے رہ گیا ہے۔ حالانکہ نہ صرف اپنا فرض منصبی ہونے کی وجہ سے ان کو دین کی اقامت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے بلکہ اس لیے بھی کہ اس دین — یعنی اس نظام زندگی کے سوا اور کوئی دوسرا نظام، پریشانیوں کی ماری ہوئی دنیا اور مظلوم انسانیت کے درد کا درماں نہیں ہو سکتا۔

امید ہے کہ عام خواندہ حضرات اور علمائے دین، سب کے لیے یہ چھوٹی سی کتاب مفید ثابت ہوگی۔ (م - ا)

اسلام اور سود | از جناب ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی، ایم۔ اے۔ صدر شعبہ معاشیات، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن۔
شائع کردہ:۔ ادارۂ معاشیات، فاطمہ منزل، حمایت نگر، حیدرآباد، دکن۔ صفحات ۱۰۴ قیمت مجلد تین روپے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھیں جو جدید مغربی علوم کے اولین مشاہدہ سے خیرہ ہو گئی تھیں۔ کہیں کہیں اب اپنی اصل فطری حالت کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ چنانچہ زیر نظر کتاب "اسلام اور سود" میں مرعوب ذہنیت کے آثار نہیں پائے جاتے یعنی ڈاکٹر قریشی صاحب نے سود کی لعنت کو اسلام کے اصول و ضوابط کی کھینچ تان کرکے "کارِ خیر" ثابت کرنے کے بجائے خود معاشیات مغرب کی روشنی میں انسانیت کے لیے وجہ فساد ثابت کیا ہے۔ جناب مؤلف چونکہ معاشیاتِ دورِ حاضر کے مختلف مدارس فکر سے اچھی طرح روشناس ہیں اس وجہ سے وہ اپنے مقالہ کو نباہنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ادھر "اسلامیات" سے بھی قابل قدر حد تک واقفیت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اور کتاب کا دوسرا باب اس کی شہادت دیتا ہے، مگر درحقیقت موضوع جس محققانہ و مجتہدانہ دینی بصیرت کا متقاضی تھا، وہ اگر استعمال میں آئی ہوتی تو اس موضوع سے تعلق رکھنے والے مشہور سوالا زیادہ اطمینان بخش استدلال کے ساتھ حل ہو سکتے۔ مگر پھر بھی ہمارے نزدیک اس کتاب کی بہت قدر و قیمت ہے، اس وجہ سے کہ اس نے اسلامی معاشیات کے دائرہ میں "علمی تجدید" کا راستہ کھول کر ارباب تجدد کو بتا دیا ہے کہ مسلمانوں کی پیشقدمی کس سمت میں ہونی چاہیے۔ علاوہ بریں معاشی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس کے مطالعہ سے مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں

مجموعہ مقالات علمیہ | مرتبہ و شائع کردہ:۔ مجلس ادارت، حیدرآباد اکاڈمی، حیدرآباد، دکن۔ قیمت درج نہیں۔

حیدرآباد اکاڈمی کی طرف سے علمی مقالات کے چند مجموعے پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت ساتواں مجموعہ ہمارے سامنے ہے جس میں پانچ مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں کوئی ایسا نہیں جو معلومات افزا نہ ہو، مگر کھری بات کہہ دینی ضروری ہے کہ لکھنے والوں کے خیالات کے گھوڑے کسی خاص مقصدی نقطۂ نظر کے کھونٹے سے بندھے ہوئے نہیں ہیں، اس لیے ہر طرف منہ مار لیتے ہیں۔ مثلاً مجموعہ کے سب سے اہم مضمون "حقائق حیات انسانی" کو ہم نے کچھ زیادہ توجہ سے پڑھا اور اس میں یہ دیکھا کہ کہیں تو اس میں "مادیت" نمودار ہو جاتی ہے اور کسی موقع پر "اسلام" کی خفیف سی جھلک ظاہر ہو جاتی ہے اور کہیں دونوں خلط ملط نظر آتے ہیں۔ دیانتدار اہل قلم کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنے متعلق خوب سوچ کر یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ مسلمان ہیں یا کچھ اور۔ پھر اگر وہ اپنی نظر میں مسلمان ثابت ہوں اور مسلمان ہی رہنا چاہیں تو براہ کرم اپنے "قلم" کو بھی مسلمان بنائیں!

ناصر جنگ شہید | از جناب رہبر صاحب فاروقی، صفحات ۱۸۷، قیمت ۲؎ ملنے کا پتہ:۔ بیرون یاقوت پورہ، املی بن، مکان ۱۳۵۱/۵، حیدر آباد، دکن۔

یہ کتاب نظام الملک آصف جاہ بانی سلطنت آصفیہ کے جانشین نواب میر احمد خاں نظام الدولہ کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ واضح رہے کہ دکن کی سیاسی تاریخ کو جو اہمیت تاریخ ہند میں حاصل ہے، کچھ ویسی ہی اہمیت تاریخ دکن میں ناصر جنگ کے دور کی ہے، لیکن اس دور کے بہت مجمل حالات تاریخوں میں ملتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ اب جناب رہبر فاروقی نے مطالعہ و تحقیق کے بعد اس دور کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات یقیناً مؤلف کی کاوش کی داد دیں گے۔

آثار اقبال | مرتبہ جناب غلام دستگیر صاحب رشید، ایم۔ اے، عثمانیہ۔ شائع کردہ:۔ ادارۂ اشاعت اردو، حیدر آباد، دکن

قیمت:۔ مجلد تین روپے ۱۲ آنے

علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے کلام کو مختلف اہل قلم مختلف پہلوؤں سے نمایاں کرنے میں مصروف ہیں اور آئے دن اس سلسلہ میں تشریحی اور تنقیدی مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اخبارات اور رسائل کے فائلوں سے ایسے ہی کچھ دلچسپ اور معلومات افزا مقالات کو اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے۔ ان مقالات کے لکھنے والوں میں نواب محمد بہادر خاں مرحوم، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر خواجہ عبدالحمید، مولانا اسلم جیراجپوری، ڈاکٹر میر ولی الدین، مولانا محمد علی مرحوم، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا نذیر الحق میرٹھی اور دوسرے ممتاز اصحاب شامل ہیں۔

جن لوگوں کو اقبال مرحوم سے دلچسپی ہے، ان کے لیے یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔

تعارف قرآنی | از جناب ایم عبد الرحمٰن خاں صاحب، چیلیک، ملتان شہر۔

ناشر:۔ ایم ثناء اللہ خاں پبلشرز اینڈ بک سیلرز، ۲۶، ریلوے روڈ، لاہور، قیمت مجلد ۸؎

یہ کتاب اگرچہ کوئی اونچے درجہ کی محققانہ تالیف نہیں ہے، لیکن بہرحال چونکہ اس کا موضوع قرآن ہے اور قرآن کی بعض بصیرت افروز آیات کو اس میں ایک خاص نظم سے مرتب کر کے پیش کیا گیا ہے، اس وجہ سے کون مسلمان ہوگا جو اس کی پسندیدگی کا اظہار نہ کرے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، یہ کتاب خود قرآن کی آیات کے حوالہ سے قرآن کی مختلف حیثیتوں کو متعین کر کے پیش کرتی ہے۔ مثلاً اس کے چند عنوان ملاحظہ ہوں:۔ قرآن نے اپنے لیے کونسے نام استعمال کیے؟ قرآن کب اور کس طرح اتارا گیا؟ قرآن کس زبان میں نازل ہوا؟ کیا قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے؟ قرآن کے منکر کون ہیں؟ وغیرہ۔ ایسے استفہامی عنوانوں کے ماتحت توضیحی آیتیں مع ترجمہ مرتب کی گئی ہیں۔ کتاب عام خواندہ طبقہ کے لیے مناسب ہے۔ (ن ص)

اعلان

رسالہ ترجمان القرآن کے مندرجہ ذیل رسائل ہمارے دفتر میں موجود ہیں۔ جن اصحاب کو ضرورت ہو منگوا سکتے ہیں۔ قیمت فی پرچہ ۸؎

۱۳۵۲ھ: صفر، جمادی الآخر، رجب، شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ۔ ۱۳۵۳ھ صفر، رجب، شعبان، رمضان۔ ۱۳۵۴ھ: شعبان، ۱۳۵۵ھ: ربیع الثانی، ۱۳۵۶ھ شوال، ۱۳۵۷ھ شوال۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ۔ ۱۳۵۸ھ رمضان، شوال۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ۔ ۱۳۵۹ھ جمادی الاول، جمادی الآخر، رجب، شعبان، رمضان، ۱۳۶۰ھ ذی القعدہ، ذی الحجہ

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اس وقت تک ملک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:-

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کیجا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، اُن کا جواب کیا ہے؟ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں:-

قیمت حصہ اول ۱-۲-۰۰ حصہ دوم ۲-۸-۰۰ حصہ سوم ۱-۱۲-۰۰

علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ :- مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام جمالپور - پٹھانکوٹ (پنجاب)۔

Registered No. L. 118

جلد ۲۷
عدد ۵

[illegible] ۱۳۶۴

۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

دارالاسلام جمال پور - پٹھانکوٹ

قیمت سالانہ پانچ روپے　　قیمت فی پرچہ ایک

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اُن مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جنکے متعلق آجکل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، جبایت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسُول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔ حصۂ دوم زیرِ طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد (۳؍۸) علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۳۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

فہرست مضامین

عدد ۵، ۶	ذی القعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ مطابق نومبر و دسمبر ۱۹۴۵ء	جلد ۲۷

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس، چمبرلین روڈ، لاہور میں چھپوا کر دار الاسلام متصل پٹھان کوٹ
سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ایک مدت سے ان صفحات میں مرکز کے حالات اور کاموں کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ حالانکہ جماعت کے ارکان اور ہمدردوں کو یہاں کے حالات کے لیے برابر انتظار بھی رہتا ہے اور ہم ان کو یہاں کے کاموں کی رفتار اور دوسری ضروری باتوں سے باخبر رکھنا ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ اس کوتاہی کی وجہ یہ ہے کہ ہماری خواہش تھی کہ سالانہ اجتماع کے موقع پر، اس سال کے لیے جو باتیں طے ہوئی تھیں، ان کے بروئے کار آنے کی کوئی شکل پیدا ہو تو ارکان اور ہمدردوں کو ان سے مطلع کریں، صرف موانع اور عذرات کا ذکر کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ سالانہ اجتماع پر کئی مہینے گزر گئے اور اب تک ہم ان مشکلات پر قابو نہ پا سکے جو ہمارے سامنے تھیں اور نہ بظاہر حالات اس بات کی توقع ہے کہ ہم جلد ان پر قابو پا سکیں گے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ لوگوں کو صحیح صورت حالات سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ انھیں اس بات کا علم رہے کہ تجاویز کے عمل میں آنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے نہ وہ بلا سبب ہے اور نہ ہماری غفلت کی وجہ سے ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ایک عرصہ سے امیر جماعت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی طبیعت برابر خراب چلی جا رہی ہے۔ سالانہ اجتماع سے پہلے ان پر بیماری کے متعدد حملے ہو چکے تھے اور وہ اس قابل نہ تھے کہ اجتماع کی کارروائیوں کی نگرانی کر سکتے لیکن اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی اس وجہ سے انھیں مجبوراً اس سلسلہ کے سارے فرائض انجام دینے پڑے، جس کا اثر ان کی صحت پر نہایت خراب پڑا۔ اجتماع سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے چاہا کہ ان کو کچھ آرام کرنے کا موقع ملے لیکن حالات ایسے تھے کہ یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اب تک صورت حالات یہ رہی ہے کہ جماعت کے سارے شعبے تنہا ان کی ذات سے وابستہ رہے ہیں۔ وہی جماعت کے امیر تھے، وہی ترجمان القرآن کے ایڈیٹر تھے، وہی تنظیم جماعت کے سلسلہ کے امور کی نگرانی کرتے تھے، وہی استفسارات کے جواب لکھتے تھے۔ اور وہی سارا حساب کتاب رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف کا مشغلہ اور درس کا سلسلہ مزید براں۔ اس وجہ سے اس بات کا موقع بالکل نہیں تھا کہ وہ مرکز سے کچھ دنوں کے لیے غیر حاضر ہو کر اپنی صحت کی فکر کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گرمیوں میں ان کی صحت اس قدر گر گئی کہ وہ کام کرنے کے بالکل قابل نہیں رہے اور مجبور ہوئے کہ یہاں کی ذمہ داریوں کو دوسروں پر چھوڑ کر اپنے علاج کی فکر کریں۔ اس غرض کے لیے وہ دلی گئے۔ دلی میں گرمیوں کا موسم نہایت سخت ہوتا ہے لیکن یونانی علاج جو نسبتہً ان کے مزاج کے موافق ہے، وہیں اچھا ہو سکتا تھا، اس وجہ سے کچھ دنوں وہاں قیام کیا۔ اس قیام سے انھیں تھوڑا بہت

فائدہ تو ضرور ہوا لیکن کچھ تو وہاں کے موسم کی خرابی اور کچھ مرکز کی ضروریات نے مجبور کیا اور وہ برسات کے شروع میں واپس آگئے۔ یہاں اس بات کی کوشش کی گئی کہ ان پر زیادہ ذمہ داریوں کا بوجھ نہ پڑنے پائے لیکن یہاں رہ کر پوری یکسوئی ممکن نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پھر بیمار پڑ گئے۔ اس بیماری سے اٹھنے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ آرام کرنے کی مہلت پاتے یکم اکتوبر سے باقاعدہ پھر کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ابھی ایک مہینہ بھی پوری پابندی سے کام نہیں کرنے پائے تھے کہ پھر صحت گرتی ہوئی نظر آئی۔ امرت سر جا کر اکسرے سے معائنہ کرایا تو معلوم ہوا کہ بائیں گردے میں پتھری ہے اور یہ سارے فسادات اسی کے کرشمے ہیں۔ اب یونانی طریقہ پر اس کا علاج ہو رہا ہے اور خدائے علیم و خبیر ہی بہتر جانتا ہے کہ پردۂ غیب میں کیا ہے اور آئندہ اس کے علاج کے سلسلہ میں کیا صورت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ مرض دور ہو اور خدمت دین کا جو کام سامنے ہے اس کے کرنے کے لیے ہمت اور قوت عطا ہو۔

ان صفحات میں شخصی حالات کا کبھی ذکر نہیں آتا لیکن مولانا کی اس بیماری کا ذکر مجبوراً اس وجہ سے کرنا پڑا کہ بہت سے لوگوں کو ترجمان القرآن کی تاخیر اشاعت سے شکایت ہے۔ بعض لوگوں کو تفہیم القرآن کا سلسلہ برابر جاری نہ رہنے پر رنج ہے، بعض لوگ استفسارات کے جواب جلد نہ ملنے سے آزردہ ہو رہے ہیں، بہت سے لوگ تعلیمی اسکیم کے اب تک جاری نہ ہونے سے مایوس ہو رہے ہیں۔ ان سب حضرات کو معلوم ہو جائے کہ ادھر ایک عرصہ سے کاموں کے تسلسل اور ان کی باضابطگی میں جو خلل پیدا ہو تا رہا ہے اس میں جہاں وقت کے دوسرے حالات کو دخل رہا ہے وہاں امیر جماعت اور مدیر ترجمان القرآن کی علالت کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اور یہ ایسی چیز ہے جس پر بندوں کو کوئی اختیار نہیں۔ البتہ اس اثنا میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ یہاں کے مختلف شعبوں کی ذمہ داریاں، جو تنہا امیر جماعت پر تھیں، تقسیم کر دی جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بہت حد تک اس میں کامیابی ہوئی ہے اور جو کسر اب باقی رہ گئی ہے امید ہے کہ وہ بھی بہت جلد پوری ہو جائے گی۔ اب یہاں کے وہ تمام شعبے، جن سے جماعت کے ارکان اور ہمدردوں کو واسطہ پڑتا ہے، مختلف ذمہ دار اور قابل اطمینان ہاتھوں میں ہیں توقع ہے کہ بہت جلد لوگوں کی شکایات دور ہو جائیں گی۔ ترجمان القرآن کو بھی وقت پر لانے کی پوری کوشش جاری ہے۔ اب اس کے لیے ایسا انتظام کر دیا گیا ہے کہ ان شاء اللہ پابندی کے ساتھ ماہ بماہ خریداروں تک پہنچ جایا کرے گا۔ البتہ جب تک مدیر ترجمان القرآن بیمار ہیں اس وقت تک لوگوں کو خود ان کے مضامین کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ فی الحال اگر وہ تفہیم القرآن کا سلسلہ جاری رکھ سکیں تو یہی غنیمت ہے۔

تعلیمی اسکیم کے سلسلہ میں، سالانہ اجتماع کے موقع پر، یہ بات طے ہوئی تھی کہ فی الحال ثانوی تعلیم کے عارضی نظام کا آغاز کیا جائے۔ یہ فیصلہ تعمیر کی موجودہ مشکلات اور اسٹاف کی زحمتوں کو سامنے رکھ کر کیا گیا تھا۔ خیال تھا کہ بروقت ایک مختصر اسٹاف اور طلبہ کی ایک محدود تعداد کے قیام و تعلیم کے لیے چند چھپر اور مکانات بنا لینے میں کچھ زیادہ زحمت نہ ہوگی اور اس مختصر نظام کے لیے جماعت کے اندر رہتے آدمی بھی آسانی کے ساتھ مل جائیں گے جو کام کا آغاز کر سکیں گے، پھر آہستہ آہستہ انہی کی مدد سے ابتدائی تعلیم کے لیے کارکن بھی تیار ہو جائیں گے، نصاب کی تیاری میں بھی سہولت ہوگی، اور آگے کے کاموں یعنی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی راہیں کھلیں گی۔ لیکن ہمارے یہ سارے تخمینے غلط نکلے۔ یہ اندازہ لگاتے وقت ہم سب سے زیادہ پر امید اس وجہ سے تھے کہ جنگ ختم ہو رہی تھی۔ جنگ تو بلاشبہ

ختم ہوگئی لیکن اس کی پیدا کی ہوئی زحمتوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ سارا سامان تعمیر اولاً تو گراں بہت زیادہ ہے ثانیاً اس کے حاصل کرنے میں ایسی قانونی رکاوٹیں ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا صرف انہی لوگوں کے بس کا کام ہے جن کو نہ روپے کی پروا ہو نہ ایمان و ضمیر کی۔ ہم ان دونوں چیزوں میں سے کسی چیز کی بھی فیاضی کے ساتھ قربانی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس وجہ سے ہمارے سامنے وہ ساری مشکلیں اکٹھی ہوگئی ہیں جو ایک بگڑی ہوئی دنیا میں ان لوگوں کو پیش آیا کرتی ہیں جو اپنے اصولوں کی قربانی کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

محض تعلیمی اسکیم جاری کرنے کے خیال سے ہم نے تعمیرات کا ایک مستقل شعبہ عرصہ ہوا قائم کر دیا ہے اور ایک ذمہ دار کارکن کو دوسری مصروفیتوں سے الگ کر کے، صرف اسی کام کے لیے خاص کر دیا ہے۔ ضرورت کی اہمیت کی وجہ سے سامان تعمیر اور لیبر (مزدور) کی غیر معمولی گرانی کا مسئلہ بھی ہم نے نظر انداز کر دیا تھا۔ صرف ایک خیال سامنے تھا کہ جس طرح اور جس قیمت پر بھی ممکن ہو، جلد سے جلد کام شروع کر دینے کی کوئی شکل پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود افسوس ہے کہ تعمیر کا سلسلہ شروع ہو کر جاری نہ رہ سکا اور ہر اوقت جو سامان تعمیر مہیا ہوا اس سے بھی پورا فائدہ اٹھایا نہ جا سکا۔ یہاں ہم ایسے جنگل میں ہیں کہ آس پاس کوئی ایسی بستی بھی نہیں ہے جہاں کرایہ کے مکانات کا بندوبست کر کے کام کا کچھ سلسلہ جاری ہو سکے اور اگر یہاں سے کچھ دور ہٹ کر اس کا بندوبست کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک بڑی وقت یہ پیدا ہوگی کہ فوراً ہمیں درسگاہ کے لیے ایک مستقل اسٹاف کی ضرورت ہوگی۔ مرکز میں کام کرنے والے حضرات سے درسگاہ کے سلسلہ میں ہم کوئی مدد نہ حاصل کر سکیں گے۔ اور یہ ہم اسی وقت کر سکتے ہیں جب ہمارے پاس قابل اعتماد کارکن بھی کافی ہوں اور سرمایہ بھی بھرپور ہو۔ فی الحال نہ ہمارے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ ایک وسیع اسٹاف رکھ سکیں اور نہ اتنے آدمی ہی ہیں کہ ہر شعبہ کے لیے بقدر کفایت ان کی خدمات حاصل کر سکیں۔ ان حالات میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس وقت تک اس مجبورانہ تاخیر پر صبر کیا جائے جب تک کسی قابل اعتماد تعمیری تجربہ رکھنے والے شخص کی خدمات ہم کو حاصل نہ ہو جائیں اور سامان تعمیر کی فراہمی اور مزدوروں کے ملنے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور نہ ہوں۔

تعمیری مشکل کے علاوہ ایک بہت بڑی مشکل ہمارے سامنے قابل اعتماد اساتذہ کی بھی ہے۔ ہمارے پیش نظر اگر محض ایک درسگاہ قائم کر دینا ہوتا تو نہایت آسانی سے ہر فن کے پڑھانے والے آدمی بکثرت مل جاتے لیکن ہم اس نصب العین کی خدمت کے لیے درسگاہ قائم کرنا چاہتے ہیں جو جماعت اسلامی کے سامنے ہے۔ اس درسگاہ کے کام کے وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اپنے فکر و عمل میں، اپنے تحقیق و تنقید کے انداز میں، اپنے طریق زندگی اور مقصد زندگی میں سو فیصدی جماعت کے نصب العین کے مطابق ہوں اور علمی و عملی دونوں اعتبارات سے ایسا ذہن اور ایسی سیرت رکھتے ہوں کہ جن لوگوں کی تربیت ان کے سپرد کی جائے ان کو پوری طرح متاثر کر سکیں۔ اس طرح کے اصحاب علم ابھی جماعت میں بہت تھوڑے ہیں اور جو ہیں ان کو مطلوبہ معیار تک پہنچنے کے لیے ابھی خود بھی تربیت پر کافی وقت خرچ کرنا پڑے گا۔ جو اشخاص نئے علوم و افکار سے باخبر ہیں ان کے پاس مذہب کا صحیح علم اتنا نہیں ہے کہ وہ اپنے افکار و نظریات پر اس کی روشنی میں تنقید کر کے ان کے کھرے کھوٹے میں امتیاز کر سکیں اور جو حضرات

مذہب سے باخبر ہیں ان کو ابھی اس بات کا موقع نہیں ملا ہے کہ وہ نئے علوم و افکار کی روشنی میں اپنی معلومات کی قدر و قیمت کا اچھی طرح اندازہ کر سکے ہوں۔ ہم کو اس مشکل کا اندازہ پہلے سے تھا۔ ہم یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ ہمیں اپنے مقصد کے مطابق بنے بنائے آدمی باہر سے مل سکیں گے۔ چنانچہ ہم نے اس کے لیے یہ تدبیر سوچ رکھی تھی کہ جو حضرات تعلیمی اسکیم چلانے کے لیے منتخب کیے جائیں ان کو کام شروع کرنے سے پہلے ایک مدت اس مقصد کے لیے دی جائے کہ وہ مرکز میں باہمی مذاکرہ اور تبادلۂ خیالات سے عملی تعاون کی ایسی صورتیں پیدا کرلیں کہ ایک کی کمی دوسرے کی مدد سے پوری ہو سکے۔ لیکن اولاً تو ابھی تک ہم اپنے شرائط کے مطابق آدمی ہی پورے نہیں پا سکے اور جو حضرات مل بھی سکے ہیں ان کو ابھی مکانات نہ ہونے کی وجہ سے مرکز میں جمع نہیں کر سکے کہ وہ پیش نظر اسکیم کے لیے اپنی تیاریاں شروع کر سکتے۔

سرمایہ کی کمی بھی ہمارے سامنے ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر ہمارے پاس کافی سرمایہ ہوتا تو اس میں شبہہ نہیں کہ ہم کم از کم اس بات کی تو کوئی پروا نہ کرتے کہ چیزیں گراں ہیں۔ لیکن ابھی ہمارا حال یہ نہیں ہے کہ ہم کسی مقصد کے لیے، خواہ وہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، آزادی کے ساتھ روپیہ صرف کر سکیں۔ جماعت کا تھوڑا سا سرمایہ، جو ہمارے پاس امانت ہے، ہماری کوشش یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اور چونکہ جماعت کے باہر کے لوگوں سے مالی اعانت کی کوئی درخواست کرنا ہمارے اصول کے بالکل خلاف ہے اس وجہ سے ہم مجبور ہیں کہ جو قدم بھی اٹھائیں وہ جماعت کی مجموعی مالی حالت کو پیش نظر رکھ کر اٹھائیں۔ اس کی وجہ سے ہمارے کاموں میں جتنی دیر بھی ہو ہم اس کو گوارا کریں گے لیکن اس بات کو کبھی گوارا نہ کریں گے کہ جو لوگ ہمارے مقصد کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھتے ان کا سرمایہ ہماری سرپرستی کرے۔ ہمارے دل میں اس بات کی کوئی خواہش نہیں ہے کہ ہم جلد سے جلد لوگوں کو اپنا کوئی کارنامہ دکھا سکیں۔ ہماری کوشش صرف یہ ہے کہ جو کام بھی ہو اصول کے مطابق اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو۔ اسی طرح کا کام موجب خیر و برکت ہوگا۔ اگر تاخیر سے گھبرا کر ہم نے اپنے اصولوں میں ذرا بھی کمزوری دکھائی تو ایک درسگاہ تو ضرور قائم ہو جائے گی لیکن یہ درسگاہ تجدید انقلاب کی اس جد و جہد میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکے گی جس کے لیے ہم اٹھے ہیں بلکہ الٹے اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ درسگاہ ہمارے سارے کاموں اور سارے منصوبوں کو لے کر بیٹھ جائے گی۔ ہمارے ملک میں بعض درسگاہیں نہایت اہم اصلاحی اور انقلابی مقاصد کے لیے قائم ہوئیں لیکن چونکہ ان میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا گیا کہ جس طرح کے ارادے ان کی تعمیر میں شریک ہیں اسی طرح کے لوگوں کا مال ان کی کفالت کا بار اٹھائے اس وجہ سے بہت جلد ان کے مزاج میں فساد آگیا اور روپیہ دینے والوں کا بلند ہاتھ روپیہ مانگنے والوں کے پست ہاتھ پر اس طرح غالب آگیا کہ وہ سارے مقاصد خاک میں مل گئے جو ان درسگاہوں کے قیام سے پیش نظر تھے۔ ہم اس غلطی کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اس درسگاہ کو اس تحریک کے ایک جز کی حیثیت سے اور اسی کی خاطر چلانا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جن لوگوں کے دل اس تحریک میں ہمارے ساتھ ہیں انہی کی جیب اس درسگاہ کی مالی ذمہ داریاں اٹھائے تاکہ یہ درسگاہ اس طرح پروان چڑھے جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کا دودھ پی کر پروان چڑھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ابھی جماعت کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اس کے بل پر کوئی اس طرح کا بڑا عزم کیا جا سکے لیکن ہم

اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ اگر کام کو صحیح طور پر انجام دینا مشکل ہو تو اس کو غلط ہی طور پر کرنا گوارا کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس کے لیے راہیں پیدا کرے گا۔

درسگاہ کے قیام میں جو دیر ہو رہی ہے اس کی ایک حد تک تلافی کے لیے ہم نے فی الحال یہ شکل سوچی ہے کہ جماعت کے کارکنوں کے لیے ایک عارضی تربیت گاہ جاری کر دی جائے۔ اس تربیت گاہ کا مقصد یہ ہوگا کہ جماعت کے کارکنوں کی ایک متعین تعداد مرکز میں قیام کر کے جماعت کے کاموں کے لیے علمی و عملی ٹریننگ حاصل کرے۔ ان کے درس و مطالعہ کے لیے ایک مختصر نصاب ہوگا۔ اور ایک خاص نظام کے ماتحت ان کو یہاں کے مختلف شعبوں کے فرائض کو سمجھنے اور انجام دینے کا موقع بہم پہنچایا جائے گا۔ اس کام کے لیے مدت کم سے کم رکھی جائے گی، اور اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ اس مدت میں ان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جائے۔ اس وقت ہمارے پاس قیام کے لیے اتنی گنجائش ہے کہ ۱۵ - ۲۰ آدمی بیک وقت یہاں ٹھہر سکیں گے۔ اگر ۱۵-۱۵ آدمیوں کے کم از کم تین بیچ بھی سال میں یہاں ٹھہر کر تربیت حاصل کر سکے تو بہت جلد جماعت کے اندر تجربہ کار کارکنوں کی کافی تعداد پیدا ہو جائے گی اور آئے دن تربیت نہ پائے ہوئے کارکنوں کی وجہ سے ہمیں جو زحمتیں پیش آ رہی ہیں یا دوسروں کو کبھی کبھی جماعت کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہو جایا کرتی ہیں، ان میں بہت بڑی حد تک کمی ہو جائے گی اور تعلیم و دعوت کی رفتار بھی تیز ہو جائے گی۔ اس چیز کی ضرورت ہماری باہر کی شاخیں بھی محسوس کر رہی ہیں اور ہم بھی نہایت شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں لیکن ہم اس تربیت گاہ کو درسگاہ کا ایک جزء بنانا چاہتے تھے اور درسگاہ کے قیام میں ہماری اسکیم کے لحاظ سے زیادہ دیر نہیں تھی اس وجہ سے اس کو ٹالتے رہے۔ اب چونکہ بظاہر حالات اس بات کی توقع نہیں ہے کہ درسگاہ اس سال جاری ہو سکے اس وجہ سے مناسب یہی معلوم ہوا کہ کارکنوں کی تربیت کا کام شروع کر دیا جائے۔ انشاء اللہ یہی چیز درسگاہ کا پیش خیمہ بن جائے گی۔ اس مقصد کے لیے ہوس کا ایک مکان موجود ہے۔ صرف فرش ٹھیک ہو جائے اور ضروری سامانِ اقامت مہیا ہو جائے تو اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔

سالانہ اجتماع کا وقت قریب آ رہا ہے۔ گزشتہ اجتماع کے موقع پر ہماری جن شاخوں کی طرف سے آئندہ کے اجتماع کے لیے دعوت نامے ملے تھے ان میں سے مدراس کی جماعت کی دعوت کو خاص اہمیت دی گئی تھی۔ اس اہمیت کی وجہ یہ تھی کہ مرکز سے بہت دور ہونے کی وجہ سے مدراس اس بات کا زیادہ حقدار تھا کہ سالانہ اجتماع کے ذریعہ سے مقصد دعوت کو وہاں تقویت پہنچائی جائے یہی خیال ابتک پیش نظر رہا ہے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مدراس میں اجتماع کرنے کی صورت میں جماعت اور ارکان جماعت کا بہت زیادہ روپیہ خرچ ہوگا۔ اب تک جماعت کے ارکان کی بڑی تعداد شمالی ہند میں ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ یہاں کے شرکائے اجتماع کی تعداد کسی طرح بھی پانچسو سے کم نہ ہوگی۔ اس سے زیادہ کا امکان ہے۔ اگر ارکان کی اتنی بڑی تعداد کو مدراس جیسے دور دراز علاقہ کا سفر کرنا پڑا تو آمد و رفت کے مصارف اتنے زیادہ ہوں گے کہ لوگ بار محسوس کریں گے اور بالفرض لوگ مقصد کی محبت میں بار نہ بھی محسوس کریں جب بھی یہ بات کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی کہ بغیر کسی غیر معمولی سبب کے ارکان کو اس طرح کے ایثار پر مجبور کیا جائے

اس وجہ سے غور و فکر کے بعد یہ طے کیا گیا کہ سالانہ اجتماع تو یوپی میں ہو البتہ مرکز کے کارکنوں کا ایک وفد مدراس کا دورہ کرے۔ اس صورت میں ایک طرف تو ہر صوبہ کے ارکان کے لیے سفر نسبۃً کم خرچ اور آسان ہو جائے گا، دوسری طرف مدراس میں سالانہ اجتماع کے انعقاد سے جو غرض پیش نظر تھی وہ بھی بہتر طریق پر حاصل ہو سکے گی۔ وفد بنا کر دورہ کرنے کی صورت میں جس جزرسی اور وسعت کے ساتھ صوبہ کے حالات اور تحریک کے لیے اس کی صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس جزرسی اور تفصیل کے ساتھ سالانہ اجتماع کی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے مدراس کے رفقا بھی اس تجویز کو زیادہ پسند کریں گے اور یہ خیال نہ کریں گے کہ ان کی دعوت کی قدر نہیں کی گئی۔ اصل چیز مقصد ہے وہ جس صورت میں بہتر طریق پر حاصل ہو اس کے لیے جماعت کے ارکان کو اپنی انفرادی سہولتیں اور خواہشیں ہمیشہ قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

یہ مسئلہ ابھی زیر غور ہے کہ اجتماع کے لیے یوپی کا کون سا شہر موزوں ہوگا؟ ظن غالب ہے کہ الٰہ آباد یا کانپور کا انتخاب ہوگا۔ اس بارہ میں یوپی کی جماعتوں سے مراسلت ہو رہی ہے۔ ان کی تجاویز آجانے کے بعد مرکز کی طرف سے آخری فیصلہ ہوگا۔ اور اس کا ان صفحات میں اعلان کر دیا جائے گا۔

اجتماع سے متعلق ضروری ہدایات اس سے پہلے کے اجتماعات کے موقع پر دی گئی ہیں۔ اس موقع پر مزید جن ہدایات کی ضرورت سمجھی جائے گی وہ بھی شائع ہو جائیں گی۔ بر وقت صرف یوپی کے ارکان جماعت سے یہ کہنا ہے کہ وہ جس حد تک اس دعوت کو پھیلانے میں کوشش کر سکتے ہوں اسے اٹھا نہ رکھیں۔ سالانہ اجتماع کا اصلی فائدہ اسی صورت میں حاصل ہو سکے گا جب اس سے پہلے ایک وسیع حلقہ کے ذہن کو اچھی طرح تحریک کے مالہ وماعلیہ سے آشنا کر دیا جائے۔ اس کا آسان طریقہ لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا ہے۔ جن لوگوں تک ہمارا لٹریچر پہنچ جائے گا ان میں بڑی تعداد انشاء اللہ ایسے لوگوں کی نکلے گی جو جماعت کے نصب العین سے قریب آجائیں گے اور سالانہ اجتماع کے موقع پر اگر ان میں سے کچھ لوگ اپنے شبہات و شکوک دور کرنا چاہیں گے تو نہایت آسانی کے ساتھ کر سکیں گے۔ درحقیقت اسی طرح کے لوگوں تک پہنچنے اور ان کے ذہنوں میں اپنے مقصد کو اتارنے کے لیے یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اجتماعات کیے جائیں۔ اگر یہ چیز مد نظر نہ ہوتی تو اجتماعات کو ہم اپنے پروگرام سے بالکل خارج کر دیتے۔ اس امر سے پہلے سے اس وجہ سے آگاہ کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ بالکل خالی الذہن ہمارے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں وہ ان سے بالکل فائدہ نہیں اٹھا سکتے بلکہ بسا اوقات اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ وہ کسی غلط فہمی میں پڑ جائیں۔

تفہیم القرآن

(۱۳)

التوبہ

(از وسط رکوع ۱۳ تا وسط رکوع ۱۴)

کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوتِ حق کو) نقصان پہنچائیں، اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں، اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں، اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسرِ پیکار رہ چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔[۹۹] پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے

---

[۹۹] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے تشریف لے جانے سے پہلے قبیلۂ خزرج میں ایک شخص ابوعامر نامی تھا جو زمانۂ جاہلیت میں عیسائی راہب بن گیا تھا۔ اس کا شمار علمائے اہلِ کتاب میں ہوتا تھا اور رہبانیت کی وجہ سے اس کے علمی وقار کے ساتھ ساتھ اس کی درویشی کا سکہ بھی مدینے اور اس کے اطراف کے جاہل عربوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے پہنچے تو اس کی مشیخت وہاں خوب چل رہی تھی۔ مگر یہ علم اور یہ درویشی اس کے اندر حق شناسی اور حق جوئی پیدا کرنے کے بجائے الٹی اس کے لیے ایک زبردست حجاب بن گئی اور اس حجاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضور کی تشریف آوری کے بعد وہ محض نعمتِ ایمان ہی سے محروم نہ رہا بلکہ آپ کو اپنی مشیخت کا حریف اور اپنے کاروبارِ درویشی کا دشمن سمجھ کر آپ کی اور آپ کے کام کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ پہلے دو سال تک تو اسے یہ امید رہی کہ کفارِ قریش کی طاقت ہی اسلام کو مٹانے کے لیے کافی ثابت ہو گی۔ لیکن جنگِ بدر میں جب قریش نے شکستِ فاش کھائی تو اسے یارائے ضبط نہ رہا۔ اسی سال وہ مدینہ سے نکل کھڑا ہوا اور اس نے قریش اور دوسرے عرب قبائل میں اسلام کے خلاف تبلیغ شروع کر دی۔ جنگِ اُحُد جن لوگوں کی سعی سے برپا ہوئی ان میں یہ بھی شامل تھا اور کہا جاتا ہے کہ احد کے میدانِ جنگ میں اسی نے وہ گڑھے کھدوائے تھے جن میں سے ایک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم گر کر زخمی ہوئے۔ پھر جنگِ احزاب میں جو لشکر ہر طرف سے مدینہ پر چڑھ آئے تھے ان کو چڑھا لانے میں بھی اس کا حصہ نمایاں تھا۔ اس کے بعد جنگِ حنین تک جتنی لڑائیاں مشرکینِ عرب اور مسلمانوں کے درمیان ہوئیں ان سب میں یہ عیسائی درویش اسلام کے خلاف شرک کا سرگرم حامی رہا۔ آخرکار اسے اس بات سے مایوسی ہو گئی کہ عرب کی کوئی طاقت اسلام کے سیلاب کو روک سکے گی، اس لیے عرب کو چھوڑ کر اس نے روم کا رخ کیا تاکہ قیصر کو اس "خطرے" سے آگاہ کرے جو عرب سے سر اٹھا رہا تھا۔ یہ وہی موقع تھا جب مدینہ میں (باقی حاشیہ صفحہ ۹ پر)

اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸) یہ اطلاعات پہنچیں کہ قیصر عرب پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا ہے اور اسی کی روک تھام کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تبوک کی مہم پر جانا پڑا۔ ابو عامر راہب کی ان تمام سرگرمیوں میں مدینہ کے منافقین کا ایک گروہ اس کے ساتھ شریک سازش تھا، اور اس آخری تجویز میں بھی یہ لوگ اس کے ہم نوا تھے کہ وہ اپنے مذہبی اثر کو استعمال کر کے اسلام کے خلاف قیصر روم اور شمالی عرب کی عیسائی ریاستوں سے فوجی امداد حاصل کرے۔ جب وہ روم کی طرف روانہ ہونے لگا تو اس کے اور ان منافقوں کے درمیان یہ قرارداد ہوئی کہ مدینہ میں یہ لوگ اپنی ایک الگ مسجد بنا لیں گے تاکہ عام مسلمانوں سے بچ کر منافق مسلمانوں کی علیٰحدہ جتھہ بندی اس طرح کی جا سکے کہ اس پر مذہب کا پردہ پڑا رہے اور آسانی سے اس پر کوئی شبہہ نہ کیا جا سکے، اور وہاں نہ صرف یہ کہ منافقین منظم ہو سکیں اور آئندہ کارروائیوں کے لیے مشورے کر سکیں بلکہ ابو عامر کے پاس سے جو ایجنٹ خبریں اور ہدایات لے کر آئیں وہ بھی غیر مشتبہ فقیروں اور مسافروں کی حیثیت سے اس مسجد میں ٹھیر سکیں۔ یہ تھی وہ ناپاک سازش جس کے مطابق وہ مسجد تیار کی گئی جس کا ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔

مدینہ میں اس وقت دو مسجدیں تھیں، ایک مسجد قبا جو شہر کے مضافات میں تھی، دوسری مسجد نبوی جو شہر کے اندر تھی۔ ان دو مسجدوں کی موجودگی میں ایک تیسری مسجد بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اور وہ زمانہ ایسی جھوٹی مذہبیت کا نہ تھا کہ مسجد کے نام سے ایک عمارت بنا دینا بجائے خود کارِ ثواب ہو، قطع نظر اس سے کہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ایک نئی مسجد بننے کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی جماعت میں خواہ مخواہ تفریق رونما ہو جسے ایک صالح اسلامی نظام کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے یہ لوگ مجبور ہوئے کہ اپنی علیٰحدہ مسجد بنانے سے پہلے اس کی ضرورت ثابت کریں۔ چنانچہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اس تعمیرِ نو کے لیے یہ ضرورت پیش کی کہ بارش میں اور جاڑے کی راتوں میں عام لوگوں کو اور خصوصاً ضعیفوں اور معذوروں کو، جو ان دونوں مسجدوں سے دور رہتے ہیں، پانچوں وقت حاضری دینی مشکل ہوتی ہے، لہٰذا ہم محض نمازیوں کی آسانی کے لیے یہ ایک نئی مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

ان پاکیزہ ارادوں کی نمائش کے ساتھ جب یہ مسجد ضرار بن کر تیار ہو گئی تو یہ اشرار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ آپ ایک مرتبہ خود نماز پڑھا کر ہماری مسجد کا افتتاح فرما دیں۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "اس وقت میں جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں، اور ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ اس مہم سے واپس آ کر دیکھوں گا۔" اس کے بعد آپ تبوک کی طرف روانہ ہو گئے اور آپ کے پیچھے یہ لوگ اس مسجد میں اپنی جتھہ بندی اور سازش کرتے رہے، حتیٰ کہ انھوں نے یہاں تک طے کر لیا کہ اُدھر رومیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قلع قمع ہو اور اِدھر یہ فوراً ہی عبداللہ ابن اُبی کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیں۔ لیکن تبوک میں جو معاملہ پیش آیا اس نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ واپسی پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قریب ذِی اَوَان کے مقام پر پہنچے تو یہ آیات نازل ہوئیں اور آپ نے اسی وقت چند آدمیوں کو مدینہ کی طرف بھیج دیا تاکہ آپ کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے پہلے وہ اس مسجد ضرار کو مسمار کر دیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۱۰۵ متن میں لفظ "جُرُف" استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق عربی زبان میں کسی ندی یا دریا کے اس کنارے پر ہوتا ہے جس کے نیچے کی مٹی کو پانی نے کاٹ کاٹ کر بہا دیا ہو اور اوپر کا حصہ بے سہارا کھڑا ہو۔ جو لوگ اپنے عمل کی بنیاد خدا سے بے خوفی اور اس کی رضا سے بے نیازی پر رکھتے ہیں ان کی تعمیرِ حیات کو یہاں اس عمارت سے تشبیہ دی گئی ہے جو ایسے ایک کھوکھلے بے ثبات کنارۂ دریا پر اٹھائی گئی ہو۔ یہ ایک بے نظیر تشبیہ ہے جس سے زیادہ بہتر طریقہ سے اس صورتِ حال کی نقشہ کشی نہیں کی جا سکتی۔ اس کی پوری معنویت ذہن نشین کرنے کے لیے یوں سمجھیے کہ دنیوی زندگی کی وہ ظاہری سطح جس پر مومن، منافق، کافر، صالح، فاجر، غرض تمام انسان کام کرتے ہیں، مٹی کی اُس اوپری تہ کے مانند ہے جس پر دنیا میں ساری (باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۲ پر)

اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جاگری ؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔[۱] یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اس کے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں۔[۲] اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔[۳] وہ اللہ کی راہ میں لڑتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹) عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ تو اپنے اندر خود کوئی پائیداری نہیں رکھتی، بلکہ اس کی پائیداری کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے نیچے ٹھوس زمین موجود ہو۔ اگر کوئی ایسی ہو جس کے نیچے کی زمین کسی چیز، مثلاً دریا کے پانی سے کٹ چکی ہو تو ہونا واقف انسان اس کی ظاہری حالت سے دھوکا کھا کر اس پر اپنا مکان بنائے گا اُسے وہ اس کے مکان سمیت لے بیٹھے گی اور وہ نہ صرف خود ہلاک ہوگا بلکہ اس ناپائیدار بنیاد پر اعتماد کرکے اپنا جو کچھ سرمایۂ زندگی وہ اس عمارت میں جمع کرے گا وہ بھی برباد ہو جائے گا۔ بالکل اسی مثال کے مطابق حیات دنیا کی وہ ظاہری سطح بھی جس پر ہم سب اپنے کارنامۂ زندگی کی عمارت اٹھاتے ہیں، بجائے خود کوئی ثبات و قرار نہیں رکھتی بلکہ اس کی مضبوطی و پائیداری کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے نیچے خدا کے خوف، اُس کے حضور جوابدہی کے احساس اور اُس کی مرضی کے اتباع کی ٹھوس چٹان موجود ہو۔ جو نادان آدمی محض حیات دنیا کے ظاہری پہلو پر اعتماد کر لیتا ہے اور دنیا میں خدا سے بے خوف اور اس کی رضا سے بے پروا ہو کر کام کرتا ہے وہ دراصل خود اپنی تعمیر زندگی کے نیچے سے اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور اس کا آخری انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ بنیاد سطح جس پر اس نے اپنی عمر بھر کا سرمایۂ عمل جمع کیا ہے ایک دن یکایک گر جائے اور اسے اس کے پورے سرمایے سمیت لے بیٹھے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] "سیدھی راہ" یعنی وہ راہ جس سے انسان بامراد ہوتا اور حقیقی کامیابی کی منزل پر پہنچتا ہے۔

[۲] یعنی ان لوگوں نے منافقانہ مکر و دغا کے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرکے اپنے دلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایمان کی صلاحیت سے محروم کر لیا ہے اور بے ایمانی کا روگ اس طرح ان کے دلوں کے ریشے ریشے میں پیوست ہو گیا ہے کہ جب تک ان کے دل باقی ہیں یہ روگ بھی ان میں موجود رہے گا۔ خدا سے کفر کرنے کے لیے جو شخص علانیہ بت خانہ بنائے یا اس کے دین سے لڑنے کے لیے کھلم کھلا مورچے اور دمدمے تیار کرے اس کی ہدایت تو کسی نہ کسی وقت ممکن ہے، کیونکہ اس کے اندر راستبازی، اخلاص اور اخلاقی جرأت کا وہ جوہر تو بنیادی طور پر محفوظ رہتا ہے جو حق پرستی کے لیے بھی اسی طرح کام آسکتا ہے جس طرح باطل پرستی کے کام آتا ہے۔ لیکن جو بزدل، جھوٹا اور مکار انسان کفر کے لیے مسجد بنائے اور خدا کے دین سے لڑنے کے لیے خدا پرستی کا پر فریب لبادہ اوڑھے اس کی سیرت کو تو نفاق کی دیمک کھا چکی ہوتی ہے۔ اس میں یہ طاقت ہی کہاں باقی رہ سکتی ہے کہ مخلصانہ ایمان کا بوجھ سہار سکے۔

[۳] یہاں ایمان کے اُس معاملے کو جو خدا اور بندے کے درمیان طے ہوتا ہے، بیع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان محض ایک مابعد الطبیعی عقیدہ نہیں ہے بلکہ فی الواقع وہ ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے بندہ اپنا نفس اور اپنا مال خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں خدا کی طرف سے اس وعدے کو قبول کر لیتا ہے کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں وہ اسے جنت عطا کرے گا۔ اس اہم مضمون کے تضمنات کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس بیع کی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے، اُس کے لحاظ سے تو انسان کی جان و مال کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے کیونکہ وہی اس کا اور ان ساری چیزوں کا خالق ہے جو اس کے پاس ہیں اور اسی نے وہ سب کچھ اسے بخشا ہے جس پر وہ تصرف کر رہا ہے، لہٰذا اس حیثیت سے تو خرید و فروخت کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ انسان کا اپنا کچھ ہے کہ وہ اسے بیچے، نہ کوئی چیز خدا کی ملکیت سے خارج ہے کہ وہ اسے خریدے۔ لیکن ایک چیز انسان (باقی حاشیہ صفحہ ۱۱ پر)

اور مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے توراۃ و انجیل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) کے اندر ایسی بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کلیۃً اس کے حوالہ کر دیا ہے، اور وہ ہے اس کا اختیار، یعنی اس کا اپنے انتخاب و ارادہ میں آزاد ہونا (free will & freedom of choice) اس اختیار کی بنا پر حقیقت نفس الامری تو نہیں بدلتی مگر انسان کو اس امر کی خود مختاری حاصل ہو جاتی ہے کہ چاہے تو حقیقت کو تسلیم کرے ورنہ انکار کر دے۔ بالفاظ دیگر اس اختیار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان فی الحقیقت اپنے نفس کا اور اپنے ذہن و جسم کی قوتوں کا اور ان اقتدارات کا جو اسے دنیا میں حاصل ہیں، مالک ہو گیا ہے اور اسے یہ حق مل گیا ہے کہ ان چیزوں کو جس طرح چاہے استعمال کرے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اسے اس امر کی آزادی دے دی گئی ہے کہ خدا کی طرف سے کسی جبر کے بغیر وہ خود ہی اپنی ذات پر اور اپنی ہر چیز پر خدا کے حقوق مالکانہ کو تسلیم کرنا چاہے تو کرے ورنہ آپ ہی اپنا مالک بن بیٹھے اور اپنے زعم میں یہ خیال کرے کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر اپنے حدود اختیار میں اپنے حسب منشا تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے بیع کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دراصل یہ بیع اس معنی میں نہیں ہے کہ جو چیز انسان کی ہے خدا اسے خریدنا چاہتا ہے، بلکہ اس معاملہ کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ جو چیز خدا کی ہے اور جسے اس نے امانت کے طور پر انسان کے حوالے کیا ہے، اور جس میں امین رہنے یا خائن بن جانے کی آزادی اس نے انسان کو دے رکھی ہے، اس کے بارے میں وہ انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو برضا و رغبت (نہ کہ بمجبوری) میری چیز کو میری ہی چیز مان لے اور زندگی بھر اس میں خود مختار مالک کی حیثیت سے نہیں بلکہ امین ہونے کی حیثیت سے تصرف کرنا قبول کر لے اور خیانت کی جو آزادی تجھے حاصل ہے اس سے خود بخود دست بردار ہو جا۔ اس طرح اگر تو دنیا کی موجودہ عارضی زندگی میں اپنی خود مختاری کو (جو تیری حاصل کردہ نہیں بلکہ میری عطا کردہ ہے) میرے ہاتھ فروخت کر دے گا تو میں تجھے بعد کی جاودانی زندگی میں اس کی قیمت بصورت جنت ادا کروں گا۔ جو انسان خدا کے ساتھ بیع کا یہ معاملہ طے کر لے وہ مومن ہے اور ایمان دراصل اسی بیع کا دوسرا نام ہے، اور جو شخص اس سے انکار کر دے، یا اقرار کرنے کے باوجود ایسا رویہ اختیار کرے جو بیع نہ کرنے کی صورت ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے، وہ کافر ہے اور اس بیع ہی سے گریز کا اصطلاحی نام کفر ہے۔

بیع کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس کے تضمنات کا تجزیہ کیجیے :۔

(۱) اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو بہت بڑی آزمائشوں میں ڈالا ہے۔ پہلی آزمائش اس امر کی کہ آزاد چھوڑ دیے جانے پر یہ اتنی شرافت دکھاتا ہے یا نہیں کہ مالک ہی کو مالک سمجھے اور نمک حرامی و بغاوت پر نہ اتر آئے۔ دوسری آزمائش اس امر کی کہ یہ اپنے خدا پر اتنا اعتماد کرتا ہے یا نہیں کہ جو قیمت آج نقد نہیں مل رہی ہے بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں جس کے ادا کرنے کا خدا کی طرف سے وعدہ ہے اس کے عوض اپنی آج کی خود مختاری اور اس کے مزے بیچ دینے پر بخوشی راضی ہو جائے۔

(۲) دنیا میں جس فقہی قانون پر اسلامی سوسائٹی بنتی ہے اس کی رو سے تو ایمان بس چند عقائد کے اقرار کا نام ہے جس کے بعد کوئی قاضی شرع کسی کے غیر مومن یا خارج از ملت ہونے کا حکم نہیں لگا سکتا جب تک اس امر کا کوئی صریح ثبوت اسے نہ مل جائے کہ وہ اپنے اقرار میں جھوٹا ہے۔ لیکن خدا کے ہاں جو ایمان معتبر ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ خیال اور عمل دونوں میں اپنی آزادی و خود مختاری کو خدا کے ہاتھ بیچ دے اور اس کے حق میں اپنے ادعائے ملکیت سے کلیۃً دست بردار ہو جائے۔ پس اگر کوئی شخص کلمۂ اسلام کا اقرار کرتا ہو اور صوم و صلوٰۃ وغیرہ احکام کا بھی پابند ہو لیکن اپنے جسم و جان کا، اپنے دل و دماغ اور بدن کی قوتوں کا، اپنے مال اور وسائل و ذرائع کا، اور اپنے قبضہ و اختیار کی ساری چیزوں کا مالک اپنے آپ ہی کو سمجھتا ہو اور ان میں اپنے حسب منشا تصرف کرنے کی آزادی اپنے لیے محفوظ رکھتا ہو، تو ہو سکتا ہے کہ دنیا میں وہ مومن سمجھا جاتا رہے مگر خدا کے ہاں یقیناً وہ غیر مومن ہی قرار پائے گا کیونکہ اس نے خدا کے ساتھ وہ بیع کا معاملہ سرے سے کیا ہی نہیں ہے جو قرآن کی رو سے ایمان کی اصل حقیقت ہے۔ جہاں خدا کی مرضی ہو وہاں جان و مال کھپانے سے دریغ کرنا (باقی صفحہ ۱۲ پر)

اور قرآن میں ۱۵؎۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو۔ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) اور جہاں اس کی مرضی نہ ہو وہاں جان و مال کھپانا، یہ دونوں طرزِ عمل ایسے ہیں جو اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں کہ مدعیِ ایمان نے یا تو جان و مال کو خدا کے ہاتھ بیچا نہیں ہے، یا بیع کا معاہدہ کر لینے کے بعد بھی وہ بیچی ہوئی چیز کو بدستور اپنی سمجھ رہا ہے۔

(۳) ایمان کی یہ حقیقت اسلامی رویۂ زندگی اور کافرانہ رویۂ زندگی کو شروع سے آخر تک بالکل ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ مسلم جو صحیح معنی میں خدا پر ایمان لایا ہو اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں خدا کی مرضی کا تابع بن کر کام کرتا ہے اور اس کے رویہ میں کسی جگہ بھی خود مختاری کا رنگ نہیں آنے پاتا الا یہ کہ عارضی طور پر کسی وقت اس پر غفلت طاری ہو جائے اور وہ خدا کے ساتھ اپنے معاہدۂ بیع کو بھول کر کوئی خود مختارانہ حرکت کر بیٹھے۔ اسی طرح جو گروہ اہلِ ایمان سے مرکب ہو وہ اجتماعی طور پر بھی کوئی پالیسی، کوئی سیاست، کوئی طرزِ تمدن و تہذیب، کوئی طریقِ معیشت و معاشرت اور کوئی بین الاقوامی رویہ خدا کی مرضی اور اس کے قانونِ شرعی کی پابندی سے آزاد ہو کر اختیار نہیں کر سکتا، اور اگر کسی عارضی غفلت کی بنا پر اختیار کر بھی جائے تو جس وقت اسے تنبہ ہو اسی وقت وہ آزادی کا رویہ چھوڑ کر بندگی کے رویہ کی طرف پلٹ آتا ہے۔ خدا سے آزاد ہو کر کام کرنا اور اپنے نفس و متعلقاتِ نفس کے بارے میں خود یہ فیصلہ کرنا کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں، بہرحال ایک کافرانہ رویۂ زندگی ہے خواہ اس پر چلنے والے لوگ "مسلمان" کے نام سے موسوم ہوں یا "غیر مسلم" کے نام سے۔

(۴) اس بیع کی رو سے خدا کی جس مرضی کا اتباع مومن پر لازم آتا ہے وہ اس کی اپنی تجویز کردہ مرضی نہیں، بلکہ وہ مرضی ہے جو خدا خود بتائے۔ اپنے آپ کسی چیز کو خدا کی مرضی ٹھیرا لینا اور اس کا اتباع کرنا خدا کی مرضی کا نہیں بلکہ اپنی ہی مرضی کا اتباع ہے اور یہ معاہدۂ بیع کے قطعی خلاف ہے۔ خدا کے ساتھ اپنے معاہدۂ بیع پر صرف وہی شخص اور وہی گروہ قائم سمجھا جائے گا جو اپنا پورا رویۂ زندگی خدا کی کتاب اور اس کے پیغمبر کی ہدایت سے اخذ کرتا ہو۔

یہ اس بیع کے تضمنات ہیں، اور ان کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس خرید و فروخت کے معاملہ میں قیمت (یعنی جنت) کو موجودہ دنیوی زندگی کے خاتمہ پر کیوں موخر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت صرف اس اقرار کا معاوضہ نہیں ہے کہ "بائع نے اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ بیچ دیا" بلکہ اس عمل کا معاوضہ ہے کہ "بائع اپنی دنیوی زندگی میں اس بیچی ہوئی چیز پر خود مختارانہ تصرف چھوڑ دے اور خدا کا امین بن کر اس کی مرضی کے مطابق تصرف کرے"۔ لہٰذا یہ فروخت مکمل ہی اس وقت ہو گی جب کہ بائع کی دنیوی زندگی ختم ہو جائے اور فی الواقع یہ ثابت ہو کہ اس نے معاہدۂ بیع کرنے کے بعد سے اپنی دنیوی زندگی کے آخری لمحہ تک بیع کی شرائط پوری کی ہیں۔ اس سے پہلے وہ ازروئے انصاف قیمت پانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

ان امور کی توضیح کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ مضمون کس مناسبت سے آیا ہے۔ اوپر سے جو سلسلۂ تقریر چل رہا تھا اس میں ان لوگوں کا ذکر تھا جنہوں نے ایمان لانے کا اقرار کیا تھا مگر جب امتحان کا نازک موقع آیا تو ان میں سے بعض نے تساہل کی بنا پر، بعض نے اخلاص کی کمی کی وجہ سے، اور بعض نے قطعی منافقت کی راہ سے خدا اور اس کے دین کی خاطر اپنے وقت، اپنے مال، اپنے مفاد اور اپنی جان کو قربان کرنے میں دریغ کیا۔ لہٰذا ان مختلف اشخاص اور طبقوں کے رویہ پر تنقید کرنے کے بعد اب ان کو صاف صاف بتایا جا رہا ہے کہ وہ ایمان جسے قبول کرنے کا تم نے اقرار کیا ہے محض یہ مان لینے کا نام نہیں ہے کہ خدا ہے اور وہ ایک ہے، بلکہ دراصل وہ اس امر کا اقرار ہے کہ خدا ہی تمہارے نفس اور تمہارے مال کا مالک ہے۔ پس یہ اقرار کرنے کے بعد اگر تم اس نفس و مال کو خدا کے حکم پر قربان کرنے سے جی چراتے ہو اور اپنے نفس کی قوتوں کو نیز اپنے ذرائع کو اس کے منشا کے خلاف استعمال کرتے ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے اقرار میں جھوٹے ہو۔ سچے اہلِ ایمان صرف وہ لوگ ہیں جو واقعی اپنا نفس و مال خدا کے ہاتھ بیچ چکے ہیں اور اسی کو ان چیزوں کا مالک سمجھتے ہیں، جہاں اس کا حکم ہوتا ہے وہاں انہیں بے دریغ قربان کرتے ہیں، اور جہاں اس کا حکم نہیں ہوتا وہاں نفس کی طاقتوں کا کوئی ادنیٰ سا جز اور مالی ذرائع کا کوئی ذرا سا حصہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱۵؎ اس امر پر بہت اعتراضات کیے گئے ہیں کہ جس وعدے کا یہاں ذکر ہے وہ توراۃ اور انجیل میں موجود نہیں ہے۔ مگر جہاں تک (باقی صفحہ ۲۱۳ پر)

سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے[1]، اس کی بندگی بجا لانے والے، اس کی تعریف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۴) انجیل کا تعلق ہے یہ اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ جو انجیل اس وقت دنیا میں موجود ہیں ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے متعدد اقوال ہم کو ایسے ملتے ہیں جو اس آیت کے ہم معنی ہیں، مثلاً:

"مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے سبب ستائے گئے ہیں، کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہی کی ہے" (متی ۵: ۱۰)

"جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا" (متی ۱۰: ۳۹)

"جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا۔" (متی ۱۹: ۲۹-۳۰)

البتہ توراۃ جس صورت میں اس وقت موجود ہے اس میں بلاشبہ یہ مضمون نہیں پایا جاتا۔ اور یہی مضمون کیا، وہ تو حیات بعد الموت اور یوم الحساب اور اخروی جزا و سزا کے تصور ہی سے خالی ہے، حالانکہ یہ عقیدہ ہمیشہ سے دینِ حق کا جزو لاینفک رہا ہے۔ لیکن موجودہ توراۃ میں اس مضمون کے نہ پائے جانے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ واقعی توراۃ اس سے خالی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہود اپنے زمانۂ تنزل میں کچھ ایسے مادہ پرست اور دنیا کی خوشحالی کے بھوکے ہو گئے تھے کہ ان کے نزدیک نعمت اور انعام کے کوئی معنی اس کے سوا نہ رہے تھے کہ وہ اسی دنیا میں حاصل ہو۔ اسی لیے کتاب الٰہی میں بندگی و اطاعت کے بدلے جن جن انعامات کے وعدے ان سے کیے گئے تھے ان سب کو وہ دنیا ہی میں اتار لائے اور جنت کی ہر تعریف کو انہوں نے فلسطین کی سرزمین پر چسپاں کر دیا جس کے وہ امیدوار تھے۔ مثال کے طور پر توراۃ میں متعدد مقامات پر ہم کو یہ مضمون ملتا ہے:۔

"سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبت کر" (استثناء ۶: ۴، ۵)

لیکن اس عمل کی جو جزا بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اُس ملک کے مالک ہو جاؤ گے جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے، یعنی فلسطین۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ توراۃ جس صورت میں اس وقت پائی جاتی ہے وہ خالص کلامِ الٰہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سا تفسیری کلام بھی خدا کے کلام کے ساتھ ساتھ شامل کر دیا گیا ہے، اور یہود کی قومی روایات، ان کے نسلی تعصبات، ان کے اوہام، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں، ان کی غلط فہمیوں، اور ان کے فقہی اجتہادات کا ایک معتدبہ حصہ ایک ہی سلسلۂ عبارت میں کلامِ الٰہی کے ساتھ کچھ اس طرح رل مل گیا ہے کہ اکثر مقامات پر اصل کلام کو ان زوائد سے ممیز کرنا قطعاً غیر ممکن ہو جاتا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] متن میں لفظ اَلتَّائِبُوْن استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ "توبہ کرنے والے" ہے۔ لیکن جس انداز کلام میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ توبہ کرنا اہل ایمان کی مستقل صفات میں سے ہے، اس لیے اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک ہی مرتبہ توبہ نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ توبہ کرتے رہتے ہیں، اور توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے یا پلٹنے کے ہیں، لہٰذا اس لفظ کی حقیقی روح ظاہر کرنے کے لیے ہم نے اس کا تشریحی ترجمہ یوں کیا ہے کہ "وہ اللہ کی طرف بار بار پلٹتے ہیں"۔ مومن اگرچہ اپنے پورے شعور و ارادہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے نفس و مال کی بیع کا معاملہ طے کرتا ہے، لیکن چونکہ ظاہر حال کے لحاظ سے محسوس یہی ہوتا ہے کہ نفس اس کا اپنا ہے اور مال اس کا اپنا ہے، اور یہ بات کہ نفس و مال کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے ایک امرِ محسوس نہیں بلکہ محض ایک امرِ معقول ہے، اس لیے مومن کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں جبکہ وہ عارضی طور پر خدا کے ساتھ اپنے معاملۂ بیع کو بھول جاتا ہے اور اس سے غافل ہو کر کوئی خود مختارانہ طرزِ عمل اختیار کر بیٹھتا ہے۔ مگر ایک حقیقی مومن کی صفت یہ ہے کہ جب بھی اس کی یہ عارضی بھول دور ہوتی ہے اور وہ اپنی غفلت سے چونکتا ہے اور اس کو یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ غیر شعوری طور پر وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی کر گزرا ہے تو (باقی صفحہ ۲۰۶ پر)

کے گن گانے والے، اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے،[۵۱] اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے، اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے،[۵۲] (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے خرید و فروخت کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبی ان مومنوں کو خوشخبری دیدو۔

نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔[۵۳] ابراہیم نے اپنے باپ کے لیے جو دعائے مغفرت کی تھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۱) اسے ندامت لاحق ہوتی ہے اور شرمندگی کے ساتھ وہ اپنے خدا کی طرف پلٹتا ہے، معافی مانگتا ہے اور اپنے عہد کو پھر سے تازہ کر لیتا ہے۔ یہی بار بار کی توبہ اور یہی رہ رہ کر خدا کی طرف پلٹنا اور ہر لغزش کے بعد وفاداری کی راہ پر واپس آنا ہی ایمان کے دوام و ثبات کا ضامن ہے۔ ورنہ انسان جن بشری کمزوریوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے ان کی موجودگی میں تو یہ بات اس کے بس میں نہیں ہے کہ خدا کے ہاتھ ایک دفعہ نفس و مال بیچ دینے کے بعد ہمیشہ کامل شعوری حالت میں اس بیع کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے اور کسی وقت بھی غفلت و نسیان اس پر طاری نہ ہونے پائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ مومن کی تعریف میں یہ نہیں فرماتا کہ وہ بندگی کی راہ پر آکر کبھی اس سے پھسلتا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کی قابل تعریف صفت یہ قرار دیتا ہے کہ وہ پھسل پھسل کر بار بار اسی راہ کی طرف آتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس پر انسان قادر ہے۔

پھر اس موقع پر مومنین کی صفات میں سب سے پہلے توبہ کا ذکر کرنے کی ایک اور مصلحت بھی ہے۔ اوپر سے جو سلسلۂ کلام چلا آرہا ہے اس میں روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جن سے ایمان کے منافی افعال کا ظہور ہوا تھا۔ لہٰذا ان کو ایمان کی حقیقت اور اس کا بنیادی مقتضیٰ بتانے کے بعد اب یہ تلقین جاری ہے کہ ایمان لانے والوں میں لازمی طور پر جو صفات ہونی چاہئیں ان میں سے اولین صفت یہ ہے کہ جب بھی ان کا قدم راہِ بندگی سے پھسل جائے وہ فوراً اس کی طرف پلٹ آئیں، نہ یہ کہ اپنے انحراف پر جمے رہیں اور زیادہ دور نکلتے چلے جائیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۵۱] متن میں لفظ السائحون استعمال ہوا ہے جس کی تفسیر بعض مفسرین نے الصائمون (روزہ رکھنے والے) سے کی ہے۔ لیکن سیاحت کے معنی روزہ، مجازی معنی ہیں، اصل لغت میں اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ اور جس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس لفظ کے یہ معنی ارشاد فرمائے ہیں اس کی نسبت حضورؐ کی طرف درست نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس لفظ کو اصل لغوی معنی ہی میں لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔ پھر جس طرح قرآن میں بکثرت مواقع پر مطلقاً انفاق کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی خرچ کرنے کے ہیں، اور مراد اس سے راہِ خدا میں خرچ کرنا ہے، اسی طرح یہاں بھی سیاحت سے مراد محض گھومنا پھرنا نہیں ہے بلکہ ایسے مقاصد کیلئے زمین میں نقل و حرکت کرنا ہے جو پاک اور بلند ہوں اور جن میں اللہ کی رضا مطلوب ہو، مثلاً اقامتِ دین کے لیے جہاد، کفر زدہ علاقوں سے ہجرت، دعوتِ دین، اصلاحِ خلق، طلبِ علمِ صالح، مشاہدۂ آثارِ الٰہی اور تلاشِ رزقِ حلال۔ اس صفت کو یہاں مومنین کی صفات میں خاص طور پر اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود جہاد کی پکار سن کر گھر سے نہیں نکلے تھے ان کو یہ بتانا مقصود ہے کہ حقیقی مومن ایمان کا دعویٰ کرکے اپنی جگہ چین سے بیٹھا نہیں رہ جاتا بلکہ وہ خدا کے دین کو قبول کرنے کے بعد اس کا بول بالا کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے تقاضے پورے کرنے کیلئے دنیا میں دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرتا پھرتا ہے۔ [۵۲] یعنی اللہ تعالیٰ نے عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت اور صلح و جنگ کے معاملات میں جو حدیں مقرر کردی ہیں وہ ان کو پوری پابندی کے ساتھ ملحوظ رکھتے ہیں، اپنے انفرادی و اجتماعی عمل کو انہی حدود کے اندر محدود رکھتے ہیں، اور کبھی ان سے تجاوز کرکے من مانی کارروائیاں کرنے نہیں لگتے، اور نہ خدائی قوانین کے بجائے خود ساختہ قوانین یا انسانی ساخت کے دوسرے قوانین کو اپنی زندگی کا ضابطہ بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ حدود اللہ کی حفاظت میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ ان حدود کو قائم کیا جائے، انہیں ٹوٹنے نہ دیا جائے۔ لہٰذا سچے اہلِ ایمان کی تعریف صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ خود حدود اللہ کی پابندی کرتے ہیں بلکہ مزید برآں ان کی یہ صفت بھی ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی نگہبانی کرتے ہیں اور اپنا پورا زور اس سعی میں لگا دیتے ہیں کہ یہ حدیں ٹوٹنے نہ پائیں۔

[۵۳] کسی شخص کے لیے معافی کی درخواست لازماً یہ معنی رکھتی ہے کہ اول تو ہم اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ ہم اس کے قصور کو قابلِ معافی (باقی صفحہ ۲۰۷ پر)

وہ تو اس وعدے کی وجہ سے تھی جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا،[۱] مگر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گیا، حق یہ ہے کہ ابراہیمؑ بڑا رقیق القلب و خدا ترس اور بردبار آدمی تھا۔[۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۶) سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اُس شخص کے معاملہ میں تو درست ہیں جو وفاداروں کے زمرے میں شامل ہو اور صرف گناہ گار ہو، لیکن جو شخص کھلا ہوا باغی ہو اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھنا اور اس کے جرم کو قابلِ معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود ہماری اپنی وفاداری مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم محض اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے یہ چاہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا تعلق خدا کی وفاداری کے مقتضیات کی بہ نسبت زیادہ قیمتی ہے، اور یہ کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ نہیں ہے، اور یہ کہ جو لاگ ہم نے خدا کے باغیوں کے ساتھ لگا رکھی ہے ہم چاہتے ہیں کہ خدا خود بھی اسی لاگ کو قبول کرلے اور ہمارے رشتہ دار کو تو ضرور بخش دے خواہ اسی جرم کا ارتکاب کرنے والے دوسرے مجرموں کو جہنم میں جھونک دے۔ یہ تمام باتیں غلط ہیں، اخلاص اور وفاداری کے خلاف ہیں اور اس ایمان کے منافی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بالکل بے لاگ ہو، خدا کا دوست ہمارا دوست ہو اور اس کا دشمن ہمارا دشمن۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ "مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا نہ کرو" بلکہ یوں فرمایا ہے کہ "تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ تم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو"۔ یعنی ہمارے منع کرنے سے اگر تم باز رہے تو یہ کچھ بات نہیں۔ تم میں تو خود وفاداری کی حس اتنی تیز ہونی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جرم کو قابلِ معافی سمجھنا تم کو اپنے لیے نازیبا محسوس ہو۔

یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ جو ہمدردی ممنوع ہے وہ صرف وہ ہمدردی ہے جو دین کے معاملہ میں دخل انداز ہوتی ہو۔ رہی انسانی ہمدردی اور دنیوی تعلقات میں صلۂ رحمی، مواساۃ، اور رحمت و شفقت کا برتاؤ، تو یہ ممنوع نہیں ہے بلکہ محمود ہے۔ رشتہ دار خواہ کافر ہو یا مومن، اس کے دنیوی حقوق ضرور ادا کیے جائیں گے۔ مصیبت زدہ انسان کی بہرحال مدد کی جائے گی، حاجت مند آدمی کو بہرصورت سہارا دیا جائے گا، بیمار اور زخمی کے ساتھ ہمدردی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے گی، یتیم کے سر پر یقیناً شفقت کا ہاتھ رکھا جائے گا، اور ایسے معاملات میں ہرگز یہ امتیاز نہ کیا جائے گا کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] اشارہ ہے اُس بات کی طرف جو اپنے مشرک باپ سے تعلقات منقطع کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ نے کہی تھی کہ سَلٰمٌ عَلَیْکَ سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا (مریم ۔ ۳) "آپ کو سلام ہے، میں آپ کے لیے اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ وہ میرے اوپر نہایت مہربان ہے۔" اور لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ وَمَآ اَمْلِکُ لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ (الممتحنہ ۔ ۱) "میں آپ کے لیے معافی ضرور چاہوں گا، اور میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے کہ آپ کو اللہ کی پکڑ سے بچوا لوں۔" چنانچہ اسی وعدے کی بنا پر آنجناب نے اپنے باپ کے لیے یہ دعا مانگی تھی کہ: وَاغْفِرْ لِاَبِیْۤ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (الشعراء ۔ ۵) "اور میرے باپ کو معاف کر دے، بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے تھا، اور اس دن مجھے رسوا نہ کر جبکہ سب انسان اٹھائے جائیں گے جبکہ نہ مال کسی کے کچھ کام آئے گا نہ اولاد، نجات صرف وہ پائے گا جو اپنے خدا کے حضور بغاوت سے پاک دل لے کر حاضر ہوا ہو۔" یہ دعا اول تو خود انتہائی محتاط لہجہ میں تھی، مگر اس کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ کی نظر اس طرف گئی کہ میں جس شخص کے لیے دعا کر رہا ہوں وہ تو خدا کا کھلم کھلا باغی تھا اور اس کے دین سے سخت دشمنی رکھتا تھا تو وہ اس سے بھی باز آگئے اور ایک سچے وفادار مومن کی طرح انہوں نے باغی کی ہمدردی سے صاف صاف تبرّی کر دی اگرچہ وہ باغی ان کا باپ تھا جس نے کبھی محبت سے ان کو پالا پوسا تھا۔

[۲] متن میں اَوّاہ اور حلیم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اَوّاہ کے معنی ہیں بہت آہیں بھرنے والا، زاری کرنے والا، ڈرنے والا، حسرت کرنے والا۔ اور حلیم اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مزاج پر قابو رکھتا ہو، نہ غصے اور دشمنی اور مخالفت میں آپے سے باہر ہو، نہ محبت اور دوستی اور تعلقِ خاطر میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے۔ یہ دونوں لفظ اس مقام پر دوہرے معنی دے رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کی کیونکہ وہ نہایت رقیق القلب آدمی تھے، اس خیال سے کانپ اٹھتے تھے کہ میرا یہ باپ جہنم کا ایندھن بن جائے گا، اور حلیم تھے، اس ظلم و ستم کے باوجود جو ان کے باپ نے (باقی صفحہ ۲۱۶ پر)

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرے جب تک کہ انھیں صاف صاف بتا نہ دے کہ انھیں کن چیزوں سے بچنا چاہیے[۵]۔ درحقیقت اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ ہی کے قبضہ میں آسمان و زمین کی سلطنت ہے اسی کے اختیار میں زندگی و موت ہے، اور تمھارا کوئی حامی و مددگار ایسا نہیں ہے جو تمھیں اس سے بچا سکے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) اسلام سے ان کو روکنے کے لیے اُن پر ڈٹ جاتے تھے ان کی زبان اس کے حق میں دعا ہی کے لیے کھلی۔ پھر انھوں نے یہ دیکھ کر کہ ان کا باپ خدا کا دشمن ہے اس سے تبرّی کی، کیونکہ وہ خدا سے ڈرنے والے انسان تھے اور کسی کی محبت میں حد سے تجاوز کر جانے والے نہ تھے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۵] یعنی اللہ پہلے یہ بتا دیتا ہے کہ لوگوں کو کن خیالات، کن اعمال اور کن طریقوں سے بچنا چاہیے۔ پھر جب وہ نہیں باز آتے اور غلط فکری و غلط کاری ہی پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی ہدایت و رہنمائی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور اس غلط راہ پر انھیں دھکیل دیتا ہے جس پر وہ خود جانا چاہتے ہیں۔

یہ ارشاد ایک قاعدۂ کلیہ بیان کرتا ہے جس سے قرآن مجید کے وہ تمام مقامات اچھی طرح سمجھے جا سکتے ہیں جہاں ہدایت دینے اور گمراہ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل بتایا ہے۔ خدا کا ہدایت دینا یہ ہے کہ وہ صحیح طریق فکر و عمل اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے لوگوں کے سامنے واضح طور پر پیش کر دیتا ہے، پھر جو لوگ اس طریقہ پر خود چلنے کے لیے آمادہ ہوں انھیں اس کی توفیق بخشتا ہے۔ اور خدا کا گمراہی میں ڈالنا یہ ہے کہ جو صحیح طریق فکر و عمل اس نے بتا دیا ہے اگر اس کے خلاف چلنے ہی پر کوئی اصرار کرے اور سیدھا نہ چلنا چاہے تو خدا اس کو زبردستی راست بیں اور راست رو نہیں بناتا بلکہ جدھر وہ خود جانا چاہتا ہے اسی طرف اس کو جانے کی توفیق دے دیتا ہے۔

اس خاص سلسلۂ کلام میں یہ بات جس مناسبت سے بیان ہوئی ہے وہ پچھلی تقریر اور بعد کی تقریر پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ یہ ایک طرح کی تنبیہ ہے جو نہایت موزوں طریقہ سے پچھلے بیان کا خاتمہ بھی قرار پا سکتی ہے اور آگے جو بیان آ رہا ہے اس کی تمہید بھی۔

ایک گذارش

خریدار حضرات جب بھی خط و کتابت کریں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ حوالہ نہ دینے کی صورت میں تعمیل ارشاد نہ ہو سکے گی۔

"مینجر"

مقالات

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی)

ترجمہ مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

حمد و صلوٰۃ کے بعد:

ایک وقت اللہ تعالیٰ نے میرے قلب میں ایک ایسی میزانِ حق و عدل کا القا فرمایا جس سے میں امت محمدیہ کے مابین واقع ہونے والے تمام اختلافات کے اسباب معلوم کر سکوں اور جان لوں کہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک حق کیا ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے مجھ کو وہ قدرتِ بیان عطا فرمائی جس سے کام لے کر میں اس مسئلہ کی ایسی وضاحت کر دوں کہ پھر کوئی شک اور اشکال باقی نہ رہ جائے۔ بعد ازاں مجھ سے یہ دریافت کیا گیا کہ صحابہ کرام اور ان کے بعد کے اکابرین ملت کے درمیان اختلاف کی — خاص کر احکام فقہیہ میں اختلاف کی — وجہ کیا ہے؟ میں وقت کی گنجائش اور سائل کی قوتِ فہم و حفظ کا لحاظ کرتے ہوئے اسی آن ان حقائق کا، جو اللہ تعالیٰ کی عنایت خاص سے مجھ پر کھولے گئے تھے، ایک حصہ بیان کرنے پر آمادہ ہو گیا اور اس مسئلہ پر ایک مفید رسالہ تیار ہو گیا جس کا نام میں نے "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" رکھا۔

دورِ نبوی میں فقہی مباحث کا فقدان

معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فقہ ایک فن کی طرح مدوّن نہیں تھی، اور نہ اس وقت احکام کے باب میں بحث کا یہ طریقہ تھا جو اب ہمارے فقہا میں رائج ہے کہ وہ اپنی انتہائی دماغی قابلیتیں صرف کر کے ایک ایک چیز کے علٰحدہ علٰحدہ ارکان و شرائط اور آداب، دلائل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، مسائل کی فرضی صورتیں سامنے رکھ کر ان پر بحث کرتے ہیں، جن چیزوں کی تعریف کی جا سکتی ہو ان کی منطقیانہ تعریف بیان کرتے ہیں، اور جن کا حصر بیان کیا جا سکتا ہو ان کا حصر واضح کرتے ہیں، وغیر ذٰلک۔ اس کے بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ آپ مثلاً وضو فرماتے اور صحابہ کرام آپ کا طریقۂ وضو دیکھ کر اسے اختیار کر لیتے۔ بغیر اس کے کہ حضور اس بات کی توضیح فرمائیں کہ یہ وضو کا رکن ہے اور فلاں چیز اس کے آداب میں سے ہے۔ اسی طرح آپ نماز پڑھتے، لوگ آپکے نماز پڑھنے کا ڈھنگ دیکھ لیتے اور اسی طرح خود پڑھنے لگتے۔ آپ نے حج ادا فرمایا، لوگوں نے آپکے حج کرنے کے طریقے اور مراسم دیکھے اور اسی طرح خود حج کرنے لگے۔ الغرض آنحضرت صلعم کا عام طریقہ تعلیم یہی تھا۔ آپ نے کبھی یہ توضیح نہیں فرمائی کہ وضو میں چار فرض ہیں یا چھ، اور نہ کبھی آپنے یہ خیال کیا کہ ہو سکتا ہے کہ کبھی کوئی آدمی اعضائے وضو کو لگاتار نہ دھوئے اس لیے اس طرح کے وضو کے ہونے یا نہ ہونے کا پیشگی حکم دے دینا چاہیے۔ اس قسم کی فرضی اور غیر واقعی صورتوں کے احکام کی بابت آپ نے شاذ و نادر ہی کبھی کچھ فرمایا ہے۔ دوسری طرف اصحاب رسول کا بھی حال یہ تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں کے

متعلق آنحضرت صلعم سے بہت کم سوال کرتے تھے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "میں نے اصحاب رسول سے بہتر کسی جماعت کو نہیں پایا۔ انھوں نے رسول خدا کی پوری زندگی میں آپ سے صرف تیرہ سوال کیے جو سب کے سب قرآن میں مذکور ہیں۔ مثلاً یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ (اے نبی یہ لوگ تم سے حرمت کے مہینوں میں جنگ کرنے کی بابت دریافت کرتے ہیں۔) اور یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ (تم سے حالت حیض کے احکام پوچھتے ہیں) وغیرہ۔" اس کے بعد حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ "صحابہ صرف انہی مسائل کو پوچھتے تھے جو ان کے لیے نفع رساں ہوتے۔" حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ "کسی ایسی بات کے متعلق سوال نہ کرو جو فی الواقع پیش نہ آئی ہو کیونکہ میں نے عمرؓ بن الخطاب کو اس شخص پر لعنت بھیجتے ہوئے سنا ہے جو اس طرح کے سوالات کرے۔" قاسم نے لوگوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "تم لوگ ایسی چیزوں کی بابت سوال کرتے ہو جن کی بابت ہم نے کبھی زبان استفسار نہیں کھولی۔ نیز تم ایسی باتوں کی کھود کرید کرتے ہو جن کے متعلق مجھے کوئی علم و واقفیت نہیں، اور اگر ہم کو ان کے بارے میں کوئی علم ہوتا تو (حسب فرمان نبویؐ[1]) ہم تمھیں ضرور بتا دیتے۔" عمر بن اسحاق کا قول ہے کہ "مجھ کو آدھے سے زائد اصحاب رسول سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے، میں نے اس گروہ سے بڑھ کر کسی گروہ کو اینچ پینچ سے خالی اور تشدد سے مجتنب نہیں پایا۔" عبادہ بن نسر کندی سے یہ فتویٰ پوچھا گیا کہ "اگر کسی عورت کا ایسی جگہ انتقال ہو جائے جہاں اس کا کوئی ولی نہ ہو تو اس کو غسل کیونکر دیا جائے گا؟" آپ نے جواب دیا کہ "میں ایسے لوگوں[2] سے ملا ہوں جو تمھاری طرح تشدد نہیں کرتے تھے نہ تم لوگوں کی طرح (فرضی) مسائل کے متعلق سوالات کرتے تھے۔"
(ان تمام آثار کو دارمی نے نقل کیا ہے)

الغرض آنحضرت صلعم کے زمانہ میں استفتاء اور افتا کا دستور صرف یہی تھا کہ لوگ پیش آمدہ واقعات کے متعلق آپ سے استفسار کرتے اور آپ ان کا حکم بیان فرما دیتے۔ اسی طرح معاملات و مقدمات آپ کے سامنے پیش ہوتے تو آپ ان کا فیصلہ کر دیتے۔ لوگوں کو اچھے کام کرتے دیکھتے تو ان کی مدح و منقبت فرماتے اور برے کام کرتے دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے

شیخین کا طرز عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ ساری باتیں بالعموم اجتماع عام میں ہوتی تھیں یہی وجہ ہے کہ جب حضرات شیخین (ابو بکرؓ و عمرؓ) کو کسی مسئلہ میں حکم شریعت معلوم نہ ہوتا تو وہ دوسرے صحابہ سے دریافت فرماتے کہ کیا تم میں سے کسی نے اس امر کے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان سنا ہے؟ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سامنے جب دادی (یا نانی) کی وراثت کا مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ "میں نے اس کے حصہ کے بارے میں رسول اللہ کا کوئی ارشاد نہیں سنا ہے، اس لیے میں اس کے متعلق اوروں سے پوچھتا ہوں۔" جب نماز ظہر آپ نے ادا کر لی تو لوگوں سے پوچھا کہ "کیا تم میں سے کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دادی کے حق وراثت کے بارے میں کچھ فرماتے سنا ہے؟" مغیرہؓ ابن شعبہ نے کہا کہ "ہاں! میں نے سنا ہے" پوچھا "کیا سنا ہے؟" جواب دیا کہ "رسول خدا نے جدہ کو میت کے مال کا چھٹا حصہ دیا ہے" حضرت ابو بکرؓ نے پھر پوچھا "یہ بات تمھارے سوا اور کسی کو بھی معلوم ہے؟" محمد بن مسلمہؓ نے کہا "مغیرہؓ صحیح فرماتے ہیں۔" یہ سن کر حضرت ابو بکرؓ نے اس عورت کو (جس کا معاملہ پیش تھا، اس کے پوتے یا نواسے کے

---

[1] آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ اس عالم کے منہ میں قیامت کے دن آگ کی لگام لگائی جائے گی جو کسی چیز کا علم رکھتا ہو مگر پوچھنے والے کو بتانے سے انکار کر دے۔

[2] مراد صحابہ کرام سے ہے۔ (مترجم)

ترکہ میں سے) چھٹا حصہ دے دیا۔ اسی طرح "غزہ" (جنین کے خوں بہا[۱]) کے بارے میں حضرت عمرؓ کا عام لوگوں سے استفسار کے بعد مغیرہ بن شعبہ کی روایت پر عمل پیرا ہونا اور وبا[۲] کے متعلق حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کے بیان کردہ ارشادِ نبوی کے مطابق فیصلہ کرنا۔ مجوسیوں[۳] کے معاملہ میں انہی عبدالرحمٰن ابن عوف کی بیان کی ہوئی حدیث پر اپنے فیصلہ کی بنیاد رکھنا، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ[۴] کا معقل بن یسار کی روایت، جو ان کی رائے کے بالکل مطابق نکلی سن کر خوش ہونا اور حضرت ابو موسیٰ اشعری[۵] کا فاروق اعظم کے دروازے سے واپس جانے کے بعد ان کا ابو موسیٰ سے اس حدیث کا دریافت کرنا جس کی بنا پر وہ ان کے دروازہ سے واپس چلے گئے تھے، اور پھر حضرت ابوسعید کا حضرت ابو موسیٰ کے حق میں شہادت دینا وغیرہ بے شمار واقعات مشہور و معروف اور صحیحین اور سنن کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

بنائے اختلاف مختصر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور مبارک بالعموم یہی تھا کہ آپ مسائل و احکام شرع مجامع عام میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ اب ہر صحابی نے آپ کی عبادت کے انہی طریقوں اور آپ کے انہی فتووں اور فیصلوں کو یاد کر لیا جن کو اسے دیکھنے اور سننے کا موقع نصیب ہوا، پھر ان میں سے ہر حکم کی، قرائن حال پر نظر ڈال کر، علت متعین کی اور موقع و محل کے ان قرائن و علامات کو سامنے رکھ کر جو اس کے نزدیک تعیین علت و مقصد کے لیے کافی اور اطمینان بخش تھے۔ اس نے کسی حکم کو اباحت پر محمول کیا، کسی کو استحباب پر اور کسی کو نسخ پر۔ اس باب میں ان لوگوں کا اعتماد صرف اپنے اطمینان قلب اور شرح صدر پر تھا، استدلال کے (پرپیچ منطقیانہ) طریقوں سے ان کے ذہن آشنا نہ تھے، جیسا کہ تم دیہاتی باشندوں کو دیکھتے ہو کہ وہ آپس کی گفتگووں کا مدعا سمجھتے جاتے ہیں (ان گفتگووں کے دوران میں استعمال کیے ہوئے) اشارات و کنایات اور تصریحات سے ان کے دلوں کو فہم مطالب کے سلسلے میں اس طرح طمانیت حاصل ہوتی جاتی ہے کہ ان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

۱؎ حضرت عمرؓ کے سامنے جنین کے خوں بہا کا مسئلہ آیا تو چونکہ آپ کو اس بارے میں کوئی نص شرعی معلوم نہ تھی اس لیے آپ نے صحابہ سے مشورہ اور استفسار کیا۔ مغیرہ ابن شعبہ نے فرمایا کہ "پیغمبر صلعم نے اس کا خوں بہا 'غزہ' مقرر کیا ہے"۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس کے مطابق فیصلہ دے دیا۔
"غزہ" کا مطلب یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کیا جائے، یا جنین کے ولی کو پچاس دینار یا پانچ سو درہم دیے جائیں۔

۲؎ حضرت عمرؓ کے واقعۂ سفر شام کی طرف اشارہ ہے جبکہ آپ شام پر حملہ آور ہونے کے لیے لشکر لیے جا رہے تھے اور راستہ میں معلوم ہوا کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی ہے تو لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے، کوئی بات طے نہیں ہو رہی تھی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے آ کر یہ روایت بیان کی کہ آنحضرت نے وبائی مقامات پر جانے سے منع فرمایا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا۔

۳؎ حضرت عمرؓ اپنے زمانۂ خلافت میں مجوسیوں سے جزیہ نہیں لیتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے یہ بتایا کہ آنحضرت ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیتے تھے تو آپ نے بھی ان پر جزیہ لگا دیا۔ ۴؎ یہ ایک ایسی عورت کا معاملہ ہے جس کا شوہر اس حال میں مر گیا تھا کہ ابھی نہ تو اس نے اس کا مہر مقرر کیا تھا نہ اس سے مقاربت کی تھی۔ اس واقعہ کی تشریح آگے آتی ہے۔ ۵؎ حضرت ابو موسیٰ حضرت عمرؓ کے دروازے پر گئے اور جب تین بار آواز دینے کے باوجود کوئی جواب اندر سے نہ ملا تو واپس چلے، چند قدم گئے ہوں گے کہ حضرت عمر نے خادم سے کہا کہ ان کو اندر بلا لو، مگر خادم نے باہر آ کر ابو موسیٰ کو دروازہ پر نہ پایا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو پکار کر بلوایا اور واپس جانے کی علت پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ "جب تین آوازیں دینے کے باوجود اجازت نہ ملے تو دروازہ سے ہٹ جاؤ"۔ حضرت عمر نے کہا کہ اپنی اس روایت پر کوئی گواہ لاؤ ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔ چنانچہ جب حضرت ابوسعید خدریؓ نے ابو موسیٰ کی توثیق کی تو حضرت عمرؓ نے اس کو تسلیم کر لیا۔ (مترجم)

آغاز اختلاف عہدِ رسالت تک تو لوگوں کا یہی حال رہا۔ اس کے بعد یہ حضرات مختلف اطراف و ممالک میں پھیل گئے اور ان میں سے ہر ایک الگ الگ خطۂ ارض میں عوام کا رہنما بن گیا۔ اب ان کے سامنے زندگی کے بے شمار واقعات اور مسائل پیش ہونے شروع ہوئے جن میں ان سے فتوے پوچھے جاتے تھے۔ ہر صحابی ان کے جواب میں اپنی مخصوص معلومات یا اپنے استنباط کے مطابق جوابات دیتا۔ اگر اس کو اپنے ذخیرۂ معلومات و استنباط میں کوئی چیز ایسی نہ ملتی جس سے وہ مسئلہ کا جواب دے سکتا تو اپنی رائے سے اجتہاد کرتا اور اس علت کو معلوم کرتا جس پر رسول اللہ صلعم نے اپنے منصوص احکام کی بنیاد رکھی تھی اور جس مقام پر اس کو وہ علت نظر آتی وہاں وہی حکم لگا دیتا۔ مگر ایسے قیاسات کرتے وقت یہ لوگ رسول خدا صلعم کے مقصد کا لحاظ کرنے میں اپنے مقدور بھر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ اب یہاں سے ان کے درمیان اختلاف کا آغاز ہوتا ہے جس کی مختلف بنیادیں تھیں :-

(۱) حدیث نبوی سے واقفیت اور عدم واقفیت کا اختلاف ایک یہ کہ ایک صحابی نے رسول اکرم سے کسی معاملہ کا فیصلہ یا کوئی فتویٰ سن رکھا تھا لیکن دوسرا اس سے نابلد تھا اس لیے اس نے اس امر میں اپنے اجتہاد سے کام لیا۔ پھر اس کی بھی چند صورتیں تھیں:

اولاً یہ کہ یہ اجتہاد حدیث نبوی کے عین مطابق نکلا۔ جس کی مثال وہ روایت ہے جس کو امام نسائی وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود سے ایک ایسی عورت کے (حق مہر وغیرہ کے) بارے میں استفسار کیا گیا جس کا شوہر مہر مقرر کرنے اور اس سے مقاربت کرنے سے پہلے ہی وفات پا گیا تھا۔ آپ نے جواب دیا کہ ایسے معاملہ میں پیغمبر صلعم کا کوئی فیصلہ مجھے معلوم نہیں۔ لوگ مہینہ بھر ان کے ہاں آتے اور اصرار کرتے رہے کہ کوئی حکم بیان کر دیں۔ تب انھوں نے اجتہاد کر کے یہ فیصلہ دے دیا کہ اس عورت کو اتنا مہر ملنا چاہیے جتنا اس کی ہم مرتبہ عورتوں کا ہوا کرتا ہے۔ نہ کم نہ زیادہ، نیز اس کو عدت گذارنی ہوگی اور شوہر کے ترکہ میں سے حصہ پائے گی۔ یہ سن کر معقل بن یسارؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور بطور شہادت فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے ہمارے قبیلہ کی ایک عورت کے بارے میں ایسا ہی حکم دیا تھا۔" حضرت ابن مسعودؓ کو یہ معلوم کر کے اتنی مسرت ہوئی کہ شرف باسلام ہونے کے بعد سے اب تک ایسی مسرت ان پر کبھی بھی نہ طاری ہوئی تھی۔

ثانیاً یہ کہ دو صحابیوں میں کسی مسئلہ کے متعلق بحث ہوئی اور اس سلسلہ میں اس طریقہ سے کوئی حدیث نبوی سامنے آئی جس سے اس کی صحت کا ظن غالب ہوتا تھا۔ اس لیے مجتہد نے اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر حدیث رسول کو اختیار کر لیا۔ مثال کے طور پر اس روایت کو لے لو جس کو ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ کا خیال تھا کہ جو شخص طلوع صبح کے وقت جنبی رہا اس کا روزہ نہیں ہوتا، لیکن جب کچھ ازواج مطہرات نے رسول اللہ کا عمل اس خیال کے خلاف بیان کیا تو حضرت ابوہریرہؓ نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا۔

ثالثاً یہ کہ اجتہاد کرنے والے صحابی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تو پہنچی مگر ایسے قابل اطمینان طریقے سے نہیں پہنچی کہ اس کے صحیح ہونے کا گمان غالب ہوتا، اس لیے مجتہد نے حدیث کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہوئے اپنے اجتہاد ہی پر عمل کیا۔ اس کی مثال فاطمہ بنت قیس کی اس حدیث سے ملتی ہے جس کو اصحاب اصول (یعنی صحاح ستہ کے مولفین) نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے کہ "فاطمہ نے حضرت عمرؓ کے روبرو آکر کہا کہ "مجھ کو تین طلاقیں دی گئی تھیں، رسول اللہ صلعم نے نہ تو مجھ کو زمانہ عدت کا نفقہ دلایا اور نہ مکان"۔ آپ نے اس کی گواہی ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ ہم ایک عورت کے قول کی بنا پر کتاب اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے

(حاشیہ صفحہ ۲۱۲ پر)

جس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہے یا غلط۔ تین طلاقیں پانے والی عورت کو نفقہ بھی ملنا چاہیے اور قیام گاہ بھی۔" نیز فاطمہ بنت قیس کے قول "لا نفقة لها ولا سکنی" کو سن کر حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ "فاطمہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اللہ کا خوف نہیں کرتی۔"

دوسری مثال بخاری و مسلم کی اس روایت میں موجود ہے کہ "عمرؓ بن خطاب کا خیال تھا کہ اگر جُنبی کو غسل کے لیے پانی نہ ملے تو وہ تیمم سے پاکی حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت عمار بن یاسر نے ان کے سامنے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم کا ہم سفر تھا، مجھ کو غسل کی حاجت ہو گئی، لیکن پانی نہ پا سکا، اس لیے (تیمم کی خاطر) دھول میں لوٹ پوٹ لیا۔ پھر آنحضرت صلعم سے اپنی اس کارروائی کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم کو صرف اتنا کر لینا کافی تھا، (یہ کہتے ہوئے) آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے اور ان کو اپنے منہ اور اپنے ہاتھوں پر مل لیا۔ حضرت عمرؓ نے عمارؓ کے اس بیان کو قبول نہیں کیا اور کسی پوشیدہ ضعف کی بنا پر جو ان کو اس روایت میں نظر آیا، ان کے نزدیک یہ روایت حجت نہیں ٹھیری۔ اگرچہ آگے چل کر دوسرے طبقہ میں یہ حدیث بہت سے طریقوں سے مشہور ہو گئی اور اس کے ضعیف ہونے کا گمان ماند پڑ گیا اس لیے لوگ اس پر عمل پیرا ہو گئے۔

رابعاً یہ کہ اجتہاد کرنے والے صحابی کو حدیث سرے سے پہنچی ہی نہیں۔ مثلاً مسلم کی یہ روایت کہ "حضرت ابن عمرؓ عورتوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ وہ جب غسل کریں تو اپنے سروں کے بال کھول لیں۔ حضرت عائشہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ تعجب ہے ابن عمر پر کہ وہ عورتوں کو بال کھول ڈالنے کا حکم دیتے ہیں! اگر ایسا ہی ہے تو سیدھے سے یہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ عورتیں اپنے سر ہی منڈا ڈالیں! حالانکہ میں اور رسول اللہ صلعم ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے اور میں اپنے بالوں کے معاملہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کرتی تھی کہ ان پر تین بار پانی بہا دیتی تھی (اور کبھی ان کو کھولتی نہیں تھی)۔

دوسری مثال امام زہری کے بیان کردہ اس واقعہ میں ہے کہ "ہند کو یہ اطلاع نہ تھی کہ آنحضرتؐ نے مستحاضہ کو استحاضہ کی حالت میں بھی نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے، اس لیے وہ اس حالت میں نماز نہ پڑھتیں اور (ترک نماز کے غم سے) رویا کرتیں۔

(حاشیہ صفحہ ۲۰۰) لہ قرآن مجید کی آیت وَلَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ اور آیت اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلقہ عورت کو زمانۂ عدت تک گھر سے نہیں نکالنا چاہیے بلکہ شوہر پر لازم ہے کہ اتنے وقت کے لیے اس کے لیے مکان مہیا کرے۔ پھر آیت وَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ عورت کو زمانۂ عدت تک نفقہ بھی ملنا چاہیے۔ یہ آیات اپنے مفہوم میں بالکل مطلق اور عام ہیں، ان میں طلاق رجعی والی عورت کی کوئی تخصیص موجود نہیں ہے، اس لیے ان کا حکم ہر قسم کی مطلقہ عورتوں کے حق میں عام اور نافذ العمل ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے قرآن کے اسی عموم کو سامنے رکھتے ہوئے فاطمہ بنت قیس کی روایت رد کر دی کیونکہ وہ آیات قرآنی کے خلاف پڑتی تھی۔

یہیں سے ایک بات اور بھی واضح ہو گئی۔ ظاہر ہے فاطمہ صحابیہ تھیں۔ اصول حدیث کی رو سے "الصحابة کلهم عدول" سے خارج نہ تھیں، لیکن اس کے باوجود جب قرآن کے متبادر مفہوم سے ان کی روایت ٹکرائی تو حضرت عمرؓ نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ احادیث میں صرف سند ہی قابل لحاظ شے نہیں ہے بلکہ متن بھی دیکھا جانا چاہیے۔ سند بالکل سلسلۃ الذہب ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی حدیث میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ سند کی صحت، صحت حدیث کو مستلزم نہیں۔ آخر فاطمہ بنت قیس کی روایت میں ضعف اسناد کا کون سا احتمال تھا۔ (مترجم)

(۲) فعل رسول کی تعیین نوعیت میں اختلاف

اختلاف صحابہ کی دوسری اساس یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کام کرتے تو سب نے دیکھا (مگر افکار بشری میں فطری تفاوت کی وجہ سے اس فعل کی نوعیت کی تعیین میں اختلاف ہوگیا) پھر کسی نے تو اس فعل رسول کو عبادت سمجھا اور کسی نے اس کو صرف اباحت پر محمول کیا۔ مثلاً "تحصیب" یعنی سفر حج میں ابطح (نامی وادی مکہ) میں آنحضرت کا اترنا۔ اس کو اصحاب اصول نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلعم اس جگہ نزول فرما ہوئے تھے۔ مگر یہ نزول حضرت ابو ہریرہؓ اور ابن عمرؓ کے نزدیک بحیثیت عبادت تھا، اس لیے یہ لوگ اس کو حج کی سنتوں میں شمار کرتے ہیں، لیکن حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کے خیال میں اترنا محض بطور اتفاق تھا نہ کہ کسی سنت کی ادائگی کی حیثیت سے۔

دوسری مثال:۔

"جمہور کے نزدیک خانہ کعبہ کا طواف کرتے وقت رَمَل، یعنی اکڑ اکڑ کر چلنا سنت ہے، لیکن حضرت ابن عباس کا فرمانا یہ ہے کہ نبی صلعم نے جو رمل کیا تھا وہ محض اتفاقی طور پر اور عارضی سبب سے تھا۔ یعنی مشرکین مکہ کا یہ طعن کہ "مسلمانوں کو مدینہ کے بخار نے بالکل چور کر ڈالا ہے"۔ (اسی طعن کے جواب میں پیغمبر صلعم نے مسلمانوں کو اکڑ کر چلنے کا وقتی حکم دیا تھا ورنہ) یہ فعل حج کی کوئی مستقل سنت نہیں ہے۔

(۳) وہم تعبیر کا اختلاف تیسری اساس اختلاف یہ ہے کہ افعال رسول کے بیان کرنے میں لوگوں نے مختلف گمانوں سے کام لیا۔ مثلاً:۔

"رسول خدا صلعم نے حج ادا فرمایا اور تمام صحابہ نے اس کا مشاہدہ کیا، لیکن اس حج کی نوعیت بیان کرتے وقت کسی نے کہا کہ آنحضرت صلعم نے حج تمتعؔ کیا تھا، کسی نے کہا آپ نے حج قرانؔ ادا کیا تھا اور کسی کا خیال یہ تھا کہ آپ کا حج حج افرادؔ تھا۔"

دوسری مثال، حضرت سعیدؓ ابن جبیر کی روایت، جس کو ابو داؤد نے نقل کیا ہے کہ:۔

"میں نے (حضرت سعیدؓ نے) عبداللہ ابن عباسؓ سے کہا کہ اے ابو العباسؓ! اس اختلاف کو دیکھکر مجھے حیرانی ہوتی ہے جو رسول اللہ صلعم کے احرام حج باندھ لینے کے بعد تلبیہؔ کرنے کے متعلق اصحاب رسول میں موجود ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں اس واقعہ کی حقیقت سب سے بہتر جانتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے صرف ایک ہی حج ادا فرمایا اس لیے لوگوں میں اس کے متعلق (قدرتی طور پر) اختلاف ہوگیا۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم حج کی خاطر مدینہ سے چلے اور جب مسجد ذی الحلیفہ میں آپ نے دوگانۂ احرام ادا فرمایا تو اسی جگہ حج کا احرام باندھا اور فوراً تلبیہ کیا۔ اس تلبیہ کی آواز کچھ لوگوں کے کانوں تک پہنچی جنھوں نے اس کو یاد کر لیا۔ اس کے بعد آپ اونٹنی پر سوار ہوگئے، جب اونٹنی آپ کو لے کر اٹھی تو آپ نے پھر تلبیہ کیا اور اس تلبیہ کو بھی کچھ دوسرے لوگوں نے سنا۔ بات یہ تھی کہ لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں خدمت رسالت میں چلے آتے

---

۵۱ حج تمتع کی شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی حج کے دنوں میں جا کر عمرہ ادا کرے اور سر منڈا کر احرام کھول دے۔ پھر ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ کو از سر نو حج کا احرام باندھے اور حج ادا کرے۔ ۵۲ قران کی شکل یہ ہے کہ آدمی عمرہ اور حج دونوں کا احرام بیک وقت باندھے اور دونوں کو ادا کر کے احرام کھول دے۔

۵۳ افراد مطلق حج ادا کرنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ عمرہ نہ کیا جائے۔

۵۴ تلبیۂ حج یہ ہے:۔ لبیک، اللھم لبیک، لبیک، لاشریک لک لبیک، ان الحمد والنعمۃ لک والملک، لاشریک لک۔ (مترجم)

تھے، سو جب ایک گروہ نے اونٹنی کے کھڑے ہونے کے وقت آپ کو تلبیہ کرتے سنا تو یہ سمجھ بیٹھا کہ رسول اللہ صلعم نے تلبیہ صرف اس وقت کیا جب ناقہ آپ کو لے کر اٹھی۔ پھر آنحضرت اس جگہ سے آگے بڑھے، جب بیدا (نامی مقام) کی بلندی پر چڑھے تو آپ نے پھر تلبیہ کیا۔ کچھ لوگوں نے آپ کو یہ تلبیہ کرتے ہوئے سنا اور یہ خیال کر بیٹھے کہ آپ نے تلبیہ صرف اس وقت کیا جب بیدا کی بلندی پر چڑھ رہے تھے۔ حالانکہ بخدا آپ نے اپنی جائے نماز ہی پر حج کی نیت کر لی تھی اور جب آپ کو لے کر اونٹنی کھڑی ہوئی اس وقت بھی آپ نے تلبیہ کیا اور جب بیدا کی بلندی پر چڑھے اس وقت بھی کیا۔

(۴) سہو و نسیان کا اختلاف اختلاف صحابہ کی چوتھی اساس سہو و نسیان ہے۔ جس کی مثال حضرت ابن عمر کے متعلق اس روایت میں موجود ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ آنحضرت صلعم نے ایک عمرہ ماہ رجب میں کیا ہے۔ حضرت عائشہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ ابن عمر کو سہو ہو رہا ہے (آنحضرت نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا)

(۵) ضبط مدعائے حدیث کا اختلاف پانچویں اساس، ارشاد نبوی کے مقصود کے فہم و ضبط کا اختلاف ہے۔ مثلاً جب حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت صلعم سے یہ روایت بیان کی کہ "میت کے پسماندگان کے نوحہ کرنے سے اس پر عذاب ہوتا ہے" حضرت عائشہ نے ان کے یہ الفاظ سنے تو فرمایا کہ "ابن عمر نے ارشاد رسالت کو اس کے اپنے صحیح موقع و محل اور مدعا کے ساتھ محفوظ نہیں رکھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم ایک یہودی عورت کی قبر سے گزرے جس کے اعزہ رو دھو رہے تھے۔ آپ نے فرمایا یہ لوگ یہاں اس کا نوحہ و ماتم کر رہے ہیں اور وہ قبر میں مبتلائے عذاب ہے۔"

(دیکھو کہ واقعہ کس طرح ایک خاص میت سے متعلق تھا لیکن قول رسول کے اس خصوصی محل کو ذہن سے نکال دینے کے باعث) ابن عمرؓ اعزہ کی گریہ وزاری ہی کو میت پر عذاب کی علت گمان کر بیٹھے اور اس بات کو انھوں نے ہر میت کے لیے ایک عام اصول کی حیثیت دیدی۔

(۶) تعیین علت کا اختلاف چھٹی اساس صحابہ کا احکام شرع کی تعیین علت میں مختلف الخیال ہو جانا ہے۔ جیسے جنازہ کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا مسئلہ۔ بعض صحابہ کا کہنا یہ ہے کہ ایسا فرشتوں کی تعظیم میں کیا جاتا ہے۔ (کیونکہ ہر جنازہ کے ساتھ فرشتے ہوتے ہیں) تو اس خیال کے مطابق ہر جنازہ کے لیے کھڑا ہو جانا چاہیے، خواہ مومن کا جنازہ ہو یا کافر کا۔ کسی کا خیال یہ ہے کہ یہ قیام، موت کے ہول کی وجہ سے ہے، تو اس صورت میں بھی یہ حکم قیام ہر جنازہ کے لیے عام ہوگا۔ لیکن کچھ حضرات کا فرمانا یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی کا جنازہ آنحضرت صلعم کے قریب سے گذرا تو آپ کو اس بات سے تنفر ہوا کہ ایک یہودی لاش میرے سر سے اونچی ہو کر گذرے، اس لیے آپ کھڑے ہو گئے۔ اگر اس علت قیام کو صحیح مانا جائے تو یہ قیام صرف جنازۂ کفار کے لیے مخصوص ہوگا۔

(۷) مطابقت احکام مختلفہ میں اختلاف ساتویں اساس، صحابہ کا وہ اختلاف رائے ہے جو دو مختلف احکام شرع کے درمیان مطابقت دینے میں پیش آیا۔ مثلاً یہ کہ جنگ خیبر کے موقع پر آنحضرت نے متعہ کی اجازت دی، بعد میں اس کی ممانعت کر دی، پھر جنگ اوطاس کے زمانہ میں دوبارہ یہ رخصت عطا فرمائی، اس کے بعد پھر اس سے روک دیا۔ اب حضرت ابن عباس کا یہ کہنا ہے کہ ضرورت کی بنا پر یہ اجازت دی گئی تھی اور جب ضرورت جاتی رہی تو یہ اجازت بھی واپس لے لی گئی، مگر حکم اپنی جگہ باقی ہے۔ لیکن جمہور کا یہ کہنا ہے کہ یہ رخصتِ متعہ بطور اباحت تھی جس کو ممانعت نے ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔

دوسری مثال :-

" رسول اکرم صلعم نے استنجا کرتے وقت قبلہ رو ہونے سے منع فرمایا ہے۔ اس کے متعلق بعض صحابہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ حکم بالکل عام اور غیر منسوخ ہے۔ لیکن حضرت جابرؓ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وصال سے ایک سال قبل قبلہ کی طرف منہ کرکے پیشاب کرتے دیکھا، اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ آپ کے اس فعل نے اس پہلی ممانعت کو منسوخ کر دیا۔ اسی طرح حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرتؐ کو قبلہ کی طرف پشت اور شام کی طرف منہ کرکے قضائے حاجت فرماتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے انھوں نے آنحضرت کے اس فعل سے ان لوگوں کے قول کی تردید فرمائی (جو کہتے تھے کہ قبلہ کی طرف پشت کرکے استنجا کرنا شرعاً ممنوع ہے) پھر کچھ لوگوں نے دونوں روایتوں کو جمع کر دینے کی سعی کی۔ سو شعبی وغیرہ نے یہ رائے قائم کی کہ نہی کھلے میدانوں سے مخصوص ہے۔ ورنہ اگر آدمی پاخانہ کے اندر ہو تو اس کے لیے قبلہ کی طرف پشت یا رخ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور بعض دوسرے حضرات اس طرف گئے ہیں کہ آنحضرت کا قول (جس میں نہی موجود ہے) اپنی جگہ بالکل قائم و ثابت ہے اور اس کا حکم عام ہے۔ رہ گیا آپ کا فعل، سو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے مخصوصات میں سے ہو اس طرح یہ فعل، ارشاد نبوی کا نہ تو ناسخ ہوگا نہ مخصص۔

عہد تابعین | الغرض اس طرح صحابہ کرام کے مذاہب مختلف ہو گئے۔ پھر یہی اختلافات وراثتاً تابعین تک پہنچے۔ ہر تابعی کو جو کچھ مل سکا اسی کو اس نے اپنا لیا اور آنحضرتؐ کی جو حدیثیں اور صحابہ کے جو مذاہب اس نے سنے ان کو محفوظ اور ذہن نشین کر لیا۔ اور جو مختلف اقوال اس کے سامنے آئے اس نے اپنی فہم کی حد تک ان میں مطابقت پیدا کی اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ بعض اقوال ان کی نگاہوں میں بالکل ہی ناقابل اعتنا ہو کر رہ گئے، اگرچہ وہ اجلۂ صحابہ سے مروی تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق و ابن مسعودؓ کا یہ قول کہ جنابت کے لیے تیمم نہیں ہے۔ تابعین تک پہنچا مگر ان احادیث کی بنا پر ان کے نزدیک وہ کوئی اہمیت نہ حاصل کر سکا۔ جو عمارؓ اور عمران بن حصین وغیرہ اصحاب سے مروی ہو کر مشہور ہو چکی تھیں۔ پس اس حالت میں قدرتی طور پر علمائے تابعین میں سے ہر ایک کا علٰحدہ مذہب ہو گیا اور مختلف شہروں میں مختلف ائمہ کی علٰحدہ علٰحدہ امامتیں قائم ہو گئیں مثلاً مدینہ میں سعید ابن مسیب اور سالم ابن عبد اللہ عوام کے مرجع و امام بن گئے، پھر ان کے بعد زہری اور قاضی یحییٰ ابن سعید اور ربیعہ ابن عبد الرحمٰن نے یہ حیثیت حاصل کی۔ مکہ میں عطا ابن ابی رباح اور کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی نے مسند امامت سنبھالی۔ اسی طرح حسن بصری بصرہ میں، طاؤس بن کیسان یمن میں اور مکحول شام میں پیشوائے دین اور ترجمان شرع تسلیم کیے گئے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے کچھ دلوں میں ان حضرات کے علوم و معارف کی پیاس پیدا کی اور انھیں ان علوم کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ان علمائے کبار سے رسول اللہ کی حدیثیں صحابہ کے اقوال و فتاوی اور خود ان کے اپنے مذاہب اور تحقیقات سنے کر جمع کیں۔ پوچھنے والوں نے ان سے فتوے پوچھے (زندگی کے بے شمار) مسائل ان کے سامنے آئے اور کتنے ہی معاملات ان کے روبرو پیش ہوئے۔ (جن میں انھیں فتوے دینے پڑے)

تدوین فقہ کی ابتدا | سعید ابن مسیب اور ابراہیم نخعی وغیرہ نے باقاعدہ فقہ کے تمام ابواب جمع کیے۔ ہر باب میں وہ اپنے کچھ اصول رکھتے تھے جن کو انھوں نے سلف سے حاصل کیا تھا۔

سعید ابن مسیب اور ان کے تلامذہ اس امر کے قائل تھے کہ حرمین کے باشندے تفقہ میں سب سے بلند مقام رکھتے ہیں

اس لیے ان کے مذہب کی بنیاد حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے فتاویٰ اور احکام نیز حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے فتووں اور قضاۃ مدینہ کے فیصلوں پر قائم ہے۔ چنانچہ جہاں تک اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق عطا فرمائی انھوں نے ان احکام اور فتاویٰ کو جمع کیا۔ پھر ان پر بصیرت اور تحقیق کی نگاہ ڈال کر ان کا جائزہ لیا، جس شے پر علمائے مدینہ کا اتفاق نظر آیا اس پر تو پوری مضبوطی سے جم گئے، اور جس چیز میں ان کا اختلاف دکھائی دیا اس کے متعلق وہ قول اختیار کر لیا جو زیادہ قوی اور راجح تھا۔ یہ قوت اور راجحیت خواہ کسی بنا پر ہو، چاہے اس بنا پر کہ یہ اکثر علما کا اختیار کردہ قول ہے، یا اس بنا پر کہ وہ کسی مضبوط قیاس یا کتاب وسنت کے کسی صریح استنباط کے موافق پڑتا ہے، یا کسی اور بنا پر۔ اور جب ان لوگوں کو علمائے مدینہ سے حاصل کیے ہوئے مجموعۂ فتاویٰ میں کسی مسئلہ کا جواب نہ ملتا تو ان کے فرمودات سے استنباط کرتے اور ان کے اقوال کے اشارات اور مقتضیات کا سراغ لگاتے۔ اس طرح ان کے ہاں ہر ہر باب کے متعلق مسائل کا انبار لگ گیا۔

ابراہیم نخعی اور ان کے تلامذہ کا خیال تھا کہ عبداللہ ابن مسعودؓ اور ان کے فیض یافتگان فقاہت میں سب سے ممتاز ہیں جیسا علقمہ نے مسروق سے کہا تھا کہ "کیا کوئی صحابی عبداللہ ابن مسعودؓ سے بھی بڑا فقیہ ہے؟" نیز امام ابوحنیفہ نے امام اوزاعی سے فرمایا کہ "ابراہیم نخعی، سالم ابن عبداللہ سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر عبداللہ ابن عمر کو صحابیت کا شرف حاصل نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ علقمہ ان سے زیادہ فقیہ ہیں۔ رہے عبداللہ ابن مسعودؓ تو وہ تو عبداللہ ابن مسعود ہی ہیں، ان کا کیا پوچھنا۔" ان حضرات کے مسلک فقہی کی بنیاد حضرت عبداللہ ابن مسعود اور حضرت علی کے فتووں اور فیصلوں پر، نیز قاضی شریح وغیرہ قضاۃ کوفہ کے فیصلوں پر ہے۔ ابراہیم نخعی نے اپنے مقدور بھر ان احکام و فتاویٰ کو اکٹھا کیا اور ان کے ساتھ وہی طرز عمل اختیار کیا جو سعید بن مسیب وغیرہ نے علمائے مدینہ کے آثار و اقوال کے متعلق اختیار کیا تھا، نیز اس ذخیرہ سے اسی طرح مزید مسائل کی تخریج کی جس طرح انھوں نے کی تھی۔ انجام کار ان کے پاس بھی فقہ کے ایک ایک باب میں بے شمار مسائل منضبط ہو گئے۔

سعید ابن مسیب فقہائے مدینہ کے نفس ناطقہ اور ان میں حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابوہریرہ کی روایتوں کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ اور ابراہیم نخعی فقہائے کوفہ کے ترجمان۔ جب یہ دونوں حضرات کسی کی طرف منسوب کیے بغیر کوئی مسئلہ بیان کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ فی الواقع وہ مسئلہ کسی کی طرف منسوب نہیں اور بہرحال ان کا اپنا ہی اجتہاد ہے، بلکہ ایسے مسائل بالعموم کسی نہ کسی فقیہ سابق سے اشارۃً یا صراحۃً ضرور منسوب ہوتے ہیں۔ بالآخر یہ دونوں اپنے اپنے قرب و جوار کے فقہا کا مرکز بن گئے جنھوں نے ان سے فقہ کا علم حاصل کیا، اس میں تفکر کیا اور اس سے مزید مسائل اور جزئیات نکالے۔

مذاہب فقہا کے اسباب اختلاف

تبع تابعین کا دور عہد تابعین کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے خدام علم دین کا ایک گروہ پیدا کر دیا تاکہ وہ وعدہ پورا ہو جو اللہ کے رسول کی زبان سے اس علم کے متعلق نکلا تھا کہ "آنے والی نسلوں میں سے ہر نسل کے عادل لوگ اس علم کے حامل ہوں گے۔" چنانچہ ان خدام نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے ان علمائے تابعین سے، جن سے وہ مل سکے، وضو، غسل، نماز، حج، نکاح، بیع و شرا وغیرہ ان تمام مسائل کے جو زندگی میں عام طور سے پیش آتے ہیں، مشروع طریقے اخذ کیے، رسول خدا کی حدیثیں نقل کیں، مختلف شہروں

... قاضیوں کے فیصلے اور مفتیوں کے فتوے جمع کئے، مسائل دریافت کیے اور ان سارے امور میں بطور خود اجتہاد کیا، پھر ایک گروہ کے پیشوا اور امور شرعیہ میں مسند قرار پا گئے۔ یہ لوگ بھی اپنے شیوخ کے نہج پر چلے اور سلف کے اقوال و فتاویٰ کے اشارات اور مقتضیات معلوم کرنے میں پوری دیدہ ریزی سے کام لیا۔ لوگوں کو فتوے دیے، احکام سنائے، روایتیں بیان کیں اور علم سکھائے۔

ان علماء کا طرز فکر و استدلال | اس طبقہ کے علماء کا طرز فکر بالکل ایک ہے جس کی اجمالی تشریح یہ ہے کہ:-

(۱) مسند اور مرسل[1] دونوں ہی قسم کی احادیث قابل تمسک ہیں۔

(۲) صحابہ و تابعین کے اقوال سے شرعی استدلال ہو سکتا ہے کیونکہ ان بزرگوں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ ان کے اقوال کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں: یا تو وہ فی نفسہٖ رسول اللہ صلعم سے نقل کی ہوئی حدیثیں ہیں جن کو انھوں نے (بعض مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے) مختصر کرکے موقوف[2] بنا لیا۔ چنانچہ جب ابراہیم نخعی نے آنحضرت کی محاقلہ[3] اور مزابنہ[4] سے ممانعت والی روایت بیان کی تو ان سے کہا گیا کہ کیا آپ کو اس کے سوا رسول اللہ کی کوئی حدیث (مرفوع) یاد نہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ "یاد کیوں نہیں ہے مگر میں حدیث مرفوع بیان کرنے کے مقابلہ میں یوں کہنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں کہ "عبد اللہ نے یہ فرمایا ہے" یا "علقمہ کا یہ قول ہے"۔ اسی طرح شعبی سے جب ایک حدیث کے متعلق استفسار کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ اس کی سند کو براہ راست پیغمبر صلعم تک پہنچایا جاتا ہے تو انھوں نے جواب دیا "ایسا کرنا ٹھیک نہیں بلکہ ہم کو زیادہ مناسب (اور محتاط) طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سند روایت کو صحابہ تک پہنچا کر چھوڑ دیا جائے تاکہ اگر اس کے الفاظ میں کوئی کمی بیشی ہو گئی ہو تو وہ آنحضرت کی طرف منسوب نہ ہو سکے بلکہ صحابہ ہی پر ختم ہو جائے"۔ یا یہ اقوال کتاب و سنت کے نصوص سے ان کے اپنے استنباط کیے ہوئے احکام ہیں۔ یا پھر وہ ان کی اپنی اجتہادی رائیں ہیں (لیکن اس استنباط اور اجتہاد کے سلسلہ میں یہ بھولنا نہ چاہیے کہ) یہ نفوس قدسیہ ان امور میں طرز عمل کی جو خوبی اور فکر و رائے کی جو درستگی رکھتے تھے اس میں بعد کے آنے والے حضرات ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، نیز وہ ان سے باعتبار زمانہ مقدم اور باعتبار علم افضل بھی تھے۔ اس لیے ان کے اقوال پر عمل کرنا کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس میں دو رائیں ہوتیں، بجز اس صورت کے جبکہ ان میں خود اختلاف رائے ہو جائے اور حدیث نبوی ان کے اقوال کے بالکل مخالف واقع ہو۔

(۳) اگر کسی مسئلہ میں احادیث باہم مختلف ہوتیں تو یہ حاملین علم دین اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرتے۔ اگر وہاں یہ نظر آتا کہ صحابہ نے کسی حدیث کو منسوخ یا قابل تاویل قرار دیا ہے، یا نسخ و تاویل کی کسی تصریح کے بغیر ہی اس کے ترک کر دینے اور اس پر عمل نہ کرنے پر متفق الرائے ہو گئے ہیں ——— کہ اس کا مطلب بھی دراصل حدیث کو ضعیف یا منسوخ یا مأوّل ہی قرار دینا ہے ——— تو ان تمام صورتوں میں یہ علماء اقوال صحابہ کا اتباع کرتے اور اس حدیث کو وہی حیثیت اور وزن دیتے جو صحابہ کے یہاں پاتے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو کتے کے جھوٹے برتن کا حکم بیان کرنے والی حدیث[5] کے متعلق حضرت امام مالک کے منہ سے نکلی تھی کہ "یہ حدیث

---

[1] مسند وہ حدیث ہے جس کی سند بیان کی جائے اور مرسل وہ جس کی سند بیان کیے بغیر کوئی تابعی یا تبع تابعی یوں کہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا یا ایسا کیا ہے۔

[2] موقوف، مرفوع کے بالمقابل حدیث کی ایک قسم کا نام ہے۔ مرفوع وہ روایت ہے جس میں تصریح ہو کہ حضور نے ایسا فرمایا ہے، اور موقوف وہ جس میں صحابی ایک بات کہے اور صراحت کے ساتھ اسے حضور کی طرف منسوب نہ کرے۔ [3] محاقلہ کے معنی ہیں کہ خوشوں سمیت گندم کو صاف کی ہوئی گندم کے عوض بیچا جائے یا کچی کھیتی بیچنا۔

[4] مزابنہ کے معنی ہیں درخت پر لگی ہوئی تر کھجوروں کو توڑی ہوئی خشک کھجوروں کے عوض بیچنا۔ [5] حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو سات بار دھوؤ، اس کے بعد ایک بار مٹی سے مانجھ کر صاف کرو۔ (مترجم)

روایت تو ہوئی ہے مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔" اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اس پر فقہا کو عمل کرتے ہوئے نہیں پایا۔

(۴) اگر صحابہ اور تابعین کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا تو ہر عالم اس رائے اور مسلک کو اختیار کرتا جو اس کے اپنے شہر کے علماء اور اس کے شیوخ کا مسلک ہوتا کیونکہ وہ ان کے اقوال کے سقم و صواب سے زیادہ باخبر اور ان اقوال سے مناسبت رکھنے والے اصولوں کا بہتر رازداں ہوتا، نیز اس لیے کہ اس کا دل اپنے اساتذہ کے فضل و کمال اور تبحر علمی سے زیادہ متاثر ہوتا چنانچہ حضرت عمرؓ، عثمانؓ، ابن عمرؓ، عائشہ صدیقہؓ، ابن عباسؓ، زید بن ثابتؓ وغیرہ صحابہ عظام اور ان کے شاگردانِ جلیل مثلاً سعید ابن مسیب (جو حضرت عمر کے فیصلوں اور حضرت ابوہریرہ کی روایتوں کے سب سے بڑے حافظ تھے) اور عروہ، سالم، عطار، عکرمہ اور عبیداللہ ابن عبداللہ وغیرہ کا مذہب اہل مدینہ کے لیے دوسرے مذاہب کی بہ نسبت زیادہ قابل قبول و مستحق اتباع ٹھیرا۔ اس وجہ سے بھی کہ آنحضرت نے مدینہ کے بڑے فضائل[1] بیان فرمائے ہیں اور اس سبب سے بھی کہ مدینہ ہر زمانہ میں فقہا اور علماء کا مرکز رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک علماء مدینہ کی شاہراہ سے ہٹ کر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتے اور ان کے متعلق یہاں تک مشہور ہے کہ وہ اہل مدینہ کے اجماع کو حجت شرعی مانتے تھے۔ اسی طرح امام بخاری نے اپنی کتاب میں ایک باب باندھا ہے جس کا نام ہے "باب فی الاخذ بما اتفق علیہ الحرمان" یعنی جس بات پر اہل مکہ اور اہل مدینہ دونوں کا اتفاق ہو اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔ اس کے بالمقابل حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کے تلامذہ کا مذہب اور حضرت علی اور قاضی شریح اور شعبی کے فیصلے اور ابراہیم نخعی کے فتاوی اہل کوفہ کی نگاہ میں دوسرے اقوال و مذاہب کی بہ نسبت زیادہ مختار اور لائق اتباع قرار پائے۔ چنانچہ یہی بنائے ترجیح تھی جس کے اثر کے تحت علقمہ نے تشریک[2] کے مسئلہ میں مسروق کو زید بن ثابت کے قول کی طرف مائل دیکھ کر یہ الفاظ کہے تھے کہ "کیا کوئی صحابی عبداللہ بن مسعود سے زیادہ علم و تفقہ رکھتا ہے؟" مسروق نے جواب دیا کہ نہیں، ایسا تو نہیں ہے، لیکن میں نے زید بن ثابت اور دوسرے باشندگان مدینہ کو تشریک کرتے دیکھا ہے (اس لیے میرا خیال ہوا کہ یہ جائز ہے)۔ الغرض ہر عالم کے نزدیک اس کے اپنے ہی شیوخ اور علمائے شہر کے اختیار کردہ اقوال مرجح اور قابل اخذ و اتباع ہوتے تھے۔ اگر اہل شہر کسی امر پر متفق ہوتے تو یہ علماء اس کو دانتوں سے پکڑ لیتے۔ چنانچہ امام مالک ایسے ہی مسائل کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ "جس سنت میں (اہل مدینہ کا) کوئی اختلاف نہیں ہے وہ ہمارے نزدیک ایسی اور ایسی ہے" (یعنی بالکل ثابت اور واجب العمل ہے)۔ اور اگر اہل شہر کسی مسئلہ میں مختلف الرائے ہوتے تو ان مختلف رایوں میں سے یہ حضرات اس رائے کو اختیار کرتے جو زیادہ مضبوط اور راجح نظر آتی۔ اس امر کا فیصلہ کہ کونسی رائے مضبوط اور راجح ہے اس بات سے ہوتا کہ اکثریت کس طرف ہے، یا یہ کہ کونسا قول منصوص قیاس پر مبنی ہے، یا یہ کہ کونسا مذہب کتاب و سنت کی تخریجات سے اوفق ہے۔ جہاں امام مالک یوں فرماتے ہیں کہ "یہ بات ان تمام باتوں میں سب سے بہتر ہے جو اس مسئلہ کے متعلق میرے علم میں آئی ہیں" تو دراصل اسی طریق فکر و طرز عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر اگر یہ علماء صحابہ اور تابعین کے مجموعۂ اقوال میں کسی مسئلہ کا جواب نہ پاتے تو انہی اقوال کو بنیاد قرار دے کر اس سے استنباط کرتے اور ان کے اشارات و مقتضیات کی پوری جستجو کر کے جواب مسئلہ کا سراغ لگاتے۔

---

[1] آپ نے فرمایا تھا کہ "جلد ہی لوگ طلب علم کی خاطر سواریاں دوڑائیں گے اور مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کوئی صاحب علم و فضل نہ پائیں گے۔"

[2] تشریک کا مطلب یہ ہے کہ مالک زمین اپنی زمین بٹائی پر کاشت کرنے کے لیے دوسرے کو دیدے۔ (مترجم)

مذاہب اربعہ کا ظہور یہی وہ طبقہ ہے جس کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ فقہ پر کتابیں مرتب کی جائیں۔ چنانچہ مدینہ میں امام مالک اور محمد ابن عبدالرحمٰن ابن ابی ذئب نے، مکہ میں ابن جریج اور ابن عُیینہ نے، کوفہ میں امام ثوری نے اور بصرہ میں ربیع ابن صبیح نے فقہ میں مستقل کتابیں لکھیں۔ ان تمام حضرات کا طریقۂ تدوین وہی تھا جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

امام مالک اور مذہب مالکی خلیفہ منصور جب حج کے لیے گیا تو اس نے امام مالک سے کہا کہ "میرا قصد یہ ہے کہ آپ کی تصنیفات کے متعدد نسخے نقل کراؤں اور مسلمانوں کے ہر ہر شہر میں ایک ایک نسخہ بھجوا دوں اور حکم دے دوں کہ سب لوگ بس انہی کتابوں کے مطابق عمل کریں اور ان کو چھوڑ کر کسی اور طرف نہ جائیں۔" امام مالک نے جواب دیا کہ "اے امیرالمومنین! ایسا نہ کر کیونکہ لوگوں میں (سلف کے مختلف) اقوال پھیل چکے ہیں اور (مختلف اقسام کی) حدیثیں ان تک پہنچ چکی ہیں۔ ان مختلف اقوال و احادیث میں سے ہر گروہ ان چیزوں پر عمل پیرا ہے جو اس کے کانوں میں پہلے پڑ گئیں۔ پس لوگوں کو آزاد چھوڑ دے اور ہر بستی کے مسلمانوں کو اسی مسلک پر عمل کرنے دے جو انھوں نے اپنے لیے اختیار کر لیا ہے۔"

بعض لوگوں نے اس قصہ کو منصور کے بجائے ہارون الرشید کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کی روایت اس طرح کی ہے کہ ہارون نے امام مالک سے بطور مشورہ پوچھا کہ "کیا آپ کی موطا خانہ کعبہ میں آویزاں کر دی جائے اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ تمام اختلافات چھوڑ کر اسی کے مطابق عمل کریں"؟ امام مالکؒ نے فرمایا کہ "ایسا نہ کرو (یہ اختلاف صحابۂ رسول کے زمانہ سے چلا آ رہا ہے)۔ فروع میں صحابہ خود مختلف الرائے تھے اور وہ (اپنے مختلف مذاہب لیے ہوئے) اطراف ملک میں بکھر گئے اور ہر ایک کا طریقہ مختلف علاقوں میں اب چل پڑا ہے۔" یہ سن کر ہارون الرشید نے کہا "اے ابو عبداللہ تم کو (حکمت و دین کی) اور زیادہ توفیق دے۔" اس واقعہ کو امام سیوطی نے نقل کیا ہے۔

امام مالک اُن احادیث کے سب سے بڑے عالم ہیں جو اہل مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں۔ اور بلحاظ اسناد وہ سب سے زیادہ معتبر ہیں۔ نیز وہ حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور عبداللہ ابن عمرؓ اور عائشہ صدیقہؓ اور ان حضرات کے ساتوں شاگردوں[1] کے اقوال کے سب سے بڑے عالم اور جامع ہیں۔ اسی ہستی اور اسی جیسی دوسری مبارک ہستیوں کے ہاتھوں علم روایت و فتویٰ کی بنیاد پڑی۔ مسندِ علم و ارشاد پر متمکن ہونے کے بعد امام موصوف نے روایت حدیث، افتاء اور افادۂ علمی کے وہ عظیم الشان کارنامے انجام دیے جن کے باعث آنحضرت کی اس پیشینگوئی کے مصداق سمجھے گئے کہ "زمانہ قریب ہے کہ لوگ اونٹوں پر سوار ہو کر علم کی جستجو میں دوڑ دھوپ کریں گے، سو اس وقت وہ مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کسی کو صاحب علم و فضل نہیں پائیں گے۔" ابن عیینہ اور عبدالرزاق کا خیال ہے کہ یہ پیشینگوئی امام مالک پر صادق آتی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی اصابت رائے مسلم ہے۔ پھر امام مالک کے تلامذہ نے ان کی روایات اور مختارات کو اکٹھا کیا، ان کی تلخیص اور تنقیح کی، شرحیں بیان کیں، ان کے اصول و دلائل پر بحثیں کیں، ان کی بنیاد پر مزید مسائل کی تخریج کی اور ان چیزوں کو لے کر یہ لوگ مختلف ممالک میں خصوصاً مغرب کی طرف

---

[1] ان شاگردوں کو فقہائے سبعہ کہا جاتا ہے، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) سعید ابن مسیب (۲) عروہ ابن زبیر (۳) قاسم ابن محمد ابن ابوبکر صدیق (۴) ابوبکر ابن عبدالرحمٰن مخزومی (۵) خارجہ ابن زید ابن ثابت (۶) عبیداللہ ابن عبداللہ ابن عتبہ مسعودی (۷) سلیمان ابن یسار ہلالی۔ (مترجم)

پھیل گئے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے کتنی ہی مخلوق کو نفع پہنچایا۔ ہم نے مذہب مالکی کی جو اصلیت بیان کی ہے اگر تم اس کی صداقت معلوم کرنی چاہتے ہو تو "موطا امام مالک" کو نظر غائر سے دیکھو۔ تم پر یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی۔

امام ابو حنیفہ اور مسلک حنفی

امام ابو حنیفہ، ابراہیم نخعی اور ان کے ہم خیال علمائے تابعین کے مسلک پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اور شاید ہی کبھی اس سے اختلاف و انحراف کرتے ہوں۔ اس مذہب کی بنیادوں پر مسائل کی تخریج کرنے میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا۔ تخریجات کے طریقوں میں وہ انتہائی دقت نظر سے کام لیتے تھے اور انھوں نے اپنی پوری توجہ جزئیات کی توضیح و استنباط میں لگا رکھی تھی۔ اگر تم ہماری اس بات کی تصدیق چاہتے ہو تو امام محمد کی کتاب الآثار، عبدالرزاق کی جامع اور ابوبکر ابن ابی شیبہ کی مصنف میں سے ابراہیم نخعی کے اقوال چن کر جمع کر لو، پھر امام ابو حنیفہ کے مذہب سے ان کا مقابلہ کرو تو تم دیکھو گے کہ سوائے چند مقامات کے کہیں بھی اُن کا قدم ابراہیم نخعی کے جادۂ فقہی سے ہٹ کر نہیں پڑتا۔ اور یہ چند مقامات بھی ایسے نہیں ہیں کہ امام مذکور نے ان میں کوئی اپنی الگ راہ نکالی ہو، بلکہ ان میں بھی دیگر فقہائے کوفہ میں سے کوئی نہ کوئی ان کے آگے موجود ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور ابو یوسف ہیں جو ہارون الرشید کے عہد حکومت میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر ہوئے تھے۔ ان کا یہی منصب تھا جس کے باعث حنفی مذہب ہر چہار طرف پھیل نکلا اور عراق، خراسان اور توران کے حدود میں حکومت کا آئین قرار پا گیا۔

دوسرے شاگرد جو تصنیف و تالیف کے لحاظ سے تمام تلامذہ میں ممتاز اور حصول علم میں سب سے زیادہ انہماک رکھنے والے تھے، امام محمد بن حسن ہیں۔ انھوں نے پہلے تو امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف سے فقہ حاصل کی، پھر مدینہ جا کر امام مالک سے موطا پڑھی۔ اس کے بعد بطور خود تفکر شروع کیا اور اپنے شیوخ کے مذہب کے ایک ایک مسئلہ کا موطا سے مقابلہ کر کے دیکھا، اگر اس کے مطابق نظر آیا تو خیر، ورنہ (اختلاف کی شکل میں) صحابہ اور تابعین کے مذاہب و اقوال کی جستجو کی، اگر کسی گروہ کے ہاں اپنے مذہب کے موافق قول مل گیا تو اس صورت میں وہ مذہب حنفی پر قائم رہے، لیکن اگر کوئی مسئلہ ایسا نکلا جس کی بنیاد کسی کمزور قیاس یا بے جان استنباط پر تھی اور اکثر علما کے عمل سے یا کسی ایسی حدیث صحیح سے اس کی مخالفت بھی ہو رہی تھی جس پر فقہا نے عام طور سے عمل کیا ہو تو ایسی حالت میں انھوں نے اپنی رائے بدل دی اور امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے مذہب سے ہٹ کر مذاہب سلف میں سے کسی ایسے مذہب کو اختیار کر لیا جو ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ فائق اور مرجح نظر آیا۔

امام ابو حنیفہ کے ان دونوں تلامذہ نے بھی ابراہیم نخعی کے مذہب کی حتی الامکان اسی طرح پیروی کی جس طرح امام ابو حنیفہؒ نے کی تھی۔ صرف دو نقطہ ہائے اختلاف تھے جو استاد اور ان کے تلامذہ کے مابین واقع ہوتے تھے۔ کبھی تو ایسا ہوتا کہ امام ابو حنیفہ ابراہیم نخعی کے مذہب پر کسی مسئلہ کی تخریج کی، لیکن امام ابو یوسف اور امام محمد نے اس تخریج کو تسلیم نہیں کیا۔ اور کبھی یہ صورت ہوتی کہ ابراہیم نخعی وغیرہ فقہائے کوفہ کے کسی مسئلہ میں مختلف اقوال ہوتے تو ان اقوال میں سے کسی ایک قول کو سند انتخاب و ترجیح دینے میں یہ دونوں، امام موصوف کی مخالفت کر جاتے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، امام محمد نے تصنیف و تدوین کی طرف توجہ کی اور ان تینوں فقہا کے اقوال اکٹھے مرتب کیے، جس

بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ پھر بعد کے علماے حنفیہ امام محمد کی ان تصانیف کی طرف پوری سنجیدگی سے متوجہ ہوئے، ان کو چھانٹا اور صاف کیا، ان کے مطالب کی وضاحت کرکے ان کو قریب الفہم بنایا، ان کی بنیاد پر مزید مسائل کا استنباط کیا اور ان کو دلائل سے مبرہن کیا۔ پھر یہ لوگ (ان تمام تصانیف کو لے کر) خراسان اور توران کی طرف جا نکلے اور ان تصانیف کے سارے مسائل امام ابوحنیفہ کا مذہب کہے جانے لگے۔ اس طرح امام ابویوسف اور امام محمد کے مذاہب بھی امام ابوحنیفہ کے مذہب کے ساتھ مل گئے اور ان سب کو ایک ہی مذہب شمار کیا گیا، حالانکہ یہ دونوں حضرات بجائے خود مجتہد مطلق ہیں اور امام ابوحنیفہ سے ان کے اختلافات کی فہرست کافی طویل ہے، نہ صرف فروع میں بلکہ اصول میں بھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ مذکورۂ بالا اصل ان تینوں میں مشترک ہے (یعنی یہ تینوں ہی حضرت ابراہیم نخعی کے مذہب کو اپنی بنیاد قرار دیتے ہیں۔) اور دوسرے یہ کہ مبسوط اور جامع کبیر میں ان تینوں مذاہب کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

امام شافعی اور مسلک شافعی | ان دونوں مذاہب۔ مذہب مالکی اور مذہب حنفی — کی شہرت و اشاعت اور ان کے اصول و فروع کی ترتیب کا آغاز تھا کہ اس بزم میں ایک تیسرے امام، امام شافعی تشریف لائے۔ آپ نے اگلے لوگوں کے طریق فکر و استنباط کا گہری نظر سے جائزہ لیا تو اس میں ایسی قابل اعتراض باتیں نظر آئیں جنھوں نے ان کو اس راہ پر گامزن ہونے سے روک دیا۔ ان باتوں کا ذکر امام موصوف نے اپنی تصنیف "کتاب الام" کے ابتدائی اوراق میں (بڑی وضاحت سے) کیا ہے۔ ان کے اعتراضات کا ماحصل یہ ہے:-

(۱) یہ لوگ (فقہائے مدینہ اور فقہائے کوفہ) مرسل اور منقطع احادیث کو بھی لے لیتے ہیں جن کی وجہ سے ان کے اقوال میں لغزشیں راہ پالیتی ہیں، کیونکہ جب حدیث کے تمام طریقوں کو جمع کیا جاتا ہے (اور محدثانہ چھان بین کی جاتی ہے) تو معلوم ہوتا ہے کہ کتنی ہی مرسل حدیثیں ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں اور کتنی ہی ایسی ہیں جو مسند اور مرفوع احادیث کے خلاف پڑتی ہیں۔ اس لیے امام شافعی نے فیصلہ کیا کہ مرسل روایتوں کو اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک کہ ان میں چند خاص شرطیں نہ پائی جائیں۔ ان شرطوں کی تفصیل کتب اصول میں موجود ہے۔

(۲) ان حضرات کے ہاں مختلف نصوص میں تطبیق دینے کے قواعد منضبط نہ تھے جس کے باعث ان کے اجتہادات غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے۔ اس لیے امام شافعی نے پہلے یہ اصول و قواعد وضع کیے اور ان کو باقاعدہ ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا۔ اصول فقہ کی یہ پہلی کتاب ہے جو عالم وجود میں آئی۔ اس امر کی مثال (کہ امام شافعی کے خیال کے مطابق پچھلے فقہا کے اجتہادات اصول تطبیق کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے راہ راست سے ہٹ جاتے تھے) اس واقعہ میں موجود ہے کہ ایک دن امام شافعی امام محمد کے ہاں آئے۔ امام محمد اپنی تقریر میں فقہائے مدینہ پر اعتراض کر رہے تھے کہ یہ لوگ فصل مقدمات کے لیے دو گواہوں کی شہادت ضروری نہیں سمجھتے بلکہ صرف ایک ہی گواہ کی گواہی اور مدعی کی قسم پر بھی فیصلہ کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ کتاب اللہ پر اضافہ ہے[1]

[1] اضافہ کا مطلب یہ ہے کہ اس سے قرآن کے حکم پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں کسی نہ کسی طرح کی ترمیم یا تخصیص کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً یہی شہادت کا مسئلہ ہے جس کی بابت قرآن میں عام حکم ہے کہ فصل مقدمات کے لیے دو شاہد چاہییں۔ مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دو شاہد مہیا نہ ہو سکیں تو مدعی کی قسم اور ایک گواہ کی گواہی بھی کافی ہے۔ گویا حلف دوسرے گواہ کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔ (مترجم)

امام شافعی نے یہ تقریر سن کر کہا کہ "کیا آپ کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر اضافہ جائز نہیں؟" انھوں نے فرمایا کہ "ہاں"۔ امام شافعی نے کہا "تو پھر آپ حدیث لا وصیۃ لوارث کو لے کر، جو ایک خبر واحد ہے، یہ کیوں کہتے ہیں کہ وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں، حالانکہ کتاب اللہ کہتی ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آئے تو وہ اگر اس نے مال چھوڑا ہے۔ اپنے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں وصیت کر دے) کیا یہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر اضافہ نہیں ہے؟" اس کے بعد انھوں نے اسی طرح کے اور بھی چند اعتراضات امام محمد پر کیے، جن کے جواب میں امام محمد کو انجام کار خاموش ہونا پڑا۔

(۳) وہ علمائے تابعین، جن کو فتویٰ دینے کی خدمت سپرد تھی، بعض صحیح حدیثوں سے نا علم تھے اس لیے انھوں نے مسائل پیش آمدہ میں یا تو اپنی رائے سے اجتہاد کیا یا عام خیالات کو لے لیا یا اگلے صحابہ کے طرز عمل کو اختیار کر لیا اور اسی کے مطابق فتویٰ دیدیا پھر کبھی ایسا ہوا کہ آگے چل کر تیسرے طبقہ میں وہ حدیثیں منظر عام پر آئیں لیکن پھر بھی ان فقہا نے ان کو چھوڑے ہی رکھا اور ان پر صرف اس خیال سے عمل نہیں کیا کہ یہ حدیثیں ہمارے علمائے شہر کے عمل اور مذہب کے جن سے ہم کوئی اختلاف نہیں رکھتے مخالف ہیں، اور یہ مخالفت بتاتی ہے کہ ان حدیثوں میں کوئی نہ کوئی کمزوری اور علت ضرور موجود ہے جس نے ان کو مرتبہ قبول اور پایۂ اعتبار سے گرا دیا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوا کہ یہ احادیث تیسرے طبقہ میں بھی شہرت عام حاصل نہ کر سکیں بلکہ اس کے بعد کے زمانوں میں مشہور ہوئیں جبکہ علمائے حدیث نے اسناد و طرق حدیث کو جمع کرنے میں پوری کاوش دکھلائی اور اس کے لیے زمین کا ایک ایک گوشہ چھان کر ارباب علم کا کھوج لگایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر حدیثیں ایسی ہیں جن کے روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد ایک یا دو سے اوپر نہیں، پھر ان صحابہ سے یہ حدیثیں سن کر دوسروں سے بیان کرنے والے بھی وہی ایک آدمی ہیں، اور اسی طرح آگے تک راویوں کی یہ قلت تعداد چلی گئی جس کے سبب سے یہ احادیث عام اہل فقہ کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ گئیں اور ان حفاظ حدیث کے زمانہ میں پردۂ خفا سے باہر نکلیں جنھوں نے حدیث کو ان کے طرق و اسانید کے ساتھ جمع کیا۔ پھر ایک دوسری شکل یہ بھی تھی کہ کتنی ہی حدیثیں ایسی ہیں جن کے روایت کرنے والے صرف ایک خاص خطۂ ملک کے لوگ ہیں، مثلاً اہل بصرہ نے ایک حدیث روایت کی اور باقی تمام دیگر مقامات کے لوگ ان سے بالکل بے خبر رہ گئے۔ ان حقائق کے پیش نظر امام شافعی کا کہنا یہ ہے کہ علمائے صحابہ و تابعین کا برابر یہ دستور رہا ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی مسئلہ آتا تو پہلے وہ رسول اللہ کی حدیث تلاش کرتے، اگر کوئی حدیث نہ ملتی تب جا کر کسی اور طریقۂ استدلال سے کام لیتے۔ مگر اس کے بعد بھی قبول حدیث کا دروازہ اپنے اوپر بند نہیں کر لیتے تھے بلکہ بعد میں جب بھی کوئی حدیث ان کو مل جاتی تو اپنے اجتہاد کو ترک کر دیتے اور حدیث کو اختیار کر لیتے۔ جب صورت واقعہ یہ ہے تو ان علماء کا کسی حدیث سے تمسک نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ حدیث ہی کمزور ہے۔ الا آنکہ انھوں نے صراحت کے ساتھ اس کی تضعیف اور تنقیص کر دی ہو۔ حدیث "قلتین"[۱] اس کی ایک واضح مثال ہے۔ یہ ایک صحیح حدیث ہے جو بہت سی سندوں سے مروی ہے، جن میں سے اکثر کا سر رشتہ اس سلسلہ روایت سے بندھتا ہے کہ یہ حدیث ولید بن کثیر نے محمد ابن جعفر ابن زبیر سے یا محمد ابن

[۱] اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔ اذا کان الماء قلتین لم یحمل خبثا۔ یعنی جب پانی دو "قلہ" ہو تو وہ کسی نجاست کے پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتا۔
"قلہ" اس بڑے مٹکے کو کہتے ہیں جس میں پانچ سو رطل یعنی سوا چھ من پانی آ سکے، یا بقول بعض دو مشک پانی۔ (مترجم)

عباد ابن جعفر سے روایت کی اور انھوں نے عبید اللہ ابن عبداللہ سے نقل کی اور عبید اللہ نے ابن عمرؓ سے بیان کی۔ بعد میں چل کر اس سلسلۂ اسناد سے شاخ در شاخ بہت سے سلسلہ ہائے سند پیدا ہوگئے۔ یہ دونوں راوی (محمد ابن جعفر اور محمد ابن عباد) اگرچہ پوری طرح قابل اعتبار ہیں مگر وہ ان لوگوں میں نہیں ہیں جو فتوی دینے کے منصب پر سرفراز اور مرجع عوام تھے اس وجہ سے یہ حدیث نہ تو سعید ابن مسیبؒ کے زمانہ میں مشہور ہو سکی نہ ہی امام زہری کے زمانہ میں، اور نہ تو مالکیہ نے اس پر عمل کیا نہ حنفیہ نے۔ مگر امام شافعی (کے زمانہ میں یہ حدیث مشہور ہو چکی تھی، اس لیے انھوں) نے اس کو قابل عمل ٹھیرایا۔

ایک اور مثال "خیار مجلس"[1] والی حدیث کی لے لو جو ایک صحیح حدیث ہے اور بہت سے طریقوں سے روایت ہوئی ہے اور صحابہ میں سے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ نے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ لیکن "فقہائے سبعہ" اور ان کے ہم عصر دوسرے علما تک نہ پہنچ سکی، اس لیے انھوں نے اس کو اختیار نہیں کیا اور یہ چیز امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک حدیث میں قدح کی علت بن گئی، لیکن امام شافعی نے اس پر عمل کیا۔

(۴) صحابہ کے اقوال امام شافعی کے زمانہ میں کثرت سے اکٹھا ہوئے جن میں کافی اختلاف اور انتشار تھا۔ آپ نے ان پر تنقید و تحقیق کی نگاہ ڈالی تو ان کا ایک بڑا حصہ احادیث صحیحہ کا مخالف نظر آیا جس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کو حدیثیں پہنچی ہی نہ تھیں۔ پھر علمائے سلف کو دیکھا کہ اس معاملہ میں وہ برابر اقوال صحابہ کو چھوڑ کر احادیث صحیحہ کی طرف رجوع کرتے رہے ہیں، اس لیے انھوں نے ان اقوال کو تو قابل حجت و عمل مانا جن پر صحابہ کا اتفاق تھا۔ مگر باقی کو لائق تمسک تسلیم کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "صحابہ بھی انسان تھے اور ہم بھی (انہی کی طرح کے) انسان ہیں"[2]۔

(۵) امام شافعیؒ نے دیکھا کہ فقہا کا ایک گروہ "رائے" کو، جس کو شریعت نے جائز قرار نہیں دیا ہے، قیاس کے ساتھ جس کو شریعت میں اعتبار کا مقام حاصل ہے، گڈمڈ کر رہا ہے اور ان میں فرق و امتیاز نہیں کرتا۔ یہ لوگ اس "رائے" کو کبھی استحسان بھی کہتے ہیں ـــــ "رائے" سے میری مراد یہ ہے کہ کسی نقصان یا کسی مصلحت کے مظنہ کو کسی حکم کی علت ٹھیرا دیا جائے، اور قیاس یہ ہے کہ ایک حکم منصوص کی علت دریافت کی جائے اور اس علت کی بنا پر دوسرے معاملات میں بھی وہی حکم لگایا جائے۔ امام شافعیؒ نے فقہا کے اس طرز عمل کا پوری قوت سے ابطال کیا اور کہا کہ "جو استحسان یعنی رائے سے کام لیتا ہے وہ دراصل شارع بننا چاہتا ہے"۔ اس قول کو عضد نے "مختصر الاصول" کی شرح میں درج کیا ہے۔ اس کی مثال "رشد یتیم" کا مسئلہ ہے۔ یتیم کا معاملہ فہم ہو جانا ایک مخفی امر ہے (جس کے لیے کوئی متعین تاریخ نہیں بتائی جا سکتی) لیکن فقہا نے یہ دیکھ کر بالعموم پچیس سال کی عمر میں انسان کے اندر معاملہ فہمی آجاتی ہے، اس "مظنۂ رشد" (یعنی پچیس سالہ عمر) کو اس کا قائم مقام قرار دے کر یہ اصول بنا دیا کہ "جب یتیم کی عمر پچیس سال کی ہو جائے تو اس کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے" اور کہا کہ یہ "استحسان ہے"۔ اس کے بالمقابل اس مسئلہ میں قیاس یہ ہے کہ مال

[1] وہ حدیث یہ ہے کہ "جب تک خریدار اور فروخت کنندہ باہم الگ نہ ہو جائیں، اس وقت تک دونوں میں سے ہر ایک کو معاملۂ بیع فسخ کر دینے کا اختیار ہے۔

[2] یعنی ہماری ہی طرح وہ بھی فہم و نظر کی فطری لغزشوں سے مامون نہ تھے کہ ان کے اقوال کو ایک نبی معصوم کے کلام کی طرح آنکھیں بند کر کے مان لیا جائے۔ نصوص کتاب و سنت سے جس طرح وہ مسائل کا استنباط کر سکتے تھے ہم بھی کر سکتے ہیں پھر ان کے استنباط کے ہم پابند کیوں ہوں۔ (مترجم)

اس کو سپرد نہ کیا جائے (تا وقتیکہ وہ واقعتہً معاملہ فہم اور صاحبِ عقل و رشد نہ ہو جائے)۔

مختصر یہ کہ جب امام شافعی نے اپنے پیشروؤں میں اس قسم کی باتیں دیکھیں تو (ان سے نامطمئن ہو کر) انہوں نے علم فقہ پر نئے سرے سے نظر ڈالی اور بطورِ خود اس کے اصول مرتب کیے اور ان اصولوں پر جزئیات کا استنباط کیا، اس فن پر مستقل اور بہترین کتابیں لکھیں جو لوگوں کی فیضیابی کا ذریعہ بنیں۔ فقہائے وقت آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے اور آپ کی تصنیفات کو لے کر ان کا اختصار کیا، ان کی شرحیں لکھیں۔ ان سے دلیلیں اخذ کیں اور ان کو سامنے رکھ کر مزید مسائل مستنبط کیے۔ پھر (ان سب چیزوں کو لے کر) مختلف ممالک میں منتشر ہو گئے۔ اس طرح یہ فقہ کا ایک الگ اسکول قرار پایا جس کی نسبت امام شافعی کی طرف تھی۔

(باقی)

فہرست مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	حصہ اول	عہ/ ۱ر	مجلد	۲ر
″ ″ ″	″ دوم	۱ر	″	۱؎ ر
تفہیمات		۱؎ ر	″	۱۲ر
خطبات	قسم اول	۱ر	″	۱؎ ر
″	″ دوم	۱۲ر		
رسالہ دینیات	″ اول	۱ر	″	۱۲ر
″ ″	″ دوم	عہ		
مسئلہ جبر و قدر		عہ		
تجدید و احیائے دین		عہ	″	۱۲ر
پردہ		۱ر	″	۱؎ ر
حقیقت توحید		۱ر	″	۱ر
روداد جماعت اسلامی	″ دوم	۹ر		
″ ″	″ سوم	عہ	″	۱ر
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	ہر سہ حصہ		″	معہ

نوٹ:- جن کتابوں کا نام فہرست میں درج نہیں ہے۔ وہ ختم ہو چکی ہیں۔

مجلد کتب پر کمیشن نہیں دیا جائے گا۔ "مینیجر"

حضرت موسیٰ نیشنلسٹ لیڈر تھے
یا
نبی اور رسول؟

ہمارے ایک رفیق نے کسی عالم دین کی ایک تحریر یا تقریر کے کچھ اقتباسات ہم کو بھیجے ہیں اور ان پر چند سوالات کیے ہیں۔ یہ اقتباسات اور سوالات یہاں نقل کرکے ہم ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اقتباسات یہ ہیں:۔

"بنی اسرائیل کو فرعون اور قبطیوں کی غلامی کرتے ہوئے جب ایک مدت گذر گئی تو رحمت خداوندی جوش میں آئی اور موسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کو یہ غلامی شکن حکم ملا کر اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (فرعون کے پاس جاؤ، وہ حد سے نکل گیا ہے) اس کے "حد سے نکل جانے" کی سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔"

"ادھر جبکہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے ہی کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا یعنی ان کی بعثت کی اولین غرض ہی یہ تھی کہ فرعون کے پاس جاکر کہو اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ (کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور غلامی کے عذاب سے نجات دے) تو آیت سے صراحتاً یہی واضح ہوا کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لیے جدوجہد ایک مذہبی فریضہ ہے، جس کے لیے مستقلاً ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت عمل میں آئی۔ کیا اس آیت کی رو سے ہمارے لیے استخلاص اور تحصیل آزادی کی جدوجہد تقریباً ضروری، اور ایک دینی وظیفہ نہیں ٹھیرتی؟"

"ساتھ ہی یہ چیز بھی نمایاں ہوگئی کہ مسلمانوں کے لیے بنیادی مسئلہ نہ رفع جہالت کا ہے، نہ اقتصادیات کا، نہ اپنے اور ابنائے وطن کے تعلقات کا، نہ منصبی اور عرفی حیثیت کا، بلکہ اصل مسئلہ ان سب مصائب کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کا ہے اور وہ غلامی ہے جس کا ایک سرا ہندوستان کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور دوسرا پوری دنیائے اسلام کے گلے میں ہے۔"

"اسی لیے موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے نہ اولاً تورات اترنے کی دعا کی جس سے ان کا تعلیمی مسئلہ متعلق تھا، نہ ان کی اقتصادی حالت کی طرف "کچھ زیادہ" توجہ فرمائی جس سے مالی حالت درست ہوتی اور نہ اور ہی امور کی طرف "زیادہ" التفات فرمایا جن سے حیثیت وعزت کا تعلق تھا بلکہ سب سے اول ان مفاسد کے سرچشمے (غلامی) کی جڑ پر تیشہ لگایا اور فرعون کو خطاب کیا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ تاکہ یہ آزادانہ زندگی بسر کرسکیں اور اپنی "مذہبی اور سیاسی تعمیر باختیار خود" کرنے پر قادر ہوجائیں۔"

"پس آج بھی ہندوستانیوں کے لیے بنیادی مسئلہ آزادی ہند اور آزادی دنیائے اسلام کا ہے جو آزادی ہند ہی سے متعلق ہے…… پس مسلمانوں کے لیے حصول آزادی کی جدوجہد کوئی رسمی سیاست نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لیے انھیں اپنی پوری اجتماعی قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباسات پیش کرکے ہمارے بھائی نے ہم سے مندرجہ ذیل سوالات کیے ہیں :-

"کیا موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی اولین غرض بنی اسرائیل کو آزاد کرانا تھا؟ کیا تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی غرض یک نہیں ہے؟ اگر موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی غرض آزادیٔ بنی اسرائیل تھی جیسا کہ مولانا نے فَاْتِيَاهُ فَقُوْلَا اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ (اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم تیرے رب کے رسول ہیں پس ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے) سے استدلال کیا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اہم بات آزادی کی جدوجہد ثابت ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لیے رفع جہالت کا مسئلہ کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے اس سے مختلف راستہ اختیار کیا؟ آپ بھی آزادی کی جدوجہد میں دوسرے علمائے کرام کی طرح کیوں نہیں لگ جاتے؟ اور آپ ایک بنیادی مسئلہ کو چھوڑ کر ایک غیر ضروری، ضمنی اور بالکل ہی غیر بنیادی مسئلہ (رفع جہالت مسلمین) میں اپنی اور اپنے رفقاء کی قوت و قابلیت کیوں صرف فرماتے ہیں؟ اور اگر ان پیدا شدہ سوالات کی بنیاد آپ کے نزدیک غلط ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس معروضہ پر پوری تفصیل کے ساتھ کلام فرمائیے۔ ایک طرف اس عالم دین کی شخصیت ہے جو علم و تقویٰ میں کل ہند شہرت رکھتی ہے دوسری طرف اس کے یہ ارشادات ہیں جن کے نتائج سے دل لرزتا ہے۔ ہمیں بتائیے کہ کیا موسیٰ علیہ السلام فی الواقع کوئی "نیشنلسٹ لیڈر" تھے یا "نبی اور رسول" تھے؟

ہمارے یہی بھائی ایک دوسرے گرامی نامہ میں ایک اور سوال دریافت فرماتے ہیں جو اسی سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے بلکہ ے اوپر کی غلط فہمیوں کی مزید وضاحت ہوجاتی ہے اس وجہ سے ہم اسے بھی یہیں درج کیے دیتے ہیں تاکہ اسی ضمن میں ں کا بھی جواب ہوجائے۔ وہ فرماتے ہیں :-

"۱۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تو اس وقت بنی اسرائیل ان ہی حالات میں گرفتار تھے جن میں آج ہندی مسلمان گرفتار ہیں لیکن حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کی اخلاقی تربیت پر زیادہ زور نہیں دیا اور اگر دیا بھی تو انھوں نے اپنی قوم کے صالحین کو چھانٹ کر الگ ایک گروہ نہیں بنایا یہاں تک کہ جب وہ نکلے ہیں تو کوئی بھی اسرائیلی پیچھے نہیں رہا۔

"۲۔ صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر میں باب کے خاتمہ کے قریب ایک حدیث آئی ہے کہ جب آپ بدر کی مہم پر روانہ ہوئے تو راستہ میں ایک بہادر جری آدمی ملا اور اس نے کہا "جئت لاتبعك واصيب معك" لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے "ایمان باللہ والرسول" سے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مسلم نہیں ہے اس پر آپ نے فرمایا "ارجع فلن استعين بمشرك"۔ اسی طرح کئی بار سوال و جواب ہوا بالآخر اس نے ایمان باللہ والرسول کا اقرار کیا تو اسے "مومن" کی حیثیت سے "جہاد" میں شرکت کی اجازت دی اور وہ مجاہدین کے ساتھ چل پڑا۔

نمبر اول سے معلوم ہوتا ہے کہ دور غلامی میں کچھ بہت زیادہ کچے اور پکے لوگوں کو چھانٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اتنا کافی ہے کہ وہ جس درجہ پر بھی ایمان کے ہوں انھیں نے کر آزادی کے حصول کی کوشش شروع کردی جائے پھر آزاد ہونے کے بعد تزکیہ وغیرہ کا کام شروع کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا۔

نمبر ۲ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرانے مسلمان تو خیر پرانے ہیں جو آج ہی ایمان لائے ہوں اور تطہیر و تزکیہ ان کا بالکل نہ ہوا ہو

انھیں بھی بغیر کسی تیاری کے جہاد میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر جماعت اسلامی اپنے اس ابتدائی مرحلہ پر کن وجوہ سے کانٹ چھانٹ کرتی ہے؟ ہندوستان کے مسلمان بنی اسرائیل سے اور اس نو مسلم سے زیادہ بگڑے ہوئے تو نہیں ہیں؟"

تین غلط فہمیاں

یہ سارا استدلال درحقیقت تین غلط فہمیوں پر مبنی ہے:۔

۱۔ پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ فرعون اور اس کی قوم سے صرف یہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے۔ ان بزرگوں کے خیال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام یا تو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بحیثیت رسول سرے سے بھیجے ہی نہیں گئے تھے، یا بھیجے گئے تھے تو اللہ کے تمام رسولوں کے طریقہ کے خلاف، فرعون اور اس کی قوم کے لیے ان پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی گئی تھی کہ ان کو ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کی دعوت دیں، ان پر اللہ کی حجت تمام کریں، ان کو خدا سے ڈرائیں اور تذکیر و تبلیغ کا وہ فرض انجام دیں جو ہر نبی اور رسول ان لوگوں کے اندر انجام دیتا ہے جن کی طرف وہ بھیجا جاتا ہے۔ یہ ساری ذمہ داریاں ان کے اوپر صرف بنی اسرائیل کے لیے تھیں، فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت و ضلالت سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ فرعون سے ان کا معاملہ صرف یہ تھا کہ اپنی قوم کو اس کی غلامی سے چھڑا لیں۔ بس اسی کام پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور کیا تھا چنانچہ جاتے ہی انھوں نے یہ مطالبہ فرعون کے سامنے پیش کر دیا اور اسی طرح پیش کر دیا جس طرح کانگریس نے "ہندوستان کو خالی کر دو" (Quit India) کا ریزولیوشن پاس کر دیا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ کانگریس نے یہ تجویز نصف صدی سے زیادہ کی جد و جہد کے بعد پاس کرنے کی جرأت کی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ خدا کی طرف سے صرف بنی اسرائیل کو آزادی ہی دلانے کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس وجہ سے، بے خوف و خطر انھوں نے اپنا مطالبہ، پہلی ہی ملاقات میں، فرعون اور اس کی قوم کے سامنے رکھ دیا۔ اور ان کو یہ یقین دلانے کے لیے، کہ وہ بنی اسرائیل کی آزادی کی مہم پر خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں انھوں نے متعدد معجزات دکھائے لیکن یہ لوگ، ان معجزات کے بعد بھی، بنی اسرائیل کو غلام بنانے ہی پر اڑے رہے۔ بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہو گئے اور فرعون اور اس کی ساری فوج ان کا تعاقب کرتے ہوئے بحر قلزم میں غرق ہو گئی۔

۲۔ دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ یہ حضرات بنی اسرائیل کے اندر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک دور ان کی مصر کی زندگی کا۔ دوسرا دور ان کے مصر سے نکلنے کے بعد کی زندگی کا۔ اور ان دونوں دوروں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام بنی اسرائیل کے اندر، ان لوگوں کے نزدیک، دو بالکل مختلف نوعیتیں رکھتا ہے۔ پہلے دور میں ان کے نزدیک اصلی کام بنی اسرائیل کی آزادی کا تھا اور اسی پر انھوں نے اپنی ساری توجہ مرکوز کی۔ اس دور میں انھوں نے نہ ان کے عقائد و ایمانیات کا سوال چھیڑا اور نہ ان کی تربیت و تزکیہ کی طرف کچھ ایسی توجہ کی۔ صرف نسبی عصبیت کے نعرہ پر، جس طرح ایک نیشنلسٹ لیڈر کرتا ہے انھوں نے تمام بنی اسرائیل کے اندر آزادی کی ایک لگن پیدا کر دی اور ان کو اپنی قیادت پر جمع کر لیا۔ اس سے قطع نظر کہ کوئی شخص خدا کو مانتا ہے یا نہیں، آخرت پر اس کا ایمان ہے یا نہیں، ان کی رسالت پر اس کو عقیدہ ہے یا نہیں، ہر اسرائیلی ان کی فوج کا سپاہی اور ان کی جماعت کا ایک رکن تھا اور ان سب کو بلا فرق و تمیز وہ مصر سے لے کر چلے۔ ان کے مومن و منافق اور کافر و فاسق میں انھوں نے کوئی امتیاز نہیں کیا۔ جب فرعون کی غلامی سے باہر نکل آئے، تب انھوں نے ان کی تربیت و تعلیم اور اصلاح و تزکیہ کی طرف توجہ فرمائی اور ان کو خدا اور اس کے قانون سے آشنا کیا۔ اس طرح

ان حضرات کے خیال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام، ان کی زندگی کے پہلے دور میں، ایک نیشنلسٹ لیڈر کے کام سے کچھ مختلف نہیں ہے اور مصر میں انھوں نے فرعون سے جو لڑائی لڑی وہ شرک و توحید اور کفر و اسلام کی جنگ نہ تھی بلکہ قبطیت اور اسرائیلیت کی جنگ تھی۔ ایک قوم پرست لیڈر کو جس طرح اپنی قوم کی آزادی عزیز ہوتی ہے اسی طرح ان کو بھی اپنی قوم کی آزادی عزیز تھی۔ جس طرح ہر شخص جو نسل و خون اور وطنیت و قومیت میں اس لیڈر کا شریک ہوتا ہے، ان کے مفاد کے لیے وہ سردھڑ کی بازی لگاتا ہے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ہر اسرائیلی کی آزادی کے لیے سردھڑ کی بازی لگائی۔ اور جس طرح ایک نیشنلسٹ لیڈر اشتراک اور ہم جنسی کے ان بنیادی اصولوں کے سوا جن پر اس کی قوم کی قومیت قائم ہوتی ہے، اور کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتا اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی قبطیت اور اسرائیلیت کے اس معرکہ میں، اسرائیلیت کے سوا کسی چیز کو اہمیت نہیں دی۔

۳۔ تیسری غلط فہمی یہ ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک ساری برائیوں کی جڑ غلامی اور ساری خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ آزادی ہے۔ غلامی سے، ان حضرات کے نزدیک، مراد یہ ہے کہ کوئی قوم جو نسل و خون، تہذیب و معاشرت، اور جغرافی حالات کے اعتبار سے ایک علیحدہ قوم گنی جاتی ہو وہ کسی ایسی قوم کی محکوم ہو جائے جو ان اعتبارات سے ایک علیحدہ حیثیت رکھتی ہو اور آزادی کا مفہوم، ان کے نزدیک، یہ ہے کہ اس طرح کے اجنبی اقتدار سے محکوم قوم آزاد ہو کر اپنی تعمیر باختیار خود کر سکے۔ یہ آزادی اور "اپنی تعمیر باختیار خود" کر سکنے کا حق ان کے نزدیک تمام بھلائیوں کی بنیاد ہے۔ جب تک کسی قوم کو یہ خود مختاری نہ حاصل ہو اس وقت تک وہ نیکی کی راہ میں ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتی۔ اس وجہ سے، ان کے نزدیک، یہ ضروری ہوا کہ اگر کوئی قوم غلام ہو تو اس کی اصلاح کے سلسلہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ اس کو آزاد کیا جائے اور جب تک اس کو آزادی حاصل ہو جائے اس وقت تک اس کی اصلاح و تربیت کے سارے کام ملتوی رکھے جائیں۔ ان حضرات کے نزدیک چونکہ یہ آزادی و خود مختاری تمام برکتوں کا سرچشمہ ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس مقصد کے لیے انبیاء مبعوث فرماتا ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ کسی غلام قوم کے لیڈروں کا سب سے بڑا، سب سے مقدس اور سب سے مقدم فرض اپنی قوم کو آزاد کرانا ہے۔

غلط فہمیوں کے تین سبب ان غلط فہمیوں پر تنقید کرنے سے پہلے، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ان میں مبتلا ہونے والے حضرات معمولی لوگ نہیں بلکہ عالی مقام بزرگان دین ہیں، ضروری ہے کہ ان کے پیدا ہونے کے اسباب کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ ہمارے خیال میں ان کے پیدا ہونے کے بھی تین سبب ہیں۔

(الف) پہلا سبب یہ ہے کہ تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری جد و جہد، جو انھوں نے مصر میں کی ہے، اصول و عقائد کی جنگ کے بجائے ایک قومی و نسلی نزاع کے رنگ میں پیش کی گئی ہے۔ جو شخص بھی تنقید کی گہری نظر کے بغیر اس کو پڑھے گا وہ اس کو ایک پیغمبر کی دعوتِ ایمان و اسلام سے زیادہ ایک نیشنلسٹ لیڈر کی تحریک آزادی سے زیادہ مشابہ پائے گا۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری توجہ کا مرکز یہی نقطہ معلوم ہوتا ہے کہ "بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دو"۔ ساری داستان میں یہ بات کہیں نہیں نمایاں ہوتی کہ حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کو اللہ، روز آخرت اور اس کے پیچھے ہوئے ہادی پر پوری سوزی کے ساتھ ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہوں اور فرعون اور اس کی قوم سے کسی اصول و

مسلک پر جنگ کر رہے ہوں جس پر ایمان لانے کے بعد اس نزاع کا خاتمہ ہو سکے۔ بلکہ ان کا اول و آخر مطالبہ صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ "ہمیں جانے دو"۔ اس سلسلہ میں اگر خدا کا ذکر آتا بھی ہے تو اس حیثیت سے نہیں کہ وہی اس بات کا حقدار ہے کہ سب اسی کی غلامی اور بندگی کریں اور اسی کے قانون کو مانیں بلکہ فرعون اور اس کی قوم کے ایک حریف دیوتا کی حیثیت سے آتا ہے کہ "خداوند خدا اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تو میرے لوگوں کو جانے دے"۔ اسی طرح بنی اسرائیل کا ذکر اگر آتا ہے تو اس حیثیت سے نہیں کہ وہ اللہ کی مخلوق اور آدم کی اولاد ہیں اور اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ خدا کے بندوں کا سا معاملہ کیا جائے بلکہ اس طرح آتا ہے کہ "اسرائیل خدا کا پہلوٹھا ہے اور ساری دنیا کی قومیں اس کے پاؤں کے نیچے کی چوکی بنیں گی"۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرح نظر نہیں آتے جس طرح ایک پیغمبر اپنی قوم میں شب و روز خدا کی بندگی اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو لوگ اس کی دعوت پر ایمان لاتے ہیں ان کی زندگیوں کو سنوارنے کی فکر میں اپنی جان گھلاتا ہے اور جو لوگ اس سے بدکے ہوئے ہوتے ہیں ان کو ڈھونڈھنے اور مانوس کرنے میں لگا رہتا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری جد و جہد بنی اسرائیل کو بحیثیت بنی اسرائیل منظم کرنے کے لیے ہے۔ اور اس تنظیم میں کافر و مومن، مخلص و منافق اور کھرے اور کھوٹے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ صرف اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کا سوال ہے۔

توریت میں خدا کے ایک پیغمبر اور اس کے کارناموں کی تاریخ کا ایک بالکل قومی جہاد آزادی کے رنگ میں رنگ جانا کچھ تعجب انگیز نہیں ہے۔ جو بنی اسرائیل خدا کے بندے اور اس کی مخلوق (بشر ممن خلق) ہونے کی جگہ اس خبط میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ خدا کے محبوب اور اس کے لاڈلے ہیں، جو یہود ایمان باللہ اور اطاعت رسول کی جگہ اسرائیلیت کو نجات کی گارنٹی یقین کرنے لگے تھے۔ جو لوگ اپنے تئیں بندگی سے بالاتر اور خدا کی گرفت سے بالکل محفوظ سمجھتے تھے، ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی ساری تاریخ کو ایمان و عقیدہ کی روشنی میں پیش کرنے کے بجائے نسلی اور قومی استحقاق کی روشنی میں پیش کریں۔ اس کے بغیر نہ وہ اپنے غرور کو تسلی دے سکتے تھے اور نہ اپنے ان تصورات (امانی) کے لیے کوئی وجہ جواز پیش کر سکتے تھے جن میں مبتلا ہو کر انھوں نے خدا کی ساری شریعت سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پچھلی تاریخ کو قومی مفاخر کی ایک داستان کی شکل میں مرتب کر کے اپنے ماضی اور حال میں ایک ربط پیدا کر لیا۔ اگرچہ یہ مصنوعی ربط پیدا کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور جگہ جگہ ایسا خلا چھوڑ گئے کہ قرآن نے ان کی تاریخ ہی کو ان کے باطل دعاوی اور ان کی لایعنی آرزوں کے خلاف سب سے بڑے گواہ کی حیثیت سے پیش کیا تاہم ان کو اتنی کامیابی تو ضرور ہوئی کہ ہمارے "کل ہند شہرت" رکھنے والے علما، جن کے تقوی و تقدس کی قسمیں کھائی جاتی ہیں، قرآن کی تنبہات کے باوجود ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے شکار ہو گئے۔

(ب) غلط فہمی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن نے اگرچہ بنی اسرائیل کی تاریخ صحیح نقطۂ نظر سے پیش کر دی ہے، جس سے یہود کی ساری غلطیاں بے نقاب ہو جاتی ہیں لیکن قرآن میں اسی سلسلہ کی دو مشکلیں ایسی ہیں جن کو ہر شخص آسانی سے حل نہیں کر سکتا۔ پہلی مشکل یہ ہے کہ قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون و بنی اسرائیل کی پوری سرگذشت کسی ایک جگہ نہیں بیان ہوئی ہے۔ مختلف سورتوں میں اس سرگذشت کے مختلف ٹکڑے، سورہ کے موضوع و مضمون کے اعتبار سے، آئے ہیں۔ اس وجہ سے اگر کوئی شخص اس پوری سرگذشت اور اس کے مختلف ادوار کو متعین کر کے ایک فریم میں لانا چاہے تو اس کو ذرا محنت کرنی پڑے گی

جس کو قرآن کا کوئی محنتی طالب علم ہی کر سکتا ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ دوسرے انبیاء اور ان کی سرگذشتوں میں سے قرآن نے اولاً اتنا ہی حصہ بیان کیا ہے جتنا موقع کلام اور حکمت بیان کے پہلو سے ضروری تھا، ثانیاً اس کو بھی ایسے ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے صبر اور ذہانت دونوں درکار ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ جلد باز ہیں، اور قرآن کی پوری بات سمجھنے کے بجائے یہ چاہتے ہیں کہ جلدی سے ان کے مدعا کے موافق کوئی بات ان کے ہاتھ لگ جائے، وہ نہایت آسانی سے، غلط فہمیوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت حال ان حضرات کو بھی پیش آئی ہے جو "ارسل معنا بنی اسرائیل" کے ایک ٹکڑے کو پڑھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک "نیشنلسٹ لیڈر" بنا بیٹھے۔ اور یہ سمجھنے لگ گئے کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لیے جد و جہد ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لیے مستقلاً ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت عمل میں آئی۔"

(ج) غلط فہمی کی تیسری وجہ، یہ ہے کہ ہمارے ملک میں قومی اور وطنی آزادی کی یہ تحریک جس کی قیادت آج کانگریس کر رہی ہے اور جس کی نہایت بھونڈی نقل مسلم لیگ نے اڑائی ہے، قرآن و حدیث سے روشنی حاصل کر کے مسلمانوں نے نہیں شروع کی تھی۔ بلکہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں جس آزادی کا غلغلہ یورپ کے ملکوں میں بلند ہوا تھا بعینہٖ وہی چیز جدید تعلیم اور جدید مطالعہ تاریخ کے اثر سے ہمارے ملک کے غیر مسلموں میں پیدا ہوئی اور چونکہ اس طرح کی آزادی کے مقدس ترین فرض انسانی ہونے پر کافی لٹریچر تیار ہو چکا تھا اس وجہ سے نئی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بھی یہ چیز پھیلی اور بعینہٖ انہی تصورات و مطالبات کے ساتھ پھیلی جن تصورات و مطالبات کے ساتھ اس کے مغربی موجدوں نے اس کو وضع کیا تھا۔ شروع شروع میں مسلمانوں کے اندر سے کچھ منچلے اور حوصلہ مند لوگ اس کی طرف بڑھے۔ بعد میں ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر کچھ ایسے مسائل پیدا ہو گئے کہ علماء کا گروہ بھی آزادی وطن کی اس جد و جہد میں شریک ہو گیا اور جو حالات ان حضرات کو اس چیز کی طرف لائے وہ ایسے ہنگامہ خیز تھے کہ ان کے اندر نہ کسی کو اس بات پر غور کرنے کی مہلت ہی تھی کہ آزادی کا یہ مغربی تصور اور حصول آزادی کا یہ مغربی طریق کار اسلام سے کچھ مناسبت بھی رکھتا ہے یا نہیں اور نہ ان میں سے کسی بزرگ کے پاس وہ ضروری معلومات ہی تھیں جن کی روشنی میں وہ اس آزادی کا تجزیہ کر کے سمجھ سکتے کہ اس کے فلسفہ اور اس کے عمل میں فساد کے کتنے اجزاء ہیں اور صلاح کے کتنے ذرات ہیں۔ پس یہ نعرہ کہ "آزادی ہر قوم کا پیدائشی حق ہے۔" اور "ہندوستان کی آزادی ہی پر تمام عالم اسلامی کی آزادی منحصر ہے" ان حضرات کو اس میدان میں کھینچ لایا۔ بعد میں جب اس آزادی کا فلسفہ اور اس کے حصول کا طریق کار آہستہ آہستہ لوگوں کے سامنے آیا اور ہر مرحلہ میں انھیں یہ بات محسوس ہونے لگی کہ آزادی کا یہ تصور اور اس کے مطالبات اس تصور آزادی سے بالکل مختلف ہیں جو اسلام نے پیش کیا ہے اور قدم قدم پر وہ اس راستہ سے اپنے آپ کو ہٹا ہوا پانے لگے جو اللہ اور اس کے رسول نے کسی مخصوص قوم کی آزادی کے لیے نہیں بلکہ دنیا جہان کی آزادی کے لیے بتایا تھا تو انھیں اس بات کی فکر ہوئی کہ اپنے طرز عمل کو جائز ثابت کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے کچھ دلیلیں فراہم کریں۔ اس طرح کی کوشش کا نتیجہ وہ استدلال ہے جس سے خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر کو ایک نیشنلسٹ لیڈر کے درجہ تک گرا دیا گیا ہے اور جس کو پڑھ کر انسان کے کبر نفس پر حیرت ہوتی ہے کہ جب خدا کی کتاب اس کی خواہشوں کا ساتھ نہیں دیتی تو وہ کس طرح توڑ مروڑ کر اس کو اپنی خواہشوں کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ پس یہ ساری غلطی درحقیقت نتیجہ ہے اس بات کا کہ ان حضرات نے آزادی کی اس جد و جہد میں اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول

کی رہنمائی کے بغیر بالکل دوسرے محرکات کے تحت ڈال دیا اور اب کہ ایک غلط راہ کی بہت سی منزلیں طے کر چکنے کے بعد انھیں محسوس ہو رہا ہے کہ وہ بالکل ایک غلط راہ پر پڑ لیے ہیں تو بجائے اس کے کہ الٹے پاؤں واپس لوٹیں اس بات کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح قرآن و حدیث سے ان کی یہ غلط روی ہدایت ثابت ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوشش کا نتیجہ یہ ہونے سے رہا کہ غلط فہمیاں دور ہوں۔ اس کا نتیجہ تو بس یہی ہو سکتا ہے کہ جتنا ہی یہ حضرات اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے زور لگائیں گے اتنا ہی حق سے یہ اور دور ہٹتے جائیں گے۔ ہاں اگر ان کے اندر یہ ہمت ہوتی کہ حق کی خاطر اپنی قیادت کے پندار کو مجروح کر سکتے تو ہمیں یقین ہے کہ اس غلط رنگ آمیزی کے باوجود، جو علمائے یہود نے اپنی تاریخ پیش کرنے میں کی ہے، اور اس ایجاز کے باوجود جو قرآن مجید میں پایا جاتا ہے، بالکل پہلی نظر میں ان کے سامنے اصل حقیقت بالکل روشن ہو کر آجاتی۔

ایک نبی اور ایک نیشنلسٹ لیڈر کے بنیادی اختلافات

شاید ان حضرات نے کبھی سکون کے ساتھ اس مسئلہ پر غور نہیں فرمایا کہ ایک نبی کی دعوت اور ایک قوم پرست لیڈر کی تحریک میں ایسے بنیادی اختلافات ہیں کہ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ ایک نبی کے نزدیک تمام خرابیوں کی جڑ انسان کی خود مختاری اور آزادی ہے اور تمام بھلائیوں کا سرچشمہ اللہ کی بندگی اور تنہا اسی کی اطاعت ہے۔ اس کے بالکل برعکس ایک قوم پرست لیڈر ساری خرابیوں کی جڑ غلامی کو قرار دیتا ہے اور ساری ترقیوں کا منبع اپنی تعمیر باختیار خود کرنے کے حق کو سمجھتا ہے۔ ایک نبی کی قوم ایمان و اسلام کے اصولوں پر ایمان لانے سے بنتی ہے، اور ایک قومی لیڈر کی قوم نسل و نسب اور وطنیت کے مسالہ سے تعمیر ہوتی ہے۔ ایک نبی کی ساری لڑائی اصول و عقائد سے ہوتی ہے۔ جو عقائد اس کے عقائد کے خلاف ہوتے ہیں ان سے وہ جنگ کرتا ہے، خواہ وہ اس کی قوم کے اندر پائے جاتے ہوں یا کسی دوسری قوم کے اندر، اور جو لوگ اس کے اصولوں کو مان لیتے ہیں وہ ان سے اپنی جماعت بنا لیتا ہے، خواہ وہ اس کی قوم کے اندر سے آئے ہوں یا اس کے باہر سے۔ اس کے بالکل برعکس ایک قومی لیڈر کا سارا جھگڑا اس قوم سے ہوتا ہے جو نسل و نسب یا وطنیت اور رنگ میں اس سے مختلف ہے اور چونکہ یہ اختلاف ہر شکل باقی رہتا ہے اس وجہ سے اس کا اختلاف بھی بہرحال قائم رہتا ہے۔ ایک نبی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے وہ نظام پیش کرتا ہے جو تمام بنی آدم کے لیے یکساں مفید ہو اور ایک قومی لیڈر زندگی کے سارے نقشے اپنی قوم کے مفاد کو سامنے رکھ کر بناتا ہے۔ یہ بنیادی اختلافات اتنے اہم ہیں کہ اگر مذہب کی زبان میں ان کو تعبیر کیا جائے تو ایک کفر ہے، دوسرا ایمان، ایک توحید ہے دوسرا شرک۔ اس وجہ سے اس کا امکان بالکل نہیں ہے کہ ایک شخص نبی اور رسول بھی ہو اور قومی لیڈر بھی، یا ایک نبی اپنی زندگی کے کسی دور میں تو ایک قومی لیڈر کے اصولوں پر کام کرے اور دوسرے دور میں ایک نبی کے اصولوں پر۔ کیونکہ ایسا فرض کرنا درحقیقت اس بات کو فرض کرنا ہے کہ العیاذ باللہ ایک نبی اپنی ایک ہی زندگی کے اندر کفر و اسلام دونوں کے اصول جمع کر لے یا اپنی زندگی کے ایک دور میں تو وہ شرک کا داعی ہو اور دوسرے دور میں توحید کا۔ یہ باتیں اتنی واضح ہیں کہ کوئی صاحب فہم ایک لمحہ کے لیے بھی اس غلطی میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کو پیغمبر بھی مانے اور پھر اس کی طرف ایک قومی لیڈر کی خصوصیات بھی منسوب کر دے۔ لیکن بدقسمتی سے چونکہ بہت سے علمائے دین اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں اس وجہ سے ہم قرآن مجید کی روشنی میں یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف نبی اور رسول تھے۔ اپنی بعثت کے شروع میں بھی اور بعثت کے آخر میں بھی، فرعون کے لیے بھی اور بنی اسرائیل کے لیے بھی، اور

اسی واقعہ سے کہ ان کی قوم کسی اور قوم کی غلام تھی۔ ان کے پیغام اور ان کے کام میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ جو دعوت تمام انبیائے کرام نے اپنی اپنی قوموں کو دی وہی دعوت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دی، جو ڈراوا ہر پیغمبر نے اپنی قوم کے ارباب اقتدار و ملأ مستکبرین کو سنایا وہی ڈراوا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ارباب اقتدار اور ملأ مستکبرین کو سنایا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ دوسرے انبیاء کی قوموں کے ارباب اقتدار ان کی اپنی قوم کے اندر ہی کے لوگ ہوتے تھے، بنی اسرائیل کے ارباب اقتدار باہر کے یعنی قبطی تھے لیکن اس اختلاف سے کوئی ایسا جوہری فرق نہیں واقع ہوتا کہ ایک نبی کے اصول دعوت میں فرق پیدا ہو جائے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دعوت حق دی، ان سے مناظرے کیے، ان کو معجزے دکھائے، ان پر اللہ کی حجت تمام کی، یہاں تک کہ ان کے اندر سے کچھ اہل حق ایمان بھی لائے لیکن جیسا کہ ہر نبی کی قوم کے ارباب اقتدار کی اکثریت نے نبی کی تکذیب کی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کے ملأ مستکبرین نے بھی ان کی تکذیب کی اور پھر جس طرح ہر نبی نے اپنی طرف سے اتمام دعوت اور مستکبرین کی طرف سے تکذیب اور قتل کی دھمکی کے بعد ہجرت کی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے زمانہ کے مستکبرین کی طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد ہجرت فرمائی اور جس طرح ہر نبی کے جھٹلانے والے، نبی کی ہجرت کے بعد، خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعداء بھی ان کی ہجرت کے بعد گرفتار عذاب ہوئے۔ یہ ساری تفصیلات قرآن میں موجود ہیں ہر شخص قرآن کو پڑھ کر دیکھ سکتا ہے کہ اس امر واقعہ کی وجہ سے کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم کسی دوسری قوم کی غلام تھی نہ نبی کے فرائض رسالت کی نوعیت میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی نہ انبیاء کے لیے اور ان کے جھٹلانے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے جو مقررہ قوانین ہیں ان میں سر مو کوئی فرق ہوا۔ ایک ہی ضابطہ جو آدم سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جاری رہا وہی ہم یہاں بھی جاری دیکھتے ہیں۔ اور فرق ہو بھی کیا سکتا تھا؟ مستکبرین کی نسل بدل جانے سے ان کی ذہنیت میں تو کوئی تبدیلی ہوتی نہیں۔ قریش کے ارباب اقتدار ابوجہل و ابولہب ہوں یا بنی اسرائیل کے ارباب اقتدار فرعون و ہامان دونوں ایک ہی بیماری میں مبتلا تھے پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک کے پاس تو اللہ کا رسول یہ دعوت لے کر آئے کہ ایمان لاؤ، اور عمل صالح اختیار کرو اور دوسرے کے پاس محض بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ۔ آخر مستکبرین اور مستضعفین کی نسل مختلف ہونے کی وجہ سے خدا کے انبیا کا رویہ کیوں بدل جائے؟ کیا العیاذ باللہ انبیاء بھی نسل و نسب کی اسی عصبیت میں گرفتار ہوتے ہیں جس میں ہمارے ہندوستان کے برہمن گرفتار تھے کہ شودر کے کان میں وید کا کوئی کلمہ نہ پڑنے پائے اور کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے کوئی نسلی پرخاش تھی کہ اگر وہ اللہ پر ایمان بھی لاتا جب بھی وہ یہی چاہتے کہ اس کی قوم الگ اور ان کی قوم علیحدہ رہے؟

اسی طرح بنی اسرائیل کے لیے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت وہی تھی جو ہر نبی اپنی قوم کو دیتا ہے۔ یعنی ایمان باللہ ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کی دعوت۔ کسی دوسری قوم کے زیر اقتدار ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہرگز یہ نہیں کیا کہ ان کو نسلی عصبیت کے نعرے پر جمع کر کے پہلے فرعون سے آزادی حاصل کرنے کی دعوت دیں اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ایمان و اسلام کا درس شروع کریں۔ ان کی مصر کی زندگی اور مصر سے نکلنے کی بعد کی زندگی میں جو کچھ فرق ہے وہ صرف اجمال و تفصیل کا ہے۔ یعنی مصر کی زندگی میں انھوں نے اپنی قوم کو صرف اصول دین کی تعلیم دی۔ عقائد میں سے اللہ، رسول اور آخرت پر ایمان کی، عبادات میں سے نماز اور قربانی کی، اخلاق و اعمال میں سے توکل، صبر، اور حق پر استقامت کی۔ اور

مصر سے نکلنے کے بعد ان سارے اصولوں کی شرح فرمائی اور ان کے مطابق ان کی تربیت کی۔ یہ بعینہٖ اسی طرح کا تدریجی ارتقاء ہے جو ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل ہجرت اور بعد ہجرت کی دعوت میں پاتے ہیں۔ جس طرح آنحضرت صلعم کی مکی اور مدنی زندگی بالکل ہم آہنگ اور مربوط ہے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے دونوں دور بالکل ہم آہنگ اور مربوط ہیں۔ یہ ان کے اوپر نہایت بدترین تہمت ہے کہ وہ مصر میں تو نسل و نسب کے دعوائے جاہلیت کے علمبردار تھے۔ لیکن سینا میں آکر خدا کے داعی بن گئے۔ البتہ طبیعت میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام محض قومیت کے نعرہ پر لوگوں کو جمع نہیں کر رہے تھے بلکہ ایمان و اسلام کے اصولوں پر جمع کر رہے تھے تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب وہ مصر سے نکلے تو ان کی ساری قوم ان کے ساتھ تھی۔ لیکن اولاً تو یہ بیان تورات کا ہے جس کی نسبت ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اس میں بنی اسرائیل کی ساری تاریخ نسلی استحقاق اور خاندانی فضیلت کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، ثانیاً یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دنیا میں کسی نبی کی تکذیب بھی کمزوروں اور مظلوموں نے نہیں کی ہے۔ صرف قوم کے ارباب جاہ نے کی ہے۔ بنی اسرائیل من حیث القوم ارباب جاہ میں شامل نہیں تھے بلکہ مستضعفین یعنی مظلوموں میں تھے۔ ان کے لیے کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں خدا کے اتنے عجائب اور اس کی قدرت کے اتنے کرشمے دیکھکر بھی ایمان نہ لاتے درانحالیکہ ان کو ایمان سے پھیرنے والے ارباب اقتدار اپنے مظالم اور اپنی نسلی عصبیت و اجنبیت کی وجہ سے اپنا اعتماد ان کے اندر بالکل کھو چکے ہوں۔ اور خوف کے سوا کوئی دوسری کشش بھی بنی اسرائیل کو ان کی طرف کھینچنے والی نہ ہو۔

حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ فرعون اور اس کی قوم سے

یہ مدعا کا اجمالی بیان تھا۔ اب کسی قدر تفصیل سے اصل صورت حالات کو قرآن مجید کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے۔ اور پہلے یہ دیکھیے کہ فرعون اور اس کی قوم کیساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ کیا وہ محض ایک نیشنلسٹ لیڈر کی حیثیت سے ان کے پاس محض یہ مقصد لے کر گئے تھے کہ ان کی غلامی سے اپنی قوم کو چھڑا لیں یا بحیثیت رسول کے اس حیثیت سے کہ ان کو خدا پر ایمان لانے، خدا سے ڈرنے اور اپنی زندگیوں کو پاک کرنے کی دعوت دیں؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلی اصولی بات قرآن مجید نے یہ بتائی ہے:۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ	ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے ایک رسول تم پر گواہ بنا کر جس طرح
كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا فَعَصٰى فِرْعَوْنُ	ہم نے بھیجا تھا ایک رسول فرعون کی طرف گواہ بنا کر تو فرعون نے اس رسول
الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا۔ (۱۵، ۱۶۔ مزمل)	کی نافرمانی کی تو ہم نے اس کو سخت عذاب میں پکڑا

اس آیت میں مخاطب قریش ہیں۔ ان سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول، دین حق کی دعوت دینے کے لیے، بھیجا تھا اسی طرح تمہاری طرف ایک رسول، اللہ کے دین کی دعوت کے لیے بھیجا ہے۔ فرعون نے اس رسول کی دعوت قبول نہ کی تو وہ عذاب میں پکڑا گیا، اسی طرح اگر تم اس رسول کی بات نہ سنوگے تو عذاب میں گرفتار ہوگے۔

اس سے چند باتیں بالکل صاف ہوگئیں۔ پہلی یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کے پاس اسی طرح رسول بنا کر بھیجے گئے تھے جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی طرف بھیجے گئے تھے۔ دوسری یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی فرعون اور اس کی قوم کی طرف اسی طرح شاہد یعنی اللہ کے دین کے داعی بنا کر بھیجے گئے تھے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہل عرب

کی طرف اللہ کے دین کے داعی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ تیسری یہ کہ فرعون اور اس کی قوم کا جرم بھی بعینہ وہی ہے جو آنحضرت صلعم کی قوم کا تھا یعنی جس طرح قریش نے اللہ کے رسول کی دعوت نہ مانی اسی طرح فرعون اور اس کی قوم نے بھی اللہ کے رسول کی بات نہ مانی۔

دوسری جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بات بھی قرآن نے بیان کر دی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ایمان، تزکیہ اور خشیت الٰہی کی دعوت دینے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى. فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (۱۷-۱۹ النازعات)

فرعون کے پاس جا وہ سرکش ہو گیا ہے، اور اس سے کہو کیا تجھ میں کچھ رغبت ہے کہ تو پاکی حاصل کرے اور میں تجھے تیرے رب کی راہ بتاؤں تو اس سے ڈرے۔

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس اس لیے بھیجے گئے تھے کہ اس کے اندر اگر نیک اور پاک انسان بننے کا کچھ بھی داعیہ ہو تو اس کو پاکیزہ زندگی کا طریقہ بتائیں اور اگر خداشناسی کا کچھ میلان ہو تو اس کو خدا کی صفتوں اور اس کے حکموں کی تعلیم دیں تاکہ وہ خدا سے ڈرے۔ نیز اسی آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ قرآن کی اصطلاح میں طغیان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی میں خدا سے بے پروائی پیدا ہو جائے۔

یہی بات ایک اور مقام میں بیان ہوئی ہے۔ اور وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ نہایت نرمی اور ملائمت کے ساتھ فرعون کو تبلیغ حق کی جائے تاکہ تذکر اور خشیت کی راہ اختیار کرنے میں اس کے لیے داعی کی طرف سے کوئی چیز مانع نہ ہو۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ. اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى. فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى

تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیوں کو لے کر جاؤ اور میرا ذکر بلند کرنے میں ڈھیلے نہ پڑنا، فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے، اور اس کو نرمی کے ساتھ تبلیغ کرو تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کرے یا ڈرے۔

اسی سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام خود فرعون سے فرماتے ہیں:

قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى. اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى

ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اس کے لیے جو اللہ کے طریقہ کی پیروی کرے۔ ہمارے پاس یہ وحی آئی ہے کہ خدا کا عذاب اس پر آئے گا جو جھٹلائے گا اور منہ موڑے گا۔

"الهدیٰ" کے معنی اللہ کی ہدایت کے ہیں جیسا کہ فرمایا ہے (قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى) جس سے صاف واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس صرف بنی اسرائیل کو آزاد کرانے کے لیے نہیں گئے تھے بلکہ اللہ کی ہدایت لے کر گئے تھے جس کو قبول کرنے کی صورت میں فرعون کے لیے اللہ کی رحمت تھی اور جس سے اعراض کرنے کی صورت میں اس کا قہر و عذاب۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے توحید و معاد پر تقریریں بھی کیں۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى. قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى. قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى. قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ

اس نے پوچھا تمہارا رب کون ہے؟ اے موسیٰ؟ جواب دیا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پہلے اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس کو ہدایت بخشی۔ پوچھا اگلی امتوں کا کیا حال ہے؟ جواب دیا ان کا حال میرے رب کے علم میں ہے ایک کتاب

رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ـ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ـ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ـ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى (طٰہٰ)

میں لکھا ہوا۔ نہ میرا رب بھٹکے گا نہ بھولے گا جس نے تمھارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا، اس میں تمھارے لیے راہیں نکالیں، اور آسمان سے پانی اتارا پس ہم نے پیدا کیں اس سے طرح طرح کی نباتات، کھاؤ اور چراؤ اپنے ڈھوروں کو۔ بے شک اس کے اندر دلیلیں ہیں عقلمندوں کے لیے۔ اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا، اسی میں لوٹائیں گے، اور پھر اسی سے دوبارہ پیدا کریں گے۔

. . . .

قرآن نے، توحید پر، بعض مناظرے بھی نقل کیے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہوئے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ـ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ـ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ـ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ـ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ـ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (شعرا)

فرعون نے پوچھا اور یہ رب العالمین کیا ہے؟ جواب دیا آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب۔ بشرطیکہ تم یقین کرو۔ اس نے اپنے درباریوں سے کہا، سنتے ہو؟ کہا تمھارا بھی رب اور تمھارے پچھلے بزرگوں کا بھی رب۔ کہا یہ رسول، جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، یہ تو پاگل معلوم ہوتا ہے اس نے کہا مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب۔ بشرطیکہ تم سمجھو۔ بولا اگر تونے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمھیں قید خانہ کے حوالہ کردوں گا

فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ شکایت بھی تھی کہ یہ جس بات کی دعوت دے رہے ہیں ہم نے اپنے بزرگوں سے نہیں سنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے جواب میں یہ فرماتے کہ میں تمھارے پاس اللہ کی ہدایت لے کر آیا ہوں۔ یہ بعینہٖ وہی شکایت ہے جو ہر نبی کی قوم نے اس کی دعوت کے متعلق کی ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب بھی بعینہٖ وہی ہے جو ہر نبی نے قوم کے اس اعتراض کے جواب میں دیا ہے۔

وَمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ـ وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ـ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ

اور ہم نے تو یہ بات (توحید) اپنے اگلوں میں نہیں سنی اور موسیٰ نے کہا میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے اور انجام کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوگی۔ یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔ اور فرعون نے کہا اے لوگو میں تمھارے لیے اپنے سوا کسی معبود سے واقف نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سارا جھگڑا فرعون سے بنی اسرائیل کی آزادی ہی کے لیے تھا تو فرعون کے اس اعتراض کا کیا مطلب کہ حضرت موسیٰ آبا و اجداد کے طریقہ کے خلاف ایک بدعت پھیلا رہے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب کا کیا موقع پیدا ہوا کہ میں اگرچہ اپنی دعوت کی تائید میں آبا و اجداد کے طریقہ کی سند نہیں رکھتا لیکن اللہ تعالیٰ کی سند رکھتا ہوں۔ اور پھر اس بات کی ضرورت کیا پیش آئی کہ فرعون اپنے تمام ارباب حل و عقد کو اس بات پر متنبہ کرتے کہ میرے سوا کسی کو

الزامات ہیں۔

اس سے زیادہ واضح بات ایک یہ ہے کہ فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جو سب سے بڑا اندیشہ تھا وہ یہ نہ تھا کہ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ لے کر اٹھے ہیں بلکہ یہ تھا کہ یہ کہیں اس کی قوم کا دین نہ بدل دیں اور ملک میں اس کی خدائی کے خلاف بغاوت نہ برپا کر دیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المومن)

اور فرعون نے کہا مجھے چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور وہ اپنی مدد کے لیے اپنے رب کو بلائے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ تمہارا دین نہ بدل دے یا ملک میں فساد برپا کر دے۔

اور فرعون کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا۔ قبطیوں کے اندر بہت سے لوگ کھلم کھلا حضرت موسیٰ پر ایمان لا چکے تھے جن میں سب سے زیادہ حق پرست اور جری وہ لوگ تھے جو اپنے سحر سے حضرت موسیٰ کے معجزات کا مقابلہ کرنے آئے تھے اور بالآخر حق کی طاقت سے مغلوب ہو کر سحر سے تائب ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو فرعون کے جبر و ظلم کی وجہ سے اپنے ایمان کو چھپاتے تھے۔ چنانچہ ان کے اندر سے ایک شخص نے اس وقت اپنے ایمان کا اعلان کیا جب اس کی قوم نے حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ کیا ہے اور اس وقت اس نے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے دعوت ایمان پر ایک تقریر کی ہے جو قرآن مجید میں نقل ہوئی ہے۔ اس تقریر کو پڑھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان اصلی کشمکش بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے نہیں تھی بلکہ ایمان باللہ، ایمان بالرسول، ایمان بالآخرت کے لیے تھی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ ساری چیزیں ٹھیک انہی دلائل اور انہی تفصیلات کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سامنے پیش کی تھیں جن دلائل و تفصیلات کے ساتھ ہر نبی نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیں۔ اس پوری تقریر کو پڑھیے۔ یہ مرد حق عین موقع کا گواہ بھی ہے اور آل فرعون میں سے بھی ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی دعوت کو جس صورت میں پیش کرتا ہے وہ کتنی مختلف ہے اس صورت سے جس صورت میں ہمارے یہ بزرگان دین حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیش کر رہے ہیں۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ٭ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ٭ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ٭ يٰقَوْمِ

اور فرعون نے کہا ہٹو میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور وہ پکارے اپنے رب کو (اپنی مدد کے لیے) مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے یا ملک میں فساد برپا کر دے۔ اور موسیٰ نے کہا میں نے ہر متکبر ... روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمہارے رب کی پناہ پکڑی۔ اور ایک مومن نے جو آل فرعون میں سے تھا اور اب تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، کہا کیا تم ایک ایسے شخص کو قتل کر دو گے جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور حال یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آیا ہے؟ اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اس پر آئے گا اور اگر سچا ہے تو جس عذاب کی دھمکی تم کو سنا رہا ہے اس کا

لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنْ
بَأْسِ اللّٰهِ إِنْ جَاءَنَا قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا
أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ ۝ وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ
إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ ۝ مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ
نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ وَمَا اللّٰهُ يُرِيدُ
ظُلْمًا لِلْعِبَادِ ۝ وَيَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝
يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ مَا لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ وَمَنْ
يُضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ
مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ
حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا
كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُرْتَابٌ ۝ الَّذِينَ
يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ كَبُرَ
مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ
اللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝ وَقَالَ فِرْعَوْنُ
يَا هَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ
أَسْبَابَ السَّمَاوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلَىٰ إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي
لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا وَكَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوءُ عَمَلِهِ
وَصُدَّ عَنِ السَّبِيلِ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ ۝
وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُونِ أَهْدِكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ
يَا قَوْمِ إِنَّمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ
هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۝ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا
وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ
يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُونَ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ وَيَا قَوْمِ
مَا لِي أَدْعُوكُمْ إِلَى النَّجَاةِ وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ ۝ تَدْعُونَنِي
لِأَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَأُشْرِكَ بِهِ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ وَأَنَا
أَدْعُوكُمْ إِلَى الْعَزِيزِ الْغَفَّارِ ۝ لَا جَرَمَ أَنَّمَا تَدْعُونَنِي
إِلَيْهِ لَيْسَ لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ وَأَنَّ

کوئی حصہ تم پر آ کے رہے گا۔ اللہ اس شخص کو کامیاب نہیں کرتا جو زیادتی
کرنے والا اور جھوٹا ہے۔ اے میری قوم کے لوگو، آج تم کو اختیار حاصل
ہے اور ملک میں غالب ہو (اس وجہ سے موسیٰ کو قتل کر سکتے ہو) لیکن
اللہ کے عذاب سے ہم کو کون بچا سکے گا اگر وہ آ گیا؟ فرعون نے کہا میں
تم کو وہی مشورہ دے رہا ہوں (موسیٰ کے قتل کے بارہ میں) جو میرے نزدیک
صحیح ہے اور میں ٹھیک راستہ کی طرف تمہاری رہبری کر رہا ہوں۔ اور جو شخص
ایمان لایا تھا اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو (اگر تم نے موسیٰ پر ہاتھ اٹھایا)
تو تم پر بھی ویسا ہی عذاب آئے گا جیسا کہ گذشتہ جماعتوں پر آیا۔ (اور وہی
حال ہوگا) جو نوح کی قوم اور عاد و ثمود اور ان لوگوں کا ہوا جو ان کے بعد
آئے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں چاہتا اور اے میری قوم کے لوگو
مجھے ڈر ہے کہ تم پر ہانک پکار کا دن آ دھمکے جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے
اور تم کو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے
تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس
کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آیا تو تم اس کی لائی ہوئی باتوں کے متعلق برابر شک میں
پڑے رہے یہاں تک کہ جب وہ مر گیا تو تم نے کہا اب اس کے بعد اللہ کوئی رسول
نہیں بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ گمراہ کر دیتا ہے ان لوگوں کو جو زیادتی کرنے والے
اور شک میں پڑنے والے ہوتے ہیں۔ جو لوگ اللہ کی آیات کے بارہ میں بغیر کسی
دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، ہٹ دھرمی کرتے ہیں، ان کا رویہ اللہ
اور اہل ایمان کے نزدیک نہایت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر
کر دیتا ہے ہر متکبر اور سرکش کے دل پر۔ اور فرعون نے کہا اے ہامان میرے لیے
ایک محل بنوا تاکہ میں بلندیوں پر پہنچوں، آسمانوں کی بلندیوں پر، اور موسیٰ کے
رب کو دیکھوں۔ میں تو اس کو بالکل جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ اسی طرح فرعون
کی نظروں میں اس کی بدعملی کھبا دی گئی اور وہ راہ حق سے روک دیا گیا
اور فرعون کی مکاری کو نابود ہی ہونا تھا۔ اور جو ایمان لایا تھا اس نے کہا
اے میری قوم کے لوگو میری پیروی کرو کہ میں تمہاری رہنمائی راہ حق کی طرف
کروں۔ اے میری قوم یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے، ہمیشگی کا گھر تو
آخرت ہے۔ جس نے کوئی بدی کی تو صرف اس کے مانند بدلہ پائے گا

تَرَدَّنَا اِلَی اللّٰہِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ ھُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝ فَسَتَذْکُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَکُمْ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ فَوَقٰىہُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِ مَا مَکَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ (المومن)

جس نے نیکی کمائی، خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو وہی لوگ جنت میں جائیں گے اور اس میں بے حساب روزی پائیں گے۔ اے میری قوم کے لوگو کیا بات ہے، میں تمھیں نجات کے راستہ کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے جہنم کی طرف پکار رہے ہو؟ تم مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور اس کا کسی ایسی چیز کو ساجھی قرار دوں جس کے بارہ میں مجھے کوئی علم نہیں اور میں تم کو خدائے عزیز و غفار کی طرف دعوت دے رہا ہوں۔ بلا شبہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو اس کا بلاوا کہیں نہیں ہے۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ ہمارا لوٹنا تو اللہ کی طرف ہوگا اور زیادتی کرنے والے جہنم میں ہوں گے تو اس وقت تم یاد کروگے جو کچھ میں کہتا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ بے شک اللہ بندوں کا نگران حال ہے۔ پس اللہ نے اس کو ان کی تدبیروں کے شر سے بچایا اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔

یہ پوری تقریر جو عین فرعون کے دربار میں ہوئی ہے اور ایک ایسے شخص نے کی ہے جو آل فرعون میں سے ہے، بار بار پڑھیے۔ اس میں بیچ بیچ میں فرعون کی طرف سے مداخلتیں بھی ہوئی ہیں، ان کو بھی پیش نظر رکھیے اور پھر غور کیجیے کہ کیا فی الواقع حضرت موسیٰ اور فرعون کی یہ ساری کشمکش بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے تھی یا یہ کفر و ایمان، توحید و شرک اور حب دنیا اور ایمان بالآخرۃ کی وہی کشمکش ہے جو ہر نبی اور اس کی قوم کے مستکبرین کے درمیان برپا ہوتی رہی ہے؟ اس میں تو بنی اسرائیل کی آزادی و غلامی کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں آتا۔ نہ استغاثہ کی طرف سے نہ صفائی کی طرف سے۔ فرعون حضرت موسیٰؑ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ یہ قوم کا (قبطیوں کا) دین بگاڑ رہے ہیں اور اس کی خدائی کے خلاف بغاوت برپا کر رہے ہیں اس وجہ سے مستحق ہیں کہ قتل کر دیے جائیں۔ یہ مرد حق اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ایک شخص کو محض اس جرم میں قتل کرنا کہ وہ صرف اللہ واحد کو اپنا رب مانتا ہے، کوئی انصاف کی بات نہیں ہے، درانحالیکہ اس کے پاس خدا کی نشانیاں بھی موجود ہیں۔ اگر یہ زیادتی کی گئی تو اس کا وبال پوری قوم پر آکے رہے گا۔ فرعون کہتا ہے رائے صائب وہی ہے جو میں دے رہا ہوں۔ مرد مومن اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اگر اس رائے پر عمل کیا گیا تو قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور دوسری معذب قوموں کے انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہیے۔ پھر یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ موسیٰ ہمارے پاس اسی طرح کی دعوت حق لے کر آئے ہیں جیسی حضرت یوسف لے کر آئے تھے لیکن آپ لوگوں کا دل ان کی دعوت پر بھی نہیں جما اور پھر اپنے لیے کسی رسول کی بعثت کی طرف سے آپ لوگ بالکل بخنت ہو کے بیٹھ گئے اور اب اللہ کی آیات کے بارہ میں خواہ مخواہ کی ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد اپنی پوری قوم کے سامنے آخرت پر، جنت و دوزخ پر، کفر و شرک پر نہایت موثر خطبہ دیتے ہیں اور لوگوں کو نجات کے راستہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ پھر آخر میں ان سے مایوس ہو کر اپنا معاملہ اللہ کے حوالہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہت جلد میری نصیحتوں کو یاد کروگے اور اپنی غلطی پر پچھتاؤگے۔ اس کے بعد اس بات کا بھی ذکر آتا ہے کہ ان کی قوم نے ان کے قتل کی بھی تدبیریں کیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بچایا اور اغلب ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انھوں نے بھی ہجرت فرمائی۔

اگر یہ سارا جھگڑا بنی اسرائیل کی آزادی ہی کے لیے تھا اور کفر و ایمان اور شرک و توحید کے بجائے حاکم و محکوم محض اس بات کے لیے لڑ رہے تھے کہ محکوم قوم کو اپنی تعمیر باختیار خود کرنے کا حق ملنا چاہیے تو اس طرح کی آویزش کا نتیجہ یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ

قبطیوں کے اندر ایسے ایسے کامل الایمان اور صدیق پیدا ہوں۔ اس طرح کی نزاع جو دو قوموں میں محض سیاسی برتری کے لیے برپا ہو اور جو خالص نسلی فرق و امتیاز کے مطالبات پر قائم ہو اس کا لازمی نتیجہ تو یہ ہونا تھا کہ ایک قوم دوسری قوم کی من حیث القوم دشمن ہو اور اس کے مذہب اور اس کی روایات سے نفرت کرے۔ اور اگر محض انسانی ہمدردی کے داعیہ کی وجہ سے کچھ افراد ایسے نکل بھی آئیں جن کو مظلوم کے مطالبات سے کچھ ہمدردی ہو جائے تو وہ ہمدردی زیادہ سے زیادہ اس نوعیت کی ہو سکتی ہے جس طرح کی ہمدردی بعض نیک مزاج انگریز ہندوستانیوں کے مطالبات کے ساتھ کرتے ہیں لیکن یہ تو عجیب بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قبطیوں سے لڑائی تو محض بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کے لیے لڑیں لیکن اس لڑائی کے نتیجہ کے طور پر قبطیوں کے اندر اس طرح کے اہل الایمان پیدا ہوں جس طرح کے اہل الایمان آنحضرت صلعم کی دعوت سے قریش کے اندر پیدا ہوئے۔

اس سلسلہ کی آخری بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مصر سے ہجرت اور فرعون اور اس کی فوج کا غرق ہونا ہے۔ جس وقت فرعون موجوں کے گھیرے میں آجاتا ہے اس وقت بے تحاشا اس کی زبان سے وہ بات نکل جاتی ہے جس کی حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو دعوت دے رہے تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انتہائی جد و جہد کے باوجود وہ اسے نہ ماننے پر اڑا رہا۔ یعنی اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت کی دعوت۔

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِہٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۔ آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ وَ کُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ (یونس)

یہاں تک کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو پکار اٹھا کہ میں ایمان لایا اس بات پر کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ جس پر ایمان لائے ہیں بنی اسرائیل اور میں اطاعت کرنے والوں میں ہوں۔ اب ؟ حالانکہ تم نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تم فساد برپا کرنے والوں میں تھے۔

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ایمان و اسلام کی دعوت لے کر نہیں گئے تھے، صرف بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ لے کر گئے تھے تو اس کو آخری وقت میں ایمان و اسلام کے اقرار کے بجائے یہ کہنا تھا کہ "ہائے میری بدبختی میں نے بنی اسرائیل کو رہا کیوں نہ کیا" یہ ایمان و اسلام کا اقرار تو صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ساری کشمکش درحقیقت ایمان و اسلام کے لیے تھی نہ کہ بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کے لیے۔

ان تمام باتوں پر غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک قوم پرست لیڈر کی طرح فرعون اور اس کی قوم کے پاس اپنی قوم کی آزادی کے لیے نہیں بلکہ وہ دعوت لے کر گئے تھے جو حضرات انبیائے کرام ہمیشہ اپنی اپنی قوموں کے مستکبرین کے پاس لے کر گئے۔ یہ دعوت انھوں نے پیش کی۔ اس کے لیے انھوں نے مناظرے اور مجادلے کیے۔ معجزات دکھائے اللہ تعالیٰ کی حجت تمام کی۔ یہاں تک کہ یہ حجت اس قدر واضح ہوئی کہ مستکبرین کے اندر سے جو لوگ نیک فطرت رکھتے تھے انھوں نے بھی اس کو قبول کر لیا اور پھر پوری قوت کے ساتھ اس دعوت کو بلند کرنے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا۔ لیکن جب خود اپنے ضمیر کی آواز سن لینے کے بعد بھی فرعون اور اس کے مفسد ارکان و اعیان نہ صرف اپنے کفر و شرک ہی پر اڑے رہے بلکہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا بھی ارادہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے مطابق جو اس نے انبیاء کے لیے

مقرر کر دی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اہل ایمان کے ساتھ ہجرت فرمائی اور فرعون اور اس کی قوم پر خدا کا عذاب آگیا۔ اور یہ تھا کی یہی سنت تمام انبیاء اور ان کے جھٹلانے والوں کے اندر جاری رہی ہے اور یہی ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے جھٹلانے والوں کے درمیان دیکھتے ہیں۔ دوسرے انبیاء اور ان میں اگر فرق ہے تو دعوت اور مقاصد دعوت میں نہیں ہے اور نہ دعوت کے مدارج و مراحل میں ہے۔ صرف اس بات میں فرق ہے کہ ان کی قوم کے مستکبرین و مترفین نسل کے لحاظ سے مختلف تھے اور دوسرے بہت انبیاء کی قوموں کے مستکبرین خود انہی کے اندر کے تھے لیکن یہ کوئی ایسا جوہری فرق نہیں کہ اس کی وجہ سے نبی کی دعوت میں کوئی فرق پیدا ہو جائے۔ اور وہ اللہ کے رسول کی جگہ ایک نیشنلسٹ لیڈر کی پوزیشن اختیار کرے۔

حضرت موسیٰؑ کا کام بنی اسرائیل کے اندر اب اسی طرح اس سوال پر غور کیجیے کہ مصر کی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے اندر کیا کام کیا؟ کیا کفر و اسلام اور شرک و توحید کا سوال چھیڑے بغیر انھوں نے ہر اسرائیلی کو آزادی کے مطالبہ پر جمع کر لیا اور ان کے کافر و مومن میں کوئی فرق نہیں کیا یا تمام انبیاء کی طرح انھوں نے بھی اپنی قوم کو ایمان و اسلام کی دعوت دی اور جن لوگوں نے ان کی دعوت قبول کی انہی سے اپنی جماعت بنائی؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلا حکم جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا وہ یہ ہے۔

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ○ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ

اور میں نے تم کو انتخاب کیا تو سنو وہ بات جو تم پر وحی کی جاتی ہے لاریب میں ہی اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی معبود مگر میں پس میری ہی بندگی کرو اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔ قیامت آکے رہے گی۔

یہ توحید، معاد، اور قیام نماز کا وہی حکم ہے جو ہر نبی کو اول اول بطور اصول دین تلقین کیا جاتا ہے اور اسی کو لے کر وہ اپنی قوم میں جاتا ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ احکام ملیں اور وہ ان کی پروا کیے بغیر بنی اسرائیل کو محض نسلی عصبیت کے نعرہ پر، فرعون اور اس کی قوم سے آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے جمع کرنا شروع کر دیں۔

اس سلسلہ کی دوسری نہایت اہم آیت یہ ہے:۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی آیتوں کے ساتھ کہ نکالو اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور ان کو یاد دلاؤ اللہ کی نعمت و نقمت کے دن بے شک اس کے اندر ہیں دلیلیں ہر ثابت قدم اور شکر گزار کے لیے۔

اپنی قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لیجانا ہر پیغمبر کا فرض منصبی ہے اور تقریباً انہی الفاظ میں قرآن مجید نے ہر نبی کی صفت بیان کی ہے کہ وہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لیجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تاریکی سے مراد عقائد و اعمال کی ظلمت اور روشنی سے مراد ایمان و اسلام کی روشنی ہے۔ اور جب اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ قوم کو عقائد و اعمال کی تاریکیوں میں چھوڑ کر صرف اس کی سیاسی آزادی کی فکر میں پڑ جاتے۔

اب اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان کاموں کو دیکھیے جو انھوں نے مصر کی بالکل ابتدائی زندگی میں اپنی قوم کے اندر کیے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۚ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ

پس موسیٰ پر ایمان نہ لائے مگر اس کی قوم کے کچھ نوجوان فرعون اور اپنے سرداروں سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ کسی آفت میں نہ ڈال دیں۔ بے شک فرعون ملک میں مستبد اور زیادتی کرنے والا تھا۔ اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم کے لوگو اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر توکل کرو اگر تم مسلم ہو۔ انھوں نے کہا ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا۔ اے ہمارے پروردگار ہم کو ظالموں کے فتنہ کا نشانہ نہ بنا اور ہم کو اپنی رحمت سے کافروں کی قوم سے نجات دے۔ اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کے پاس وحی بھیجی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز قائم کرو اور ایمان والوں کو خوش خبری دو۔ اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے پروردگار تونے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور مال دیا ہے تاکہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں۔

. . . .

یہ اس وقت کا حال بیان ہوا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت شروع ہوئی ہے۔ اس کا تجزیہ کرکے دیکھیے کہ مصر کی ابتدائی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اردگرد بنی اسرائیل کے جو افراد اکٹھے ہوئے تھے وہ کس دعوت پر جمع ہوئے تھے؟ ان کے سامنے اخلاق و عمل کے کیا اصول تھے؟ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے کس اعتبار سے علٰحدہ سمجھتے تھے؟ مصر کی زندگی میں ان کو خاص تربیت کس بات کی دی جارہی تھی؟ اور فرعون اور اس کی قوم سے ان کی لڑائی کس بات کے لیے تھی؟

الف۔ ان آیات سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائے دعوت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر صرف تھوڑے سے نوجوان ایمان لائے۔ اور انہی مومنین سے ان کی جماعت بنی۔ یہ نہیں ہوا کہ محض قومی نعرہ پر انھوں نے ہر اسرائیلی کو اپنے پیچھے لگا لینے کی کوشش کی ہو۔

ب۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مناسب مواقع پر اپنے صحابہ کو ایمان و اسلام کے مقتضیات و مطالبات سمجھاتے رہتے تھے چنانچہ ابتدائی دور میں جب اندیشہ ہوا کہ فرعون کی طرف سے ان کے ساتھیوں پر سختیاں ہوں گی تو انھوں نے لوگوں کو ایمان و اسلام کی حقیقت سمجھائی کہ اگر ایمان و اسلام کا دعویٰ لیکر اٹھے ہو تو خدا پر پورا بھروسہ رکھو اور ان کے صحابہ نے یہ کہا کہ ہم اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ بعینہٖ یہی بات سورہ اعراف میں بھی بیان ہوئی ہے۔ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو۔ بے شک ملک اللہ کا ہے جس کو چاہے اپنے بندوں میں سے دے اور انجام کار کی کامیابی اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہے)

ج۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ نسلی قومیت کے اختلاف کی وجہ سے فرعون اور اس کی قوم سے نجات نہیں چاہتے

تھے بلکہ قوم کافر کے ظلم وستم سے نجات چاہتے تھے (وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ) جس کے معنی یہ ہیں کہ قبطیوں سے ان کی نزاع عقائد واصول کی نزاع تھی نہ نسل ونسب کی۔ اور سیاسی ومعاشی مفاد کی۔

د۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر کی ابتدائی زندگی ہی میں حکم ملا کہ مصر میں مختلف مسجدیں تعمیر کرکے اور (غالباً) اپنی مسجد کو مرکز بنا کر نماز کا اہتمام کریں۔ یہ وہی تربیت وتزکیہ ہے جو ہر نبی کی دعوت میں ہم کو سب سے مقدم اور سب سے زیادہ اہم چیز کی حیثیت سے نظر آتی ہے۔

ک۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ نماز قائم کرنے والے اہل ایمان کو اللہ کی تائید ونصرت کی بشارت دو (وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ) یہ نہیں کہا گیا کہ بنی اسرائیل کو بشارت دو۔

و۔ آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی ہے اس میں فرعون کی یہ شکایت نہیں کی ہے کہ اس نے اقتدار پاکر ان کی قوم کی خود مختاری چھین لی ہے بلکہ یہ شکایت کی ہے کہ (رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ) اے پروردگار ان کا مال وجاہ اس لیے ہے کہ وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں۔

ان ساری باتوں کو سامنے رکھکر غور کیجیے کہ کیا یہ بعینہٖ وہی دعوت نہیں ہے جو مکہ کی زندگی میں آنحضرت صلعم نے دی اور کیا یہ وہی تربیت نہیں ہے جو ہجرت سے پہلے صحابہ کو دی گئی؟ کیا ان واضح دلائل کے بعد بھی اس غلط فہمی میں پڑنے کا کوئی موقع ہے کہ مصر کی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے کافر ومومن میں کوئی فرق نہیں کیا بلکہ ان کو بحیثیت بنی اسرائیل آزادی کے مطالبہ پر متفق کرنے کی کوشش کی؟

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تنظیم، بلالحاظ کفر وایمان، مجرد نسلی قومیت پر مبنی ہوتی تو مشہور اسرائیلی سرمایہ دار، قارون، اس سے الگ نہ رکھا جاتا بلکہ جس طرح وطنی اور نسلی قومیت کی اساس پر اٹھنے والی تحریکیں برلا، ڈلمیا، بجاج اور سیٹھوں، حاجیوں، بینکروں اور تعلقہ داروں کو اپنانے کی کوشش کرتی ہیں اور آسانی سے اپنا لیتی ہیں اسی طرح حضرت موسیٰؑ بھی نہایت آسانی سے اس کو اپنی تحریک کا ایک لیڈر بنا لیتے لیکن ہوا یہ کہ آل فرعون کا ایک مومن، جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، موسیٰ علیہ السلام کی تنظیم میں داخل ہو جاتا ہے لیکن بنی اسرائیل کا یہ "سب سے بڑا آدمی" فرعون وہامان کے زمرہ میں داخل کر دیا جاتا ہے وَقَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ (اور قارون، فرعون اور ہامان کو یاد کرو۔ ان کے پاس موسیٰ کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے ملک میں سرکشی کی اور ہم سے بھاگ نہ سکے) دوسری جگہ ہے۔ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُبِينٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُونَ فَقَالُوا سَاحِرٌ كَذَّابٌ (اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور کھلی ہوئی حجت کے ساتھ، فرعون وہامان وقارون کی طرف تو انھوں نے کہا یہ جھوٹا ساحر ہے) اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی اپنی قوم کے اس سب سے بڑے آدمی پر یہ الزام نہیں لگاتے کہ یہ "سرکار پرست" ہے، "قومی غدار" ہے، "رجعت پسند" ہے، "اسرائیلی لیگ کا دشمن" ہے بلکہ اس پر یہ الزام ہے کہ "خدا کا باغی" ہے، "مغرور ومتکبر" ہے، "آخرت کا منکر" ہے، خدا کی نعمتوں کو اپنی لیاقت کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور اس کو جو دعوت دی گئی وہ بھی یہ نہیں ہے کہ اگر "اسرائیلی ہے تو بنی اسرائیل کے ساتھ آ"۔ اگر "ہماری قوم میں سے

ہے تو قوم کی آزادی کی جد و جہد میں حصہ لے" بلکہ اس کو یہ دعوت دی گئی کہ "زمین میں غرور نہ کر" "اللہ کی نعمتوں کو حصول آخرت کا ذریعہ بنا" "جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو خلق پر احسان کر" "زمین میں خدا سے بغاوت نہ کر"۔ سورہ قصص میں یہ پوری تفصیل پڑھ لیجیے۔ ہم صرف چند آیتیں نقل کریں گے۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي

بے شک قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا تو اس نے ان پر سرکشی کی اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے جن کی کنجیاں ایک طاقتور جماعت سے اٹھتی تھیں۔ یاد کرو جب اس سے اس کی قوم نے کہا (یعنی قوم کے اہل ایمان نے) اترا مت، اللہ اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو نعمت تجھے خدا نے دے رکھی ہے اس میں دار آخرت کا سامان کر اور دنیا میں سے اپنا حصہ نہ بھول اور احسان کر جیسا کہ اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے اور زمین میں فساد نہ چاہ۔ اللہ تعالیٰ فساد برپا کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ بولا یہ سب تو مجھے اپنے علم کی بدولت ملا ہے۔

ایک دن اس کی شان و عظمت دیکھ کر بنی اسرائیل کے بعض کمزور لوگوں نے جب یہ خواہش کی کہ کاش یہی شان و عظمت انہیں بھی حاصل ہوتی تو اہل ایمان نے انھیں سمجھایا کہ "وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ" (تم پر افسوس ہے، اللہ کا اجر اس سے بہتر ہے ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے اور یہ حکمت صرف صابروں کو ملتی ہے) پھر قارون کی ساری عظمت و شوکت کی تباہی کا جب تماشا دیکھ لیا تو وہی لوگ جو اس کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، پکار اٹھے "لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ" (کافر فلاح نہیں پاتے) اس سے معلوم ہوا کہ قارون سے، باوجودیکہ وہ ایک اسرائیلی تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اختلاف محض کفر و ایمان کی بنا پر تھا۔

کیا اس تفصیل کے بعد بھی کوئی شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر میں بنی اسرائیل کے کفر و ایمان سے کوئی تعرض نہیں کیا اور صرف اسرائیلیت کی اساس پر انھوں نے بنی اسرائیل کی تنظیم محض اس مقصد کے لیے کی کہ اپنی قوم کو فرعون کی غلامی سے آزاد کر لیں؟

مصر کی ابتدائی زندگی میں، بعثت سے پہلے، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک ایسا فعل صادر ہو گیا جو قومی غیرت و حمیت کے نقطۂ نگاہ سے نہایت محمود تھا اور اگر وہ ایک نیشنلسٹ لیڈر ہوتے تو ان کا یہ کام نہایت شاندار کارناموں میں گنا جاتا کیونکہ قومی حمیت کے اعتبار سے کوئی شخص بھی اس کو مذموم نہیں قرار دے سکتا لیکن خدا کے انبیاء کسی قوم کے حریف یا کسی قوم کے دوست بنکر نہیں آتے بلکہ صرف باطل کے حریف اور حق کے دوست بنکر آتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا یہی فعل، جو قومی حمیت کے نقطۂ نگاہ سے نہایت قابل فخر تھا، ان کی نظر میں شدید گناہ قرار پایا اور بار بار توبہ کرنے کے باوجود ان کے دل سے اس گناہ کی کھٹک نہیں نکلی۔

وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفْلَةٍ مِّنْ أَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِن شِيعَتِهِ

اور موسیٰ شہر میں ایسے وقت داخل ہوا کہ شہر کے باشندے ابھی غافل ہی تھے تو دیکھا کہ وہاں دو شخص لڑ رہے ہیں ایک اس کی قوم

وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰی فَقَضٰی عَلَیْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ

(بنی اسرائیل) کا ہے اور دوسرا اس کے دشمنوں (قبطیوں) میں سے ہے تو اس سے مدد چاہی اس کی قوم کے آدمی نے اس شخص کے خلاف جو اس کے دشمنوں میں سے تھا تو موسیٰ نے اس کے تھپڑ ماری اور اس کا خاتمہ ہو گیا۔ موسیٰ فوراً پکار اٹھا یہ شیطانی کام ہو گیا بے شک شیطان کھلا ہوا گمراہ کرنے والا ہے اور دعا کی کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی جان پر ظلم ڈھایا، تو مجھے معاف کر، تو اس نے اس کو معاف کیا، بے شک وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ پھر کہا اے میرے پروردگار چونکہ تو نے مجھ پر فضل فرمایا ہے اس لیے اب میں مجرموں کا مددگار کبھی نہ بنوں گا۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہی اسرائیلی جو کل ایک قبطی سے لڑ رہا تھا آج ایک دوسرے قبطی کے ساتھ الجھا ہوا ہے اور اس نے ان کو دیکھتے ہی پھر مدد کے لیے پکارا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو سختی سے ڈانٹا کہ "انک لغوی مبین" تو نہایت کھلا ہوا شریر ہے اور مجرموں کی مدد نہ کرنے کا جو وعدہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا اس پر قائم رہے۔

یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے کی زندگی کا ہے جبکہ ان پر ایمان و عدل کے اصول ابھی الہام بھی نہیں ہوئے تھے اور ایک غیور نوجوان ہونے کے لحاظ سے قومی حمیت ان کے لیے سب سے زیادہ قوی محرک ہو سکتی تھی بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ان کی قوم مصر میں قبطیوں کے ہاتھوں اس سے زیادہ ذلیل ہو رہی تھی جتنے کہ امریکنوں کے ہاتھوں ریڈ انڈین یا انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانی تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے کسی قوم کے بحیثیت قوم حامی اور کسی قوم کے بحیثیت قوم حریف بننے سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ سے صرف حق و عدل کا ساتھ دینے کا عہد باندھا اور اس عہد کی جانچ کا اتفاق دوسرے ہی دن جب موقع پیدا ہو گیا تو وہ اللہ کی توفیق سے اس عہد پر قائم رہے۔ غور کا مقام ہے کہ جو حضرت موسیٰ اپنی بعثت سے پہلے کی زندگی میں، اپنے اللہ سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ میں کسی مجرم کا حامی نہ بنوں گا، خواہ وہ میری قوم کا آدمی ہو، انہی حضرت موسیٰ پر ہمارے بزرگان دین یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ بعثت کے بعد کی زندگی میں اپنی قوم کے بحیثیت قوم حامی بن گئے۔ ان کے کافر و مومن، اور نیکوکار و بدکار میں انھوں نے کوئی فرق نہیں کیا۔

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ کی صحیح تفسیر

اس ساری بحث کے بعد ان حضرات کی تیسری غلط فہمی سے تعرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ قومی آزادی کے ایک مقدس فریضہ ہونے کی ساری دلیل درحقیقت ان دو بنیادی غلط فہمیوں پر قائم تھی جن کی نہایت تفصیل کے ساتھ ہم تردید کر چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور ان کے کاموں کی صحیح نوعیت واضح ہو جانے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ دنیا میں جتنے نبی بھی آئے وہ ایک ہی مقصد کی دعوت لے کر آئے۔ یعنی خالص اللہ کی بندگی اور اطاعت کی دعوت۔ ان سب کے نزدیک تمام نیکیوں اور سعادتوں کا سرچشمہ اللہ کی بندگی اور اطاعت ہے اور تمام برائیوں کی جڑ خدا کی بندگی اور اطاعت سے انحراف ہے۔ ان کے نزدیک آزادی کا بھی مفہوم یہ ہے کہ کسی انسان کی گردن میں اللہ کی اطاعت کے سوا کسی اور کی اطاعت کا قلادہ نہ ہو اگرچہ وہ" اور" انسان کی

خود اپنی ہی قوم، یا اپنا ہی قبیلہ بلکہ اپنا ہی نفس ہو اور غلامی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان غیر اللہ کی بندگی اور اطاعت کرے اگرچہ وہ غیر اپنی ہی قوم، اپنا ہی قبیلہ اور اپنا ہی نفس ہو۔ ان کے نزدیک یہ ظلم کبیر ہے کہ کوئی قوم کسی قوم سے بجبر اپنی اطاعت کرائے اور یہ ظلم اکبر ہے کہ کوئی قوم باختیار خود اپنے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت کرے۔ یہ دونوں ہی باتیں شرک ہیں اور انبیاء کا طریقہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ظلم کبیر کی مخالفت کریں اور دوسرے ظلم اکبر کو برپا کرنے کے لیے خود قیادت کا علم لے کر اٹھیں۔ پس اس بات کے لیے تو کوئی وجہ جواز نہیں ہو سکتی کہ جس فساد میں فرعون اور اس کی قوم کے لوگ مبتلا تھے اسی فساد کا حق اپنی قوم کے لیے حاصل کرنے کی تحریک حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھائیں۔ وہ اگر کر سکتے تھے تو صرف یہ کام کر سکتے تھے کہ حاکم و محکوم دونوں کو احکم الحاکمین کی بندگی و اطاعت کی دعوت دیں۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ انھوں نے یہ کام نہ کیا ہو۔ فرعون اور اس کی قوم سے بنی اسرائیل کی علیحدگی کی کوئی وجہ اگر ہو سکتی تھی تو یہ نہیں کہ یہ علیحدہ قوم ہیں اور وہ علیحدہ۔ بلکہ صرف یہ ہو سکتی تھی کہ یہ مومن ہیں اور وہ کافر۔ دو قوموں کا مجرد نسلی اور وطنی امتیازات کی بنا پر الگ الگ اپنی حاکمیت کا علم گاڑنا تو وہ عصبیت جاہلیت ہے جس پر انبیاء لعنت کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں نہ کہ اس کی تحریک چلانے کے لیے۔ پس فرعون اور اس کی قوم کے لوگ اگر ایمان لاتے اور اپنی حاکمیت کے دعوے سے اللہ واحد کے حق میں دست بردار ہو جاتے تو بنی اسرائیل اور وہ ایک باپ کے بیٹوں اور ایک خدا کے بندوں کی طرح ایک گھر میں بس سکتے تھے۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر جھگڑا کس بات کا تھا؟ اس بات کا کہ فرعون اور اس کی قوم کے لوگ کیوں حاکم ہیں، بنی اسرائیل کیوں حاکم نہیں ہیں یا اس بات کا کہ اللہ واحد کی حکومت کیوں نہیں ہے، فرعون کی حکومت اور خدائی کیوں ہے؟ اگر جھگڑا موخر الذکر بات کے لیے تھا اور یقیناً اسی بات کے لیے ہو سکتا تھا تو ٹھیک راہ یہی تھی کہ حضرت موسیٰ اپنے عہد کے مستکبرین کو دعوت ایمان و اسلام دیتے اور قرآن مجید سے ثابت ہے کہ یہی انھوں نے کیا اور ان کی دعوت کی یہی کشش تھی کہ فرعون کی قوم کے اہل حق ان کی بات پر ایمان لائے ورنہ اگر ایک نسلی نزاع ہوتی تو حضرت موسیٰ کی بات ان کے قومی دشمنوں کو کیوں اپیل کرتی؟

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اس بات پر غور کیجیے کہ حضرت موسیٰ اور ہارون نے فرعون سے یہ جو مطالبہ کیا کہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دو) اس کا مطلب کیا ہے؟ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت بیان کرتے ہوئے کئی جگہ ان کے اس مطالبہ کا ذکر ہوا ہے لیکن جس طرح بنی اسرائیل کی تاریخ کے واقعات ہر جگہ قرآن میں اختصار و اجمال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اسی طرح یہ بات بھی اجمال ہی کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ کسی جگہ بھی اس بات کی تشریح نہیں ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو کس مقصد کے لیے اور کہاں لیجانا چاہتے تھے۔ البتہ اتنی بات قرآن مجید اور تورات دونوں سے واضح ہے کہ یہ مطالبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بالکل ابتدائی مطالبات میں سے ہے۔ ہمارے یہ علماء جو نیشنلزم کو بھی انبیاء کا لایا ہوا دین سمجھتے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو مصر سے نکال کر دوسرے ملک میں لے جانا چاہتے تھے لیکن اوپر کے مباحث سے یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون اور اس کی قوم کی طرف بحیثیت رسول اور شاہد کے آئے تھے اور یہی حیثیت ان کی بنی اسرائیل کے لیے بھی تھی تو کوئی نبی اتمام حجت و دعوت کے بغیر، ان لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتا جن کی طرف وہ رسول بنا کر بھیجا گیا ہو۔ ہر پیغمبر کے فرائض رسالت میں سے یہ بات ہے کہ وہ لوگوں کو دعوت حق دے۔ اس دعوت کو پھیلانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے

اپنی دعوت کو قوم کے ایک ایک فرد کے کانوں تک پہنچائے۔ اور حق کو واضح کرنے کے لیے تمام ممکن وسائل استعمال کرے اور ایک مدت تک اپنی بہترین عملی سیرت اور بہترین قولی تبلیغ سے حق کو اتنا آشکارا کردے کہ جو لوگ اس کا انکار کرنا چاہیں ان کے پاس عناد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی اور پناہ باقی نہ رہ جائے۔ یہ سارے جتن کرنے کے بعد جب وہ ان کے قبول حق سے بالکل مایوس ہو جائے اور قوم اس کی جان کے درپے ہو جائے تب وہ اللہ کے اذن سے ان کو چھوڑ کر ہجرت کرے۔ لیکن اَرۡسِلۡ مَعَنَا کی جو تفسیر یہ حضرات کرتے ہیں اس تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہ فرعون کے کفر و ایمان سے بحث تھی نہ بنی اسرائیل کی تعلیم و تربیت سے کوئی غرض تھی بلکہ وہ آنے سے پہلے ہی جانے کا پروانہ لے کر آئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے پہنچتے ہی فرعون کے سامنے یہ مطالبہ رکھ دیا کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر۔ یہ بات تمام انبیاء کی سنت کے بھی خلاف ہے اور قرآن کے بیان کے بھی، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، بالکل خلاف ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس آیت کا صحیح مطلب معلوم کیا جائے۔

ہمارے نزدیک اصول یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے جو واقعات قرآن مجید میں مجمل بیان ہوئے ہیں ان کی وضاحت کے لیے توریت کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور توریت کا بیان اگر قرآن کے بیان یا اس کے کسی اصول کے خلاف نہ پڑے تو اس توضیح کو قبول کرنا چاہیے۔ اور بالخصوص ان مواقع میں تو توریت کا بیان بالکل غیر مشتبہ ماننا چاہیے جہاں کوئی بات مرتبین توریت کی خواہش کے بالکل خلاف مسخ و تحریف سے بچ رہی ہے۔ اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ توریت میں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کی تاریخ بالکل ایک قومی آزادی کی جد و جہد کے رنگ میں پیش کی گئی ہے، اور اس کو پڑھتے ہوئے بار بار ایسا گمان ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ جو مطالبہ کرتے ہیں کہ "میرے لوگوں کو جانے دے" تو ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان کو آزاد کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس ذوق کے لوگوں کے لیے یہ بات بڑی ہی اپیل کرنے والی ہو سکتی تھی کہ خدا کا ایک جلیل القدر پیغمبر ان کی آزادی کا مطالبہ لے کر مبعوث ہوا۔ چنانچہ اپنی برتری کے نشہ میں انھوں نے بہت سی باتوں کو جو ایک بالکل ہی مختلف پہلو رکھتی تھیں، بالکل قومی رنگ دے دیا ہے لیکن تعجب ہے کہ "ارسل معنا" کی تفسیر توریت میں اس سے بالکل مختلف ہے جو یہ حضرات بیان کرتے ہیں۔ اور تفسیر ایسی ہے کہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کا انکار کیا جائے۔ ہم پہلے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ اس کے متعلق توریت میں جو کچھ ہے اس کو پیش کرتے ہیں اس کے بعد اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں گے۔

توریت کی کتاب الخروج میں اس مطالبہ کا ذکر بار بار آیا ہے۔ بعض جگہ تو جس طرح قرآن مجید میں مجمل ہے اسی طرح تورات میں بھی مجمل ہے لیکن پھر دوسرے مقامات میں ایسی تفصیلات آگئی ہیں کہ پوری بات صاف ہو جاتی ہے۔ کتاب الخروج باب ۳ ۱۸-۲۰ میں خداوند خدا حضرت موسیٰ اور ہارون کو فرعون سے یہ مطالبہ کرنے کا حکم دیتا ہے:-

"اب تو ہم کو تین دن کی منزل بیابان میں جانے دے تاکہ ہم خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں اور میں جانتا ہوں کہ مصر کا بادشاہ نہ تم کو یوں جانے دے گا نہ بڑے زور سے۔ سو میں اپنا ہاتھ بڑھاؤں گا اور مصر کو ان سب عجائب سے جو میں اس میں کروں گا، مصیبت میں ڈالوں گا۔ اس کے بعد وہ تم کو جانے دے گا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قربانی کرنے کے لیے، پوری قوم کے ساتھ کسی ایسے مقام پر جانا چاہتے تھے جو بیابان میں تین دن کی منزل پر تھا۔ اس مقام کے بارہ میں محققین میں اختلاف ہے اور ہم یہاں اس بحث میں نہیں

پڑھنا چاہتے۔ اس کے بعد اس کی کچھ مزید تفصیل آتی ہے۔

"خداوند خدا اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دے تاکہ وہ بیابان میں میرے لیے عید کریں۔ فرعون نے کہا کہ خداوند کون ہے کہ میں اس کی بات کو مان کر اسرائیل کو جانے دوں۔ میں خداوند کو نہیں مانتا اور میں اسرائیل کو جانے بھی نہیں دوں گا۔ تب انھوں نے کہا عبرانیوں کا خدا ہم سے ملا ہے سو ہم کو اجازت دے کہ ہم تین دن کی منزل بیابان میں جاکر خداوند اپنے خدا کے لیے قربانی کریں تا نہ ہو کہ وہ ہم میں وبا بھیجدے یا ہم کو تلوار سے مروا دے۔ تب مصر کے بادشاہ نے ان کو کہا اے موسیٰ اور اے ہارون تم کیوں ان لوگوں کو ان کے کام سے چھڑواتے ہو۔ تم جاکر اپنے اپنے بوجھ کو اٹھاؤ اور فرعون نے یہ بھی کہا دیکھو یہ لوگ اس ملک میں بہت ہو گئے ہیں اور تم ان کو ان کے کام سے بٹھاتے ہو اور اس دن فرعون نے بیگار لینے والوں اور سرداروں کو جو لوگوں پر تھے حکم کیا کہ اب آگے کو تم ان لوگوں کو اینٹیں بنانے کے لیے بھس نہ دینا جیسے اب تک دیتے رہے ہو۔ وہ خود ہی جاکر بھس بٹوریں اور ان سے اتنی ہی اینٹیں بنوانا جتنی وہ ابتک بناتے آئے ہیں۔ تم اس میں سے کچھ نہ گھٹانا کیونکہ وہ کاہل ہو گئے ہیں۔ اسی لیے چلا چلا کر کہتے ہیں ہم کو جانے دو کہ ہم اپنے خدا کے لیے قربانی کریں۔" (خروج باب ۵: ۱-۸)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس قربانی کے لیے جانا چاہتے تھے وہ اجتماعی قربانی تھی اور اس کی حیثیت عید کی تھی جس میں بنی اسرائیل کے ہر خرد و کلاں کی شرکت مطلوب تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فرعون کو جس سبب سے ان کو جانے دینے سے انکار تھا وہ یہ تھا کہ جو کار خدمت ان لوگوں کے سپرد تھا اس میں ہرج ہوگا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے وہ تنگ آگیا تب ایک حد تک راضی ہوا۔

"تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا تم جاؤ اور اپنے خدا کے لیے اسی ملک میں قربانی کرو۔ موسیٰ نے کہا ایسا کرنا مناسب نہیں کیونکہ ہم خداوند اپنے خدا کے لیے اس چیز کی قربانی کریں گے جس سے مصری نفرت رکھتے ہیں۔ سو اگر ہم مصریوں کی آنکھوں کے آگے اس چیز کی قربانی کریں گے جس سے مصری نفرت رکھتے ہیں تو کیا وہ ہم کو سنگسار نہ کر ڈالیں گے؟ فرعون نے کہا میں تم کو جانے دوں گا تاکہ خداوند اپنے خدا کے لیے بیابان میں قربانی کرو لیکن تم بہت دور مت جانا۔" (خروج ۸: ۲۵-۲۹)

اس سے معلوم ہوا کہ مصر سے باہر بیابان میں جاکر قربانی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ گائے کی قربانی کرنا چاہتے تھے اور مصری گائے کو ہمارے ملک کے ہندوؤں کی طرح، مقدس اور معبود خیال کرتے تھے اور چونکہ ان کے ہاتھ میں پورا اقتدار تھا اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اندیشہ تھا کہ اگر انھوں نے گائے کی قربانی مصر میں کی اور وہ بھی اجتماعی شکل میں تو مصری ان کو سنگسار کر دیں گے۔ یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ یہ اجتماعی قربانی موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں قدیم سے جاری رہی ہوگی لیکن مصریوں نے گائے کے تقدس کی وجہ سے اس کو بند کر دیا ہوگا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قربانی کی تجدید کرنا چاہتے ہوں گے۔ اس تجدید کی تو فرعون نے مجبور ہو کر اجازت دے دی لیکن چونکہ یہ اجتماعی قربانی تھی، جس طرح ہمارے یہاں عید اضحیٰ، اس وجہ سے آگے چلکر ایک اور جھگڑا پیدا ہو گیا۔

"تب موسیٰ اور ہارون پھر بلائے گئے، اور اس نے ان کو کہا جاؤ اور خداوند اپنے خدا کی عبادت کرو پر وہ کون کون ہیں جو

جائیں گے؟" موسیٰ نے کہا ہم اپنے جوانوں اور بڈھوں اور ہم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں اور اپنی بھیڑ بکریوں اور اپنے گائے بیلوں سمیت جائیں گے کیونکہ ہم کو اپنے خدا کی عید کرنی ہے۔ تب اس نے ان کو کہا کہ خداوند ہی تمہارے ساتھ رہے۔ میں تو ضرور ہی تم کو بچوں سمیت جانے دوں گا۔ خبردار ہو جاؤ، اس میں تمہاری خرابی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہونے پائے گا۔ تم مرد ہی مرد جا کر خداوند کی عبادت کرو کیونکہ تم یہی چاہتے تھے اور وہ فرعون کے پاس سے نکال دیے گئے۔" (خروج ۱۰: ۸ - ۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ یہ قربانی، ہماری عید اضحیٰ کی طرح، عام قربانی کے ایک تہوار کی تجدید تھی اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ کا مطالبہ یہ تھا کہ اس میں پوری قوم کو شرکت کی اجازت دی جائے اور قربانی کے لیے جانور بھی لے جانے کی اجازت دی جائے۔ فرعون نے بالآخر، خدا کے عذاب سے تنگ آ کر مطالبہ کا پہلا حصہ منظور کیا لیکن دوسرے حصہ کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

"تب فرعون نے موسیٰ کو بلا کر کہا تم جاؤ اور خداوند کی عبادت کرو فقط اپنی بھیڑ بکریوں اور گائے بیلوں کو یہیں چھوڑ جاؤ اور جو تمہارے بال بچے ہیں ان کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ موسیٰ نے کہا تجھے ہم کو قربانیوں اور سوختنی قربانیوں کے لیے جانور دینے پڑیں گے تاکہ ہم خداوند اپنے خدا کے آگے قربانی کریں سو ہمارے چوپائے بھی ہمارے ساتھ جائیں گے اور ان کا ایک کھر تک بھی پیچھے نہیں چھوڑا جائے گا کیونکہ ان ہی میں سے ہم کو خداوند اپنے خدا کی عبادت کا سامان لینا پڑے گا اور جب تک ہم وہاں نہ پہنچ جائیں ہم نہیں جانتے کہ کیا لے کر ہم کو خداوند کی عبادت کرنی ہوگی۔" (خروج ۱۰: ۲۴ - ۲۶)

بالآخر یہ قصہ یہاں تک بڑھا اور مصر اس اثنا میں خداوند تعالیٰ کی بھیجی ہوئی آفتوں سے اس قدر تباہ ہوا کہ مصریوں نے فرعون پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ ان لوگوں کو مصر سے یکقلم نکال دیا جائے۔ چنانچہ یہی مطالبہ مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت کا سبب بن گیا

"تب اس نے رات ہی رات موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا کہ تم بنی اسرائیل کو لے کر لوگوں میں سے نکل جاؤ اور جیسا کہتے ہو جا کر خداوند کی عبادت کرو۔ اور اپنے کہنے کے مطابق اپنے بھیڑ بکریاں اور گائے بیل بھی لیتے جاؤ اور میرے لیے بھی دعا کرنا اور مصری ان لوگوں سے بجد ہونے لگے تاکہ ان کو ملک مصر سے جلد باہر چلتا کریں کیونکہ وہ سمجھے کہ ہم سب مر جائیں گے۔ سو ان لوگوں نے اپنے گندھے گندھائے آٹے کو بغیر خمیر دیے لگنوں سمیت کپڑوں میں باندھ کر اپنے کندھوں پر دھر لیا۔" (خروج ۱۲: ۳۴ - ۳۵)

"اور انھوں نے اس گندھے ہوئے آٹے کی جسے وہ مصر سے لائے تھے بے خمیری روٹیاں پکائیں کیونکہ وہ اس میں خمیر دینے نہ پائے تھے اس لیے کہ وہ مصر سے ایسے جبراً نکال دیے گئے کہ وہاں ٹھہر نہ سکے اور نہ کچھ کھانا اپنے لیے تیار کرنے پائے۔" (خروج ۱۲: ۴۰)

بنی اسرائیل کو مصر سے جبراً نکالنے کے بعد ان کے تعاقب کی وجہ توریت میں یہ بیان ہوئی ہے:-

"جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اس کے خادموں کا دل ان لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ ہم نے یہ کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر ان کو جانے دیا۔ تب اس نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا۔" (خروج ۱۴: ۵ - ۶)

تورات کے ان بیانات سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے یہ جو مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔ یہ آزادی کا مطالبہ نہیں تھا بلکہ ان کے ہاں اجتماعی قربانی کی جو عبادت حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے وقت سے جاری تھی[۵] اور جو مصر میں، گائے کے تقدس کی وجہ سے، بند کر دی گئی تھی اس کی تجدید کا مطالبہ تھا۔ یہ معلوم ہے کہ بنی اسرائیل اپنے پاس ایک دین رکھتے تھے، جس میں ہر چند، مصر کی غلامی کی وجہ سے، بہت سی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، لیکن وہ انبیاء کا دین تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اس کی تجدید کی جدوجہد کریں۔ بنی اسرائیل کے یہاں عبادات میں قربانی کو جو اہمیت حاصل ہے وہ معلوم ہے۔ اور یہ اہمیت اس وقت ہزار گنا بڑھ جاتی ہے جب کہ حاکم قوم کی طرف سے وہ جبراً روک دی گئی ہو۔ اس وجہ سے اس کو زندہ کرنے کی کوشش ان کے مقدم ترین فرائض میں تھی۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے ایک طرف تو حاکم قوم کو دعوت ایمان و اسلام دی اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے دعوائے حاکمیت سے احکم الحاکمین کے حق میں دست بردار ہو جائیں اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو اللہ کی بندگی و اطاعت کی دعوت دی اور کوشش کی کہ ان کو اس بندگی و اطاعت کے لیے پوری آزادی حاصل ہو جائے۔ اگر حاکم قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت قبول کر لیتی تو سارا جھگڑا ختم تھا۔ لیکن جیسا کہ ہر نبی کے زمانہ کے مستکبرین نے اپنے نبیوں کا انکار کیا اور اتمام حجت کے بعد ان کو ہجرت کرنی پڑی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے مستکبرین نے بھی ان کا انکار کیا اور وہ ان لوگوں کے ساتھ ہجرت کر گئے جو ان پر ایمان لائے۔ ان ایمان لانے والوں میں مصری بھی تھے اور اسرائیلی بھی۔ اور جن لوگوں نے ان کی تکذیب کی وہ تباہ ہو گئے اور ان تباہ ہونے والوں میں بھی دونوں ہی شامل تھے۔ اسرائیلی بھی اور قبطی بھی۔ البتہ بنی اسرائیل من حیث القوم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ اس کی بڑی وجہ تو وہی تھی جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ یہ لوگ ارباب اقتدار میں نہیں تھے کہ مفاد پرستی اور غرور ان کے ایمان کی راہ میں حائل ہوتا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے اندر دین حق کے اجزا موجود تھے جو مصر کی زندگی میں دب تو ضرور گئے تھے، لیکن فنا نہیں ہوئے تھے اس وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت ان کے لیے بیگانہ چیز نہیں تھی۔ اس کے بالکل برعکس قبطی ملأ مستکبرین کی حیثیت رکھتے تھے اس وجہ سے وہ حق کو حق جانتے ہوئے بھی، جیسا کہ قرآن اور تورات دونوں سے واضح ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب پر اڑے رہے۔ صرف تھوڑے سے لوگ، جو بیدار ضمیر رکھتے تھے، ایمان لائے[۶]۔

اس پوری بحث کو ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرنے کے بعد، غور فرمائیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کی پیروی وہ لوگ

---

[۵] ہماری تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کی اجتماعی قربانی بنی اسرائیل میں قدیم زمانہ سے جاری تھی لیکن یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش میں اس کے دلائل موجود ہیں۔

[۶] یہاں کسی کو یہ شبہہ نہیں ہونا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام غیر قبطی ہونے کی وجہ سے قبطیوں پر حجت تمام نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بلاشبہہ اسرائیلی تھے لیکن ان کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی تھی اس وجہ سے وہ ان کی زبان اور روایات ہر چیز سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ قبطیوں کے لیے اسی طرح رسول تھے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام۔ (امین احسن)

کر رہے ہیں جو وطنی یا تہذیبی اشتراک کی بنا پر ہندی نیشنلزم یا مسلمان نیشنلزم کا فتنہ اٹھا رہے ہیں اور انگریزوں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ جو فساد دنیا میں تم کر رہے ہو وہ فساد کرنا ہمارا بھی "پیدائشی حق" ہے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کی پیروی جماعت اسلامی کر رہی جو حاکم و محکوم دونوں کو صرف احکم الحاکمین کی بندگی کی دعوت دے رہی ہے اور تمام بنی آدم کو یکساں پکار رہی ہے کہ احد واحد کے سوا نہ کسی کی بندگی جائز ہے نہ اطاعت؟ اور پھر اس بات پر غور فرمائیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسوہ کی پیروی وہ لوگ کر رہے ہیں جو مسلمانوں کو مسلمان قوم کے نعرہ پر جمع کر رہے ہیں، قطع نظر اس سے کہ ان میں کون اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتا ہے اور کون نہیں یا جماعت اسلامی کر رہی ہے جو مسلمانوں کے اندر ایمان و اسلام اور توحید و آخرت کے مقتضیات کا شعور پیدا کر کے اسلامی اصولوں کے مطابق ان کی تربیت کرنا چاہتی ہے؟

آخر میں محترم مستفسر نے مسلم شریف کی جو روایت نقل کی ہے اس کے متعلق گذارش ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر کوئی تربیت یافتہ جماعت جہاد کے لیے اٹھ رہی ہو تو وہ اپنے ساتھ بعض ایسے افراد بھی [illegible] ہرج نہیں جن کی پوری تربیت نہ ہوئی ہو لیکن اس بات کا ثبوت ہرگز نہیں ملتا کہ ناتربیت یافتوں کی ایک فوج مرتب کر کے جہاد کیا جا سکتا ہے۔ بدر کی لڑائی جن لوگوں کے ذریعہ سے لڑی گئی وہ پوری تاریخ انسانی میں نوع انسانی کے گل سر سبد تھے۔ اگر ان کے ساتھ کوئی ناتربیت یافتہ نو مسلم بھی شامل ہو گیا تو اس سے کیا بن بگڑ سکتا تھا!

تبلیغی پمفلٹ

سلامتی کا راستہ	۶ر	ایک نہایت ہی اہم استفتار	۶ر
اسلام کا نظریہ سیاسی	۶ر	اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۶ر
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۶ر	دین حق	۶ر
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۶ر	نشان راہ	۶ر
اسلام اور جاہلیت	۶ر	جہاد فی سبیل اللہ	۶ر
نیا نظام تعلیم	۶ر	دستور جماعت اسلامی	۲ر

انگریزی مطبوعات

(1) Towards Understanding Islam. Rs3/-

(2) What is Islam? Rs1/8/-

مکتبہ جماعت اسلامی، دار الاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب)

فریضۂ اقامت دین

از

جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

گرفتاران یاس دائمی (۳)

تیسرا گروہ جو کچھ کہتا ہے اور اس کے نظریات اور دلائل کی جو فہرست ہے، اس کا بڑا حصہ تو وہی ہے جو دوسرے گروہ کی زبانی گزشتہ بحث میں آپ سن چکے ہیں۔ اس لیے ان کو دوبارہ نقل کرنے اور ان کی غلطی واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن بعض حیثیتوں سے یہ لوگ ان کی بہ نسبت ایک قدم آگے ہیں اور ترک فرض اور فراموشیٔ عہد کی جو بیماری وہاں سیاسی تدبر اور زمان و مکان کی مصلحتوں کے پردوں میں چھپا دی گئی تھی، یہاں صاف گوئی اور "جرأت" کے ساتھ علانیہ ظاہر کر دی گئی ہے اس لیے ان لوگوں کے ظاہر و باطن کی یکرنگی کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ گو اس قلت حیائے ایمانی کا احساس دل پر چوٹ لگاتا ہے جو اس "اظہار جرأت" کے نیچے کام کر رہی ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان لوگوں نے اپنے جسم سے کپڑے اتار کر پھینک دیے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کتنوں نے یہ حیا کشی ہوش و بیداری کے عالم میں کی ہے، اور کتنوں نے غفلت و بے ہوشی کی حالت میں ؛ ایک طرف اقامت دین کی اس اہمیت کو سامنے رکھیے کہ اسلام اور قیام دین کی سعی و جہد میں باہم وہی تعلق ہے جو ایک زندہ انسان کی زندگی اور اس کی حرکت قلب میں ہے جیسا کہ ہم اوپر دلائل کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں، پھر اس کے بعد ان لوگوں کی ان ـــــ بظاہر عاجزانہ مگر فی الواقع باغیانہ ـــــ باتوں کا گہری نظر سے تجزیہ کیجیے کہ "یہ نصب العین ہے تو بالکل برحق، مگر ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبر کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے۔ اب وہ زمانہ واپس نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا۔" توقع ہے کہ اس تجزیے سے آپ پر بھی وہی حقیقت منکشف ہوگی جو ہم کہنی چاہتے ہیں۔ جب اقامت دین کی جدوجہد سے برضا و رغبت کنارہ کش ہو کر، اور باطل کے مقابلہ اور منکرات کے احول میں عدم مداخلت اور صلح کل کی پالیسی اختیار کر کے انسان پیروان اسلام کی صف پائیں میں بھی جگہ نہیں پا سکتا اور اللہ کے رسول نے ایسے انسان کو ایمان کے آخری ذرے سے بھی محروم قرار دیا ہے تو بڑی سے بڑی کمزوری اور مایوسی بھی اس فرض کی انجام دہی سے ایک لمحہ کے لیے بے تعلق نہیں کر سکتی اور اگر کہیں یہ بے تعلقی ہے تو وہاں کسی کمزور سے کمزور ایمان کی تلاش بھی بے سود ہے۔ اسلام نے اپنا کوئی ایسا "سستا ایڈیشن" شائع نہیں کیا ہے جس کے تحت اس "دم خم دکھانے" اور "تقدیر سے لڑنے" سے نجات ممکن ہو۔ وہ شخص دھوکے میں ہے جو یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اس لازمۂ ایمانی سے بے بہرہ رہ کر بھی ایمان و رضائے الٰہی کی کوئی مقدار حاصل کی جا سکتی ہے۔[۵۱]

تاریخ خلافت کی غیر متعلق بحث ان لوگوں کے فکر و عمل کی بنیادوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت جس چیز کو حاصل ہے اور جس کا گذشتہ مباحث میں ابھی تک تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "جو چیز صحابہ کے ہاتھوں بھی تیس برس سے زیادہ قائم رہ سکی اس کے لیے کوئی سعی بالکل لاحاصل ہے۔" یہ ایک الم ناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں مایوسی اور دل شکستگی کا زہر پیدا کرنے میں اس فقرہ نے جتنا موثر پارٹ ادا کیا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کی المناکی کا صحیح ادراک اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز کو بنیاد قرار دے کر اقامت دین کے فرض کو ساقط سمجھ لیا گیا ہے، اس کا اس فرض کی ادائگی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ کسی نظریہ، کسی اصول اور کسی نصب العین پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنا اور ساتھ ہی اس کے اتباع سے اور اس کے مقتضیات ادا کرنے سے اس بنا پر انکار کر دینا کہ اس نصب العین کو کبھی زمانہ دراز تک برقرار نہیں رکھا جا سکا، اپنے اندر معقولیت کا کوئی شمہ رکھتا ہے؟ اس سے بڑھ کر قول و عمل کے تضاد کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ سوال یہ ہے کہ آپ نے اس شے کو اس لیے اپنا مقصد زندگی ٹھیرایا ہے کہ وہ فی نفسہٖ حق ہے اور اس کی حقانیت کا علم و یقین اس کو اپنانے پر مجبور کر رہا ہے یا اس کا کوئی دوسرا سبب ہے؟ اگر کوئی دوسرا سبب ہے تو پھر آپ سے کوئی مطالبہ نہ آپ پر کسی جد وجہد کے ترک کرنے کا الزام، لیکن اگر پہلی بات ہے، جیسا کہ توقع کی جانی چاہیے، تو ایک کافر بھی آپ کو یہ طرز استدلال اختیار کرنے میں حق بجانب نہیں قرار دے سکتا۔ تیس اور چالیس برس تو نہیں اگر ایک دن بھی یہ مشن کامیابی کے ساتھ نہ چل سکا تو اس سے آپ کی ذمہ داریوں میں ذرہ بھر بھی تخفیف نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیے۔ اس لیے کہ آپ نے اس کو حق کہا ہے اور اس کی علمبرداری کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ دیکھنے کی گنجائش کہاں ہے کہ اس راہ میں کس نے کیا کیا اور کب کیا کیا گیا؟ آپ کے فرائض کی تعیین وہ نصب العین کرے گا جس کو حق سمجھ کر آپ نے قبول کیا ہے، تاریخ نہیں کرے گی۔

لیکن اگر آپ کو اپنی "اس" دلیل" پر گہرا اعتماد اور اصرار ہے اور اس میں اتنا وزن محسوس کرتے ہیں کہ وہ اقامت دین کی جدوجہد سے سبکدوش کر دینے کے لیے کافی ہے تو ہم گزارش کریں گے کہ ذرا اس کو اور وسعت دیجیے اور اسی اصول پر یوں سوچنا شروع کیجیے کہ مسلمان کی جو صفات و خصوصیات کتاب و سنت میں بیان کی گئی ہیں اور ایمان و اسلام کا جو معیار اللہ اور اس کے رسول نے پیش کیا ہے اس معیار پر پورے اترنے والے اور ان صفات و خصوصیات کے حامل انسان ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، ابوذر غفاری، سلمان فارسی، صہیب رومی، بلال حبشی رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان ہی کی طرح کے چند سو یا چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں پیدا ہو سکے، اور اس وقت تو اس معیار کے مسلمانوں کا عالم تصور میں بھی وجود ممکن نہیں، اس لیے اب ایسے معیار دینی کا ذکر اور خیال ہی چھوڑ دینا چاہیے اور اسلام کی ان مطلوبہ صفات و خصوصیات کے لیے سعی و جہد کرنا بالکل لاحاصل ہے، یہ ہم جیسے کمزور انسانوں کے بس کا کام نہیں ہے۔" اگر اجتماعی میدان میں خلافت راشدہ کی قلتِ عمر اس امر کا حق دے سکتی ہے کہ اب قیامت تک کے لیے قیام دین کے تصور سے ذہنوں کو خالی کر لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ انفرادی

(حاشیہ صفحہ ۶۰) [1] اس موقع پر "امکان و عدم امکان" "کامیابی کا اسلامی تصور" اور "اقامت دین کے سلسلہ میں بندوں کی ذمہ داری" وغیرہ بحثوں کو جو گذشتہ نمبر میں گذر چکی ہیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ورنہ یہاں اس اجمالی بیان سے غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ (ص)

زندگی میں بھی اس استحقاق معذرت کو قبول نہ کیا جائے۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ باوجود اس کے کہ اب ایک ابوبکر بھی پیدا نہیں ہو رہا ہے آپ نہ صرف خود کمال ایمانی کے حصول سے مایوس ہو کر اسلام سے علٰحدگی پر تیار نہیں بلکہ گمراہوں کو راہ یاب، جاہلوں کو دین آگاہ اور غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کے لیے زندگیاں وقف کیے ہوئے ہیں، تبلیغی انجمنیں قائم کرتے ہیں، اشاعت دین کے ادارے کھولتے ہیں، تعلیم کتاب و سنت کے لیے درسگاہیں جاری کرتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ صدیقؓ و فاروقؓ کی سی اسلامیت کے حصول سے، کہ قرآن کا معیار مطلوب یہی ہے، مایوس ہونے کے باعث اسلام کا نام لینا چھوڑ دیا جاتا؟ آپ کہیں گے کہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق اسلام کے کامل العیار اور اعلیٰ نمونے تھے، ان کے مقابل کا ایمان و تقویٰ اگر ہم نہیں پیدا کر سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو چھوڑ دیں، بلکہ ان نمونوں کو سامنے رکھ کر ہم اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کریں گے کہ جہاں تک ہو سکے انہی کی طرح کا تدین اپنے اندر پیدا کریں، تاریخ نے ہمارے سامنے اسلام کے یہ اعلیٰ ترین نمونے رکھ دیے ہیں تاکہ اپنے امکان بھر ہم اپنے کو ان پر ڈھالنے کی سعی کریں۔ اب جس کو اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے اس حد تک اس رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش کرے اور ان کے مقام ایمانی کی طرف جتنے قدم بڑھا سکتا ہے بڑھاتا رہے۔ ہم اس طرز فکر سے سو فیصدی اتفاق کرتے ہیں۔ ہماری گذارش بالکل اسی مرکز فکر پر مبنی ہے فرق صرف یہ ہے کہ آپ اس کو انفرادیت کے ایک محدود دائرہ میں رکھنا چاہتے ہیں اور ہم اسی کو اجتماعیت تک پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا مدعا یہ ہے کہ اسی نقطۂ نگاہ سے آپ کو خلافت راشدہ کے اوراق تاریخ کو بھی دیکھنا چاہیے۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ رضوان اللہ علیہم کی انفرادی زندگیوں کی طرح ان کا طرز خلافت اور ان کی نیابت رسول بھی ایک اعلیٰ معیار تھی جسے اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت نے تاریخ کے سینہ میں محفوظ کر دیا ہے تاکہ دعوت قرآنی کے علم بردار اپنی جدوجہد کے سلسلہ میں اپنے سامنے ایک عملی اور معیاری نمونہ رکھ سکیں اور جس حد تک ان کے دست و بازو میں خدا نے توانائی بخشی ہو اس نمونہ کے اتباع میں صرف کریں اور اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیں جب تک کہ اللہ کا دین اپنی رحمتوں کے ساتھ اس زمین پر اسی طرح نہ چھا جائے جس طرح خیر القرون میں چھا گیا تھا حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ۔ پس اس تیس سالہ دور خلافت کو اپنے لیے مثال اور ایک اسوہ بنائیے اور اس کے جمال جہاں آرا کے عشق سے ہمہ دم اپنے سینوں کو گرم رکھیے۔ حیف ہے اگر اسی نام سے دلوں میں مایوسی اور افسردگی کی لہریں اٹھیں۔ اس نام میں تو بلا کی کشش اور اس کشش میں طوفان کا سا جوش بھرا ہوا ہے۔ اگر ہمارا یقین ہے کہ دنیا کو فلاح و سعادت صرف دین حق کے قائم ہونے ہی پر مل سکتی ہے، اور اگر ہمارے قلوب اس مبارک زمانہ کی سچی قدر اور محبت رکھتے ہیں جبکہ دنیا میں خلافت راشدہ قائم تھی تو اس یقین اور اس محبت کا فطری تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ دل اس افسانۂ کہن کو از سر نو عالم واقعات میں دیکھنے کے لیے ٹھیک اسی طرح بے قرار رہے جیسے کہ کسی کی کوئی عزیز ترین شے کھو گئی ہو اور وہ اس کی جستجو میں دیوانہ وار سرگرداں پھر رہا ہو۔ جس شخص کے ایمان میں یہ شورش نہ ہو وہ دراصل ایمان ہی نہیں، بلکہ تصورات کا ایک تبکدہ ہے۔

نظام اسلامی پر ایک شدید بہتان

سطور بالا میں ہم نے اسلام کے انفرادی اور اجتماعی معیاروں پر جو اشارات کیے ہیں ان سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے کہ روئے زمین پر صرف تیس سال نظام اسلامی کو برقرار سمجھنا تاریخ اسلامی کے

غلط مطالعہ کا نتیجہ ہے اور اس خیال کے پیدا کرنے میں چالاک دشمنوں کی عیاری اور نادان دوستوں کی سادہ لوحی دونوں ہی شامل ہیں۔ اگر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے بعد بھی مسلمان پیدا ہوئے اور برابر پیدا ہوتے رہے تو ان کی خلافتوں کے بعد بھی نظام اسلامی قائم رہا فرق صرف یہ تھا کہ جس طرح ان کی شخصیتیں بے داغ تھیں اسی طرح ان کی خلافتیں بھی خیر کامل کا نمونہ تھیں۔ اور اس دور سعید کے ختم ہونے کے بعد جس طرح شخصیتیں ناقص تھیں، مگر پھر بھی مسلمان تھیں، اسی طرح اس وقت کے نظامہائے اجتماعی بھی ناقص تھے مگر پھر بھی بالکل غیر اسلامی نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ جس طرح افراد میں اسلامیت کے مدارج مختلف ہوتے ہیں اسی طرح نظامہائے سیاست کے بھی دینی نقطۂ نظر سے مختلف مدارج ہوتے ہیں جس طرح اشخاص میں کمزوریاں ہوتی ہیں اسی طرح اسٹیٹ میں بھی ہوتی ہیں۔ خود اسی زمانۂ خلافت راشدہ کے تمام ادوار اپنی روح میں یکساں نہ تھے بلکہ عثمانی اور علوی دور خلافت، صدیقی اور فاروقی ادوار سے فروتر تھے جس پر احادیث اور تاریخ دونوں شاہد ہیں۔ اس لیے جب ہم افراد کی کمزوریوں پر تنقید تو کرتے ہیں مگر ان کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے اسی طرح دور خلافت کے بعد قائم رہنے والے سیاسی ڈھانچہ پر سخت سے سخت تنقید تو کر سکتے ہیں اور اس کو جاہلیت کے عناصر سے مخلوط بھی کہہ سکتے ہیں مگر انتہائی زیادتی ہوگی اگر اس کو بالکل غیر اسلامی قرار دیدیا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس طرح علمائے حق ضعیف الایمان اور گنہ گار انسانوں کی ہدایت وارشاد کا فرض ادا کرتے تھے اسی طرح حکمران وقت اور اس کے سیاسی نظم ونسق پر بھی اظہار نکیر کرتے رہے اور افراد کی طرح حکومتوں کی اصلاح احوال کی کوشش بھی ان کی زندگی کا مستقل مشن تھا۔ لیکن انھوں نے کسی زمانہ میں کسی حکمران کے خلاف یہ فتویٰ صادر نہیں کیا کہ اس کی حکومت سراسر غیر اسلامی اور کافرانہ ہے۔ ہاں اس کے اندر جو بگاڑ تھا اپنی مقدرت کے مطابق اس کے سدباب کی سعی کرتے رہے، جس کی وجہ یہی ہے کہ خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد بھی مدتوں جو نظام سیاست ممالک اسلامی میں جاری رہا وہ کسی نہ کسی حد تک اسلامی تھا۔ عدالتیں اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے کرتی تھیں، سزائیں آئین شرع کے ماتحت دی جاتی تھیں، جائدادیں احکام دین کی رو سے تقسیم کی جاتی تھیں، غرض زندگی کے عام معاملات میں اقتدار علماً کتاب وسنت ہی کو حاصل تھا، جو کچھ خرابی تھی حکمرانوں کی ذات میں تھی مگر نظام دین کی بالادستی اس طرح گوشہ گوشہ پر چھائی ہوئی تھی اور اس کا پرجلال وقار، ذہن عام کو اس طرح اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا کہ ان حکمرانوں کو بھی اپنی کوئی غیر اسلامی کاروائی انجام دینے کے لیے چہرے پر شرع کی نقاب ڈالنی پڑتی تھی اور اس بات کا وہ تصور تک نہیں کر سکتے تھے کہ خدا کے دین اور قانون کی جگہ اپنا دین اور قانون چلا دیں۔

استدراک لیکن ہماری اس تقریر سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم ان تمام حکمرانوں کی حکومتوں کو خالص اسلامی نظام سمجھتے ہیں اور اقامت دین کا فرض یاد دلانے کا مقصد یہ ہے کہ معتصم باللہ یا ہارون الرشید کی طرح کی کوئی حکومت قائم کرنے کی دعوت دیتے اور اس پر مطمئن ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں، بلکہ دکھانا یہ مقصود ہے کہ خلافت راشدہ کے اختتام کے بعد بھی ایک مدت دراز تک اللہ کا دین دنیا میں قائم ونافذ رہا، اگرچہ اپنے مظاہر کے اعتبار سے بھی ناقص تھا اور اپنی روح کے اعتبار سے بھی۔ اسی لیے اس خیال کو اپنے ذہن میں جگہ دینا کہ یہ نظام صرف چند دنوں ہی قائم رہا، نہ صرف اسلام سے لوگوں کو دور کرنا ہے بلکہ تاریخی بددیانتی بھی ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے علمی، دماغی، مالی اور جسمانی ذرائع سے کام لیتے ہوئے اپنے اس

مقصدِ زندگی کی خاطر مسلسل جدوجہد کرتے رہیں۔ نمونۂ کمال کے طور پر سامنے خلافتِ راشدہ کی مثال ہو، پھر اس مثال کی بجا عملی پیروی ہماری حدِ استطاعت میں ہو اسے سرانجام دے دیں، بس اسی پر ہماری مسئولیت ختم ہو جاتی ہے۔ جس طرح صدیق و فاروق بن جانا ہم پر فرض نہیں بلکہ ان کے نمونوں کو سامنے رکھ کر حتی الامکان زیادہ سے زیادہ ان سے مماثلت پیدا کرنا ہمارا فرض ہے، اسی طرح، بہر حال، ان ہی کی طرح کی خلافت قائم کر دینا ہماری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ہم سے جہاں تک ہو سکے ان کی قائم کردہ خلافتوں سے بیش از بیش مشابہت رکھنے والا نظامِ اجتماعی قائم کرنے کی سعی کریں۔ بعد آگے آنے والی نسلیں یکے بعد دیگرے اس مشابہت کے رنگ کو نمایاں سے نمایاں تر کرتی رہیں۔

متربصین کا گروہ

اب ان حضرات کے افکار و اعمال کا جائزہ لیجیے جو انتظار اور تربص کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور خود سلامتی و بے فکری کے محفوظ گوشوں میں بیٹھے ہوئے دوسروں کی ثباتِ قدمی اور تیز گامی کا حساب لگا رہے ہیں اور اس نصب العین ہی کو اپنی زندگیوں کا تنہا مقصد سمجھنے کے باوجود میدانِ سعی و عمل میں اس لیے نہیں اترتے کہ پہلے سے اس میدان میں اترے ہوئے لوگوں کی عزیمت انھیں مشکوک نظر آتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امامِ صالح اور متقی اور مقبول الصلوٰۃ نہ ہو تو یہ حضرات نہ صرف یہ کہ اس کے پیچھے ہی نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے بلکہ سرے سے نماز ہی ترک کر دیں گے اور غالباً اس یقین کے ساتھ ترک کر دیں گے کہ کل داورِ محشر کے سامنے یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ خدایا! ہم تو نماز کو فرضِ عین ہی سمجھتے تھے اور چوبیس گھنٹہ اس کے لیے باوضو رہتے تھے مگر موذن کی صداؤں اور امامِ محلہ کی نمازوں میں ہم کو خلوص و للہیت کی روح نظر نہیں آتی تھی اس لیے ہم نے نماز نہیں پڑھی۔ ہم باوجود غور و فکر کے اس طرزِ فکر و استدلال کی کوئی شرعی یا عقلی بنیاد نہیں پا سکے۔ فرض کیجیے کہ زید اقامتِ دین کی دعوت دے رہا ہے اور ان لوگوں کو، جو اتباعِ قرآن اور علمبرداریِ اسلام کے مدعی ہیں، ان کی فرض ناشناسیوں پر جھنجھوڑ کر اور غفلت شعاریوں سے بیدار کر کے ان کا فرضِ زندگی یاد دلا رہا ہے اور اپنے طور پر اس راہ میں قدم بھی رکھ دیتا ہے لیکن جہاں تک اس کی عملی صلاحیت، خلوص اور عزیمت کا تعلق ہے آپ کے قلب کو پورا اطمینان نہیں ہوتا بلکہ وہ اور اس کے سارے ہم سفر نااہل، بے عمل، غیر مخلص اور غیر متقی دکھائی پڑتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ ان کی یہ ساری خامیاں آپ کے فرض کو ساقط اور آپ کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کس طرح کر دیں گی۔ کیا آپ نے اس امر کو اس لیے حق مانا ہے کہ زید اور اس کے ساتھیوں کی یہی رائے ہے؟ کیا آپ نے دینِ حق کی اقامت کا فریضہ اس شرط کے ساتھ اپنا مقصدِ زندگی تسلیم کیا ہے کہ پہلے زید اور اس کے ہمراہی ادائے فرض کا عملی ثبوت دے لیں تو ہم اپنے نرم گرم بستروں سے اٹھیں اور اپنی خوابگاہوں سے باہر قدم نکالیں گے؟ کیا قرآن کی مرکزی دعوت کے آپ اسی وقت مکلف ہیں جب دوسروں کو اس کی راہ میں قربانیاں کرتے دیکھ لیں؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور قرآن گواہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہر فرد اپنی استطاعت کے مطابق اس فریضہ کی بجا آوری کا بطورِ خود ہر حال میں ذمہ دار اور مسئول ہے تو اپنے نفس کی حیلہ سازیاں اور غفلتیں کیا کم ہیں کہ دوسروں کی کمزوریاں ٹٹولنے کی آپ کو فرصت مل جاتی ہے، دوسرے اگر فی الواقع ویسے ہی ہیں جیسا کہ آپ کا گمان ہے تو خدا کے روبرو اس کے جوابدہ وہ خود ہوں گے

آپ اس کھود کرید کی زحمت بلاوجہ کیوں اٹھاتے ہیں، آپ اپنے نامۂ اعمال کی فکر کیجیے۔ ہاں اگر ان کے حالات سے کچھ درس ملتا ہے تو اس کو لے لیجیے۔ لقمان حکیم سے پوچھا گیا "تم نے ادب کس سے سیکھا" جواب دیا "بے ادبوں سے" مومن کو بھی اللہ تعالیٰ نے حکیم پیدا کیا ہے اور ایسی ہی حق بیں، عبرت پذیر اور حکمت پسند نگاہوں سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ سارا قرآن اس نے مغضوب اور گمراہ قوموں کے تفصیلی تذکروں سے اسی لیے تو بھر دیا۔ یہ کہ مسلمان ان جیسی حرکتوں کے ارتکاب سے بچیں، اس لیے آپ کا اس صورت حال میں جو فرض ہونا چاہیے وہ صرف یہی ہے کہ ان کی خامیوں، ظاہر داریوں اور غلط کاریوں سے اپنے دامن بچا کر خالص للہیت اور عزیمت کے ساتھ اس جھنڈے کو لے کر آگے بڑھیں اور اگر ہو سکے تو ان کے لئے ہدایت، عزیمت، خلوص اور توفیق عمل کی دعا بھی کرتے جائیں کہ بہرحال ان کی چیخ پکار، اگرچہ ان کی اپنی حد تک محض "زبانی تعلی" تھی مگر آپ کے حق میں ہادی اور مذکر ثابت ہوئی، اس لیے وہ آپ کے شکریے کے مستحق ہیں نہ کہ مخالفت کے کہ ان کے انہی "زبانی تعلیوں" نے غفلت کے پردے چاک کر دیے اور آپ کو بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ اس نادان اور بدنصیب انسان پر، جو تاریکیوں کے ہجوم میں سرراہ چراغ لے کر کھڑا ہو اور دوسروں کو تو ان کی منزل مقصود دکھا رہا ہو مگر خود اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہو، آپ کو ترس تو ضرور آنا چاہیے مگر اس پر آوازے کسنے اور اعتراضات کرتے رہنا بے انصافی، اور اس کی پیروی میں چراغ کی روشنی سے فائدہ نہ اٹھانا اور پشت بمنزل ہو رہنا حماقت اور دیوانگی ہے۔ سعید وہ ہے جو دوسروں سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ قائل کی شخصیت کے بجائے اس کے قول کو دیکھا جائے۔ پس اقامت حق کی پکار سن کر ان بندگان خدا کا طرز عمل اختیار کیجیے جو سعید ہوں، جو دانا اور حقیقت جو ہوں اور جن کی تعریف قرآن کی زبان میں یہ ہے کہ:-

اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ ۔ جو باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں اور ان میں سے بہتر باتوں کو اپنے عمل و اتباع کے لیے منتخب کر لیتے ہیں۔

. . . .

اس لیے اس "قول" ـــ دعوت اقامت دین ـــ پر اس پہلو سے بحث تو کی جا سکتی ہے کہ آیا وہ "احسن القول" ہے یا نہیں؟ لیکن جب آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس قول کے احسن ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور اس کا ہر مسلمان کا تنہا فریضۂ زندگی ہونا شک و ریب سے بالاتر ہے تو پھر اس پر لبیک کہیے اور اگر ساری دنیا بھی اس کے اتباع سے جی چرا رہی ہو تو یقین کیجیے کہ اس سے آپ کی اپنی ذمہ داری میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے عمل اور عزم کا انتظار کرتے رہیں۔ یہ انتظار تو حق پرستی کی ضد ہے اور جو شخص حق کو مانتے ہوئے انتظار کی پالیسی اختیار کرتا ہے وہ در اصل حق کو بدنام کرتا اور اس کی بے حرمتی اور تضحیک کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اگر ہمیں صاف گوئی پر معاف کیا جائے تو ہم اس موقع پر اس رسوائے عالم گروہ کی عادات و خصوصیات کو یاد دلائیں جس نے رسولؐ اور اصحاب رسول کے مجاہدات اقامت دین کے سلسلہ میں یہی تربص کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی جس کے باعث مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لیے یہ احساس فرض کافی نہ تھا کہ یہ لوگ جس امر حق کے لیے جانفروشی کر رہے ہیں اسی کو ہم نے بھی اختیار کیا ہے اس لیے ان کے پہلو بہ پہلو چل کر اپنے فرض کو ادا کر لیں، اس کے برعکس ان لوگوں کا وطیرہ یہ تھا کہ اس کشمکش سے علیحدہ رہ کر اس کے نتائج کا اندازہ لگاتے رہتے اور اس وقت مسلمانوں کی جماعت میں

... ا‌ٹھتے جب ان کی فتح کے جھنڈے لہراتے دیکھ لیتے۔ (اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ) غور فرمائیے کہ ان لوگوں کی ذہنیت، جو اقامت دین کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے بھی اس کے لیے آمادہ عمل نہیں ہوتے، کتنی بنیادی مشابہت رکھتی ہے اُس ذہنیت کے ساتھ جس پر منافقوں کے طرز عمل کی اساس تھی؟ جس طرح وہ حق کی حمایت حق کی خاطر نہیں کرتے تھے اسی طرح ان لوگوں کے نزدیک بھی حق کا مجرد حق ہونا ہی آمادگی عمل کے لیے کافی نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ وہ لوگ مسلمانوں کی فتح کا انتظار کیا کرتے تھے اور یہ حضرات قیام دین کے داعیوں کے عزم و اخلاص کے بارے میں کسی "شرح صدر" کے منتظر ہیں۔ لیکن اتباعِ حق اور ادائے فرض سے بھاگنے میں دونوں مشترک ہیں۔

بدبختی کی انتہا کاش معاملہ یہیں ختم ہو جاتا اور ان سب لوگوں نے انتظار اور تربص کے صرف سلبی پہلو پر ہی اکتفا کر لیا ہوتا، مگر یہ دیکھ کر صبر اور ضبط کا دامن سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے کہ خدا پرستی، اتباعِ قرآنی اور عشق محمدی کی دعویدار امت میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اس ساعتِ ہمایوں کے انتظار میں شوق مجسم بنے بیٹھے ہیں جب طاغوتی اقتدار کی لال پیلی آنکھیں دیکھ کر اقامت دین کے "جھوٹے مدعی" میدان سے بھاگ کھڑے ہوں گے اور انھیں اپنے جذبات طعن و تشنیع کی تسکین دہی کا موقع نصیب ہوگا۔ یہ حضرات ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ یہ فرما کر گویا اپنی ذمہ داریوں کا حق ادا کر دیتے ہیں کہ ہوش سے عاری اور جوش کے اندھے لوگوں کا ایک گروہ ہے جو قیام دین قیام دین کا شور مچا رہا ہے، حوادث و مشکلات خود ہی ان کا فاتحہ پڑھ دیں گے۔ لیکن شاید انھیں خبر نہیں کہ ان کے اس نشتر طعن کی زد خود ان کی اپنی رگ گلو تک جا پہنچتی ہے۔ افسوس! مسلمان کا دل اب قیام دین کی حسرتوں سے بھی اس وجہ محروم ہو گیا ہے کہ اگر خود نہیں کچھ کر سکتا تو دوسروں کا کچھ کرنا بھی اس کو گوارا نہیں رہا اور نہ اس کی نیک خواہشات کا اس کے دل میں گذر باقی رہا۔ آخر یہ باور کرنے کے لیے کہاں سے دل و دماغ لائے جائیں کہ جو سینہ، دین حق کی محبت اور فدویت کا امین بنایا گیا تھا اب اس میں ان آرزوؤں کی پرورش کی جارہی ہے جو صرف مساعی کفر کے خلاف مخصوص ہونی چاہیے تھیں۔ حالانکہ اگر میرے اندر اتنی غیرت اور ہمت موجود نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو زندہ اور قائم کرنے کے لیے قدم بڑھا سکوں تو میرے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ اس کی تمنا سے اپنے قلب و دماغ کو ایک لمحہ کے لیے بھی خالی نہ ہونے دوں اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کے لیے قدم اٹھا رہے ہوں تو ان کے لیے اخلاص عمل، ثبات قدم، نصرت حق، حسن انجام اور فوز مرام کی دعائیں کروں۔ لیکن اگر اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیرت حق کی آخری چنگاری بھی میرے اندر بجھ رہی ہے، اور اگر اس سے آگے بڑھ کر میں اس دعوت حق کو فتنہ قرار دے دوں، لوگوں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے لگ جاؤں اور اس کے لیے حوادث روزگار کی تمنائیں کروں تو میری بدبختی کی یہ انتہا ہو گی اور ایسی صورت میں مجھ کو اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم معلوم ہونی چاہیے کیونکہ حالات اور مظاہر کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ میں بالکل اسی مقام پر ہوں گا جہاں سے کچھ کور باطن لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے فداکار ساتھیوں کو اس نگاہ سے دیکھ رہے تھے جس کا ذکر قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:۔

..... يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ (توبہ - ۹۸) یہ لوگ تمہارے نذر آفات ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

یا پھر وہاں، جہاں سے پیغمبر عالم کی دل نشیں اور مسحور کن صدائے حق کو یہ کہکر ٹالا گیا تھا کہ:۔

شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (طور - ۳) یہ ایک (سحر طراز) شاعر ہے، ہم اس کے لیے حوادث روزگار کی راہ دیکھ رہے ہیں

پس جنھیں اللہ نے عقل دی ہے انھیں پوری سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اس طرز عمل پر غور کرنا چاہیے جو نری جہالت کی پیداوار ہے اور جس کے ساتھ ایمان کی محبت کبھی جمع نہیں ہو سکتی۔

مہدی موعود کے منتظر

آخری گروہ ان لوگوں کا ہے جو مہدی موعود کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان کے فکر و استدلال کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے تیس سال کے بعد خلافتِ راشدہ کے ختم ہو جانے اور پھر قربِ قیامت میں امام مہدی کے ہاتھوں اس کے از سرِ نو قائم ہونے کی خبر دی ہے۔ اور نقطۂ انجام یہ ہے کہ "اس نصب العین کے برحق ہونے کے باوجود اب ہم اس کی اقامت کے مکلف نہیں"۔ دین اور اس کے اصول و مطالبات سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ اب اس قسم کی باتوں کو بھی دلیل سمجھا جاتا ہے اور اتنی زبردست دلیل جو مسلمان کی زندگی کا مطمح نظر ہی بدل دے سکتی ہے۔ ضرورت تو نہ تھی کہ اس قسم کی مہمل باتوں کی تردید میں وقت، کاغذ اور روشنائی کا ضیاع برداشت کیا جاتا مگر اس مصیبت کا کیا علاج کہ اس افیون کی گولی نے نہ صرف ہمارے عوام بلکہ کتنے ہی مدعیانِ علم اور اربابِ تقویٰ کو مدہوش اور بے حس بنا رکھا ہے اس لیے انھیں بتا دینے کی ضرورت ہے کہ جس دیوار کا تم نے سہارا لے رکھا ہے اس کی بنیاد ریت سے اٹھائی گئی ہے تاکہ جس کو ترکِ فرض کی ہلاکت خریدنی ہو پورے علم و شعور کے ساتھ خریدے۔

روایاتِ مہدی کی حیثیت سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ ظہورِ مہدی کی خبر ہمیں ملی کہاں سے ہے اور حقائقِ دینی کی فہرست میں اس کا مقام کیا ہے؟ سو ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ قرآن کے صفحات اس کے ذکر سے بالکل خالی ہیں۔ حالانکہ اگر تعلیماتِ دین میں اس امر کو کوئی ایسی اہمیت، جو ہماری زندگی کا مقصد ہی بدل دے سکتی ہو، حاصل ہوتی تو عقلِ عام چاہتی ہے کہ قرآن اس کے متعلق ہم کو واضح ہدایتیں دیتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لے دے کر اس کا ذکر روایتوں میں آتا ہے مگر یہ روایتیں بھی اس پایہ کی ہیں کہ طبقۂ اولیٰ کی کتبِ احادیث میں سے کسی ایک کے اندر بھی وہ بار نہ پا سکیں، نہ امام بخاری نے ان کو درخورِ اعتنا سمجھا، نہ امام مسلم نے، نہ امام مالک نے، صرف بعد کے طبقہ کی کتابوں میں یہ دکھائی پڑتی ہیں، لیکن جب ان کو محدثانہ معیارِ تحقیق پر رکھ کر پرکھا جاتا ہے تو ایک روایت بھی کھری ثابت نہیں ہوتی اور ان کے اکثر و بیشتر راوی شیعہ نکلتے ہیں۔ روایت کے الفاظ پر نگاہ ڈالیے تو ان میں صاف طور پر شیعوں کے مخصوص عقائد اور خیالات کی روح جھلکتی نظر آتی ہے۔ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر علمائے محققین کا ایک گروہ ان احادیث کو افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔

نرالی منطق لیکن اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ یہ احادیث موضوع نہیں ہیں اور فی الواقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہورِ مہدی کی پیشنگوئی کی ہے تو سوال یہ ہے کہ اس کو اقامتِ دین کے فریضہ سے کیا تعلق؟ اس سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ اتنی ہی تو ہے کہ اس دنیا کا نظام فنا ہونے سے پہلے ایک دورِ مبارک آئے گا جب سطحِ زمین کے ایک ایک گوشہ سے ظلم اور فساد مٹ جائے گا، دنیا عدل سے بھر جائے گی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کی طرح کی "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" ہفت اقلیم میں قائم ہو جائے گی۔ لیکن اس سے یہ کس طرح لازم آگیا کہ بیچ کے زمانوں کے لیے ساری دنیا پر کفر و طاغوت کی فرماں روائی مقدر ہو چکی ہے؟ اس بیچ کوئی دور کا بھی

اشارہ اس امر کا موجود نہیں ہے کہ خلافت راشدہ کے اختتام سے لے کر ظہور مہدی تک زمین کے کسی بھی خطہ پر اللہ کا دین قائم نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے تاریخ گواہ ہے کہ خلافت راشدہ کے ختم ہونے کے ستر برس بعد ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھوں مملکت اسلام میں قریب قریب وہی بہار سعادت پھر آگئی جو خیرالقرون میں تھی، اور اس دور کو بھی خلافت راشدہ کا دور تسلیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ جس پایہ کی ظہور مہدی والی روایات ہیں اسی پایہ کی دوسری روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ یہ پیشگوئیاں کی گئی ہیں کہ مہدی موعود کے علاوہ، اور ان سے پہلے، اور بھی علمبرداران قیام دین اٹھیں گے جن کی حمایت و نصرت مسلمانوں پر واجب ہے۔ مثال کے طور پر دو روایتیں ذکر کی جاتی ہیں:۔

(۱) اذا رأیتم الأیات السود قد جاءت من قبل خراسان فاتوها ولو حبوا علی الثلج فان فیها خلیفۃ اللہ المہدی	جب تم یہ دیکھنا کہ خراسان کی طرف سے سیاہ نشانات آرہے ہیں تو وہاں پہنچنا۔ اگرچہ تمھیں برف کے اوپر گھسٹ کر ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ اس لیے کہ ان نشانات کے اندر اللہ کا ہدایت یافتہ خلیفہ ہوگا۔
(۲) یخرج رجل من وراء النہر یقال لہ الحارث حراث علی مقدمتہ رجل یقال لہ منصور یمکن لآل محمد کما مکنت قریش لرسول اللہ وجب علی کل مسلم نصرہ (ابوداؤد)	ماوراءالنہر سے "حارث حراث" نامی ایک شخص نکلے گا جس کا پیش رو (سپاہی) منصور نامی ایک آدمی ہوگا۔ وہ آل محمد کے لیے قوت و اقتدار پیدا کرے گا جس طرح کہ قریش نے رسول اللہ کے لیے کیا، اس کی مدد کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ ان روایتوں میں جن اشخاص کے ظہور کی خبر دی گئی ہے ان سب سے مراد ایک ہی شخص یعنی وہی مہدی موعود ہیں کیونکہ مہدی موعود کا ظہور، حسب بیان روایات، مدینہ منورہ سے ہوگا نہ کہ ماوراءالنہر یا خراسان سے، اسی طرح ان کا نام آنحضرت صلعم کے نام پر ہوگا نہ کہ "حارث حراث" نیز یہ کہ وہ اہل عرب کے جلو میں نکلیں گے نہ کہ خراسانی یا تورانی افواج کو لے کر۔ پھر یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ ان روایات میں حصر ہو گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام داعیان حق کی فہرست گنا دی ہے جو قیامت تک اقامت دین کا علم لے کر اٹھنے والے ہیں، بلکہ ان روایتوں میں، بشرطیکہ وہ صحیح ہوں، صرف بعض افراد اور زمانوں کا ذکر آیا ہے اور مقصود اس امر کی تاکید ہے کہ جب کبھی بھی ایسے مواقع پیش آئیں تو ہر مسلمان کا فرض ہو جائے گا کہ خدا کی راہ میں اپنے کو پیش کر دے۔

پس ان روایات میں نہ صرف یہ کہ مہدی موعود کے ماسوا بھی حق کے مجاہدوں اور دین قیم کو زندہ و پائندہ کرنے والوں کی آمد کی بشارت سنائی گئی ہے بلکہ ہر مسلمان پر واجب گردانا گیا ہے کہ سر کے بل بھی چلنا پڑے تو چل کر ان دعاۃ حق کے پاس پہنچے اور ان کی اعانت و اطاعت میں جان کی بازی لگا دے۔ اس طرح ان اوہام کی جڑ کٹ جاتی ہے جو مہدی موعود کے نام سے پیدا کر لیے گئے ہیں۔

پھر قطع نظر ان روایات کے، اصل سوال تو فرض زندگی کا ہے۔ جب یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اقامت دین کا فریضہ ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد وحید اور اس کی خاطر جد و جہد کرنا اس کے ایمان کا معیار و مظہر ہے اور جب مومن کی عین فطرت ہی یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ باطل اور منکر کو جینے کا حق نہیں دینا چاہتی خواہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں موجود ہو اور جب اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اتباع قرآن کے عہد کا سب سے پہلا اور سب سے آخری مطالبہ ہی یہ ہے کہ انسان کا پائے سعی و جہد اس وقت تک نہ تھمے جب تک کہ دین الٰہی کی ایک

دفعہ بھی معطل ہے اور زمین کا ایک ذرہ بھی باطل کے پاؤں تلے دبا ہے تو ہر مومن کو یہ جدوجہد لازماً کرنی پڑے گی اور ہر حال، ہر دور، ہر ماحول، اور ہر جگہ کرنی پڑے گی۔ امام مہدی اگر آئیں گے تو وہ اپنا فرض ادا کریں گے نہ کہ میرا اور آپ کا۔ ان کی تمام دوڑ دھوپ اپنے اس بوجھ کو سر سے اتارنے کے لیے ہوگی جو اللہ رب العالمین کی طرف سے ان پر ڈالا گیا ہوگا، ان کا کوئی فعل کسی بھی مدعی اسلام کے ادائے فرض کا قائم مقام نہ ہوگا، نہ تو وہ کسی دوسرے کے لیے نماز پڑھیں گے، نہ روزے رکھیں گے اور نہ ہی جہاد و قتال کریں گے۔ آپ آج ہی ان کی مساعی پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں جبکہ ان کا وجود ابھی عالم تصور اور دنیائے آرزو سے باہر بھی نہیں آیا ہے۔ مگر یقین کیجیے کہ وہ اس وقت کے بھی کسی مسلمان کے عوض تلوار نہ چلائیں گے جو ان کے زمانہ میں موجود ہوگا۔ اس وقت بھی ہر مسلمان کو اپنا اپنا فرض ٹھیک اسی طرح ادا کرنا ہوگا جس طرح امام موصوف کو، یعنی حضرت مسیحؑ کے لفظوں میں "ہر شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانی ہوگی" اور جو ایسا نہ کرے گا "آسمانی بادشاہت" میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اس لیے ہر مسلمان کو یہ دعا اور یہ آرزو تو ضرور کرنی چاہیے کہ اس کو وہ دور سعادت دیکھنا نصیب ہو جب امام مہدی اپنی تمام تر برکتوں کے ساتھ ظہور فرما ہوں گے اور ظلم و فساد کے بوجھ سے کراہتی ہوئی دنیا عدل و قسط کی رحمتوں سے مالا مال ہو جائے گی مگر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو اس وہم میں نہ مبتلا ہونا چاہیے کہ حضرت موصوف کے صدقہ میں اب سارے مسلمان بندگی کی ذمہ داریوں یعنی اقامت دین کی جدوجہد سے سبکدوش کر دیے گئے ہیں، جس طرح عیسائی حضرات اس خوش گمانی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ مسیح علیہ السلام نے سولی پر چڑھ کر ہم کو حسن عمل سے بے نیاز کر دیا ہے۔

احتساب نفس کی ضرورت اقامت دین سے دامن بچانے والے مسلمانوں کے یہ پانچ مختلف گروہ ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان میں سے ہر گروہ کے خیالات اور دلائل کو بیان کرکے ان کی غلطی واضح کی جائے۔ توقع ہے کہ ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے اور حق طلبی کے جذبات کے ساتھ غور کیا جائے گا اور روایتی، گروہی، سیاسی اور تقلیدی تعصبات سے بالاتر ہو کر خالص خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے اپنے مشاغل زندگی کا جائزہ لیا جائے گا۔ یاد رہے کہ نفس اپنا احتساب کرنے میں سخت حیلہ گر اور فریب کار واقع ہوا ہے اس پر کسی غیر مانوس اور نامطلوب حقیقت کا سامنا کرنا بڑا ہی شاق ہوتا ہے، اور اس حقیقت کے خلاف تو وہ اپنے ترکش دجل کا آخری تیر تک استعمال کر ڈالتا ہے جو اس سے قربانیوں کی طلب گار ہو، صرف جان اور مال ہی کی قربانیاں نہیں بلکہ جذبات و حسیات کی بھی، پندار علم و فکر کی بھی، سابق طرز عمل کی محبت اور عصبیت کی بھی اکثر اوقات ان چیزوں کی قربانیاں جان و مال کی قربانیوں سے بھی زیادہ دشوار ہوتی ہیں۔ اِدھر سے نور حق کی تجلی چمکتی ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ سمت قبلہ یہی ہے، اُدھر نفس کے حیلے اور وسوسے اٹھتے ہیں اور انسان سے پوچھتے ہیں کہ کیا اب تک کی تیری ساری تگ و دو باطل کی راہ میں تھی؟ کیا زمانہ کے اقطاب و ابدال اور وقت کے مراکز علم و دانش جن سمتوں کی طرف جا رہے ہیں وہ سب کی سب غلط ہیں؟ یہ سوالات نفسیاتی حربوں سے اتنے مسلح اور اتنے جذبات انگیز ہوتے ہیں کہ انسان ان سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود اسے حق نہیں مانتا۔ یہ نفس انسانی کی وہی جبلی کمزوری ہے جو ہر دعوت حق کے قبول کرنے سے مانع ہوتی رہی ہے اور ہر نبی کی آواز کے جواب میں بدبخت انسانوں کی زبان سے یہ آواز بلند کراتی رہی ہے کہ:۔

بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا — ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

پس نفس کی اس مہلک کمزوری اور دسیسہ کاری سے پوری طرح چوکنے ہو کر اپنے فکر و عمل کا احتساب کرنا چاہیے اور اس

اصول کو کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ حق و باطل کا معیار نہ تو کوئی شخص ہے — بجز ایک شخص کے جس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور نہ ہی کوئی جماعت ہے — سوا ایک جماعت کے، جس کو دنیا اصحاب محمدؐ کے نام سے پکارتی ہے — اس لیے اس سلسلہ میں صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اور اصحاب رسول کا اسوہ ہی ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ اگر ان چیزوں میں زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا گیا ہو کہ اس کا ہر سانس اقامت دین کے ذکر و فکر اور سعی و جہد میں بسر ہونا چاہیے تو پھر اس کے بعد اس کے اعتراف اور امتثال میں نہ تو کسی پیر و مرشد کی ارادت مانع ہونی چاہیے، نہ کسی شیخ و امام کی عقیدت، نہ تو کسی استاذ کا تلمذ اس ادائے فرض سے باز رکھنے کا حق رکھتا ہے اور نہ کسی جماعت کا تعصب۔ نہ کسی دیرینہ روش کی حمیت کو اس راہ میں آڑے آنا چاہیے نہ کسی فکر سابق کی عصبیت کو، کہ یہ سب چیزیں نفس کے حجابات اور شیطان کے فتنے ہیں اور قدرت نے ان کو انسان کے گوش و چشم پر صرف اس لیے پھیلا دیا ہے تاکہ اس کی حق پرستی کی آزمائش ہو۔ مبارک ہے وہ بندہ جو ان حجابوں کو چاک کرکے اور ان فتنوں کو کچل کر اپنے فرض کی پکار پر حرکت میں آجائے، ورنہ یاد رہے کہ اپنے ذاتی رجحانات کی پچ میں یا اپنے جماعتی افکار و مشاغل کی حمایت و عصبیت میں یا بزرگوں کی تقلید میں اس سے گریز کرنا اپنے آپ کو دانستہ نذر ہلاکت کرنا ہے، کسی بزرگ کا طرز عمل ہم کو خدا کی گرفت سے بچا نہیں سکتا۔ جب تک یہ راز حق دل پر نہ کھلا ہو، انسان کسی حد تک تو معذور تصور کیا جا سکتا ہے مگر جب حقیقت بے حجاب نظر آگئی اور دل نے اس کی صداقت کا اعتراف کر لیا تو بس یوں سمجھیے کہ اللہ کی حجت تمام ہوگئی۔ اس وقت اعتذار کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں، اب آگے یا تو آمادگی عمل اور کامرانی حیات ہے یا پھر انکار فرض و حصول نامرادی۔ کیونکہ حق کو حق سمجھ لینے کے بعد اس سے انکار اور اعراض کرنا اس سنت فرعونی کی پیروی کرنا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ:-

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا

جب فرعون اور اس کے پیروؤں کے سامنے ہماری نشانیاں بالکل کھلے طور پر آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو نرا جادو ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کے دل ان نشانیوں کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے انھوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر ان کو ماننے سے انکار کر دیا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے ہی لوگ اس سنت کے پیرو ہیں اور — "ظلم و علو" نہ سہی — گروہ پرستی اور اکابر پرستی کے باعث جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ کے مرض میں مبتلا ہیں۔ کاش اس مرض کی خطرناکی کا احساس کیا جاتا اور جو راہ اللہ نے ان پر کھول دی ہے اس پر چلنے سے کوئی تعلق مانع نہ ہوتا، ورنہ ہمیں خطرہ ہے کہ یہ اعتراف حق ان کے جرم کو کچھ ہلکا کرنے کے بجائے الٹا سخت کر دیگا۔

آخری گذارش ابتدائے بحث سے لے کر یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ امت مسلمہ نے جس نصب العین کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی ہے اس کا حق ادا کرے، جن اصولوں پر اس کے وجود کی بنا رکھی گئی ہے، ان کو از سر نو اپنا مرکز عمل بنائے اور حالات زمانہ، مشکلات ماحول اور مصالح وقت سے صرف نظر کرکے، نیز نفس و شیطان کے اختراع کیے ہوئے حیلوں اور وسوسوں سے دل و دماغ پاک کرکے، اپنے چھوڑے ہوئے فرض زندگی کو سرانجام دینے میں لگ جائے۔ بلاشبہ یہ بڑی کٹھن راہ ہے اور اس کا ہر قدم کانٹوں سے بھرا ہوا ہے مگر رضائے حق کی بارگاہ تک جانے والی اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں۔ مقصد حیات کی اس توضیح اور تبلیغ کے بعد آخری گذارش یہ ہے کہ جن لوگوں کے تلوے ان کانٹوں کا خیر مقدم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے ان کے لیے آخری چارۂ کار، جس کو برداشت کیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ وہ جہاں ہیں وہیں قدم روکے کھڑے رہیں اور کم از کم

دوسرے پوچھنے والوں کو تو یہ ضرور بتا دیں کہ گو ہم میں اس راہ دشوار گذار کو طے کرنے کی ہمت نہیں مگر حق اور نجات کی شاہراہ یہی ہے۔ یہ اس لیے تاکہ کل اللہ تعالیٰ کے روبرو ترک فرض کے ساتھ ساتھ کتمان حق کے جرم میں بھی نہ ماخوذ ہوں۔ اور اگر بدقسمتی سے یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے قدموں کی طرح اپنی زبانوں کو بھی روکے رہیں مگر خدارا دوسروں کو اس راہ سے روکنے کا بوجھ اپنی گردن پر نہ لیں۔ "صد عن السبیل" کی وہ لعنت ہے جس کے تصور ہی سے ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جانے چاہئیں۔ یہ بعینہٖ وہی روش ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں اشقیائے یہود نے اختیار کی تھی اور جس کے جواب میں حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا:-

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"

خدا نہ کرے کہ کوئی مسلمان اس حد تک آپ اپنی دشمنی پر کمربستہ ہو جائے اور خود تو اقامت دین کی جدوجہد سے جی چراتا ہی ہو، اوروں کو بھی اس سے باز رکھنے کا موجب بنے۔

اقامت دین کے اصول و مناہج

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ ہماری زندگی کا نصب العین بہرحال اللہ کے دین کو قائم کرنا ہے تو اب ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس نصب العین کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ آیا اس کا کوئی مخصوص طریق کار ہے یا جس سمت سے چاہیں اس گول کی طرف بڑھ سکتے ہیں؟ سو جن لوگوں نے اجتماعیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہوگا، ان کے لیے یہ معلوم کر لینا چنداں دشوار نہیں کہ ہر جماعت کا جو کسی خاص مقصد کو لے کر اٹھی ہو، جس طرح ایک مخصوص طریق فکر اور زاویۂ نگاہ ہوتا ہے اسی طرح اس کی تاسیس، تعمیر اور تنظیم کا انداز بھی مخصوص ہوتا ہے۔ اس طریق فکر، اس زاویۂ نگاہ اور اس انداز تعمیر کی تعیین وہی مقصد کرتا ہے جس کو لے کر یہ جماعت اٹھی ہے۔ مثلاً اگر آپ کو ایک نیشنل اسٹیٹ قائم کرنا ہو تو اس کے لیے ضرورت ہے کہ آپ اپنے مخاطبین کے دلوں کو وطن اور قوم کے عشق اور احترام سے معمور کریں، اپنے اوپر آپ حکمراں ہونے کا عقیدہ اور عزم پیدا کریں، پھر قومی ناموس کی قربان گاہ پر نثار ہو جانے کے لیے ان کے اندر سرفروشی کے جذبات بیدار کریں۔ جب یہ سب آپ کر لیں گے اور اس طرح کے آدمی آپ کے ارد گرد جمع ہو جائیں گے تو سمجھیے کامیابی کی تمام شرطیں آپ نے پوری کر لیں۔ آپ کو یہ دیکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ میرے جھنڈے کے نیچے جو لوگ جمع ہیں وہ توحید کے متعلق، رسالت کے متعلق اور قیامت و جزائے عمل کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ ان کے اندر مذہب کی پابندی کتنی ہے؟ انھوں نے احسان و تقویٰ، عدل و انصاف، رحم و مروت، عفت و پاکدامنی، جود و سخاوت وغیرہ اوصاف سے اپنے کو کہاں تک آراستہ کر لیا ہے؟ ان میں سے کسی چیز کو دیکھنے کی حاجت نہیں، کیونکہ جو مقصد اور نصب العین آپ کے سامنے ہے، اس کے لیے یہ چیزیں سرے سے مطلوب ہی نہیں، بلکہ شاید کچھ مضر ہی ہوں، یہاں تو جو شے مطلوب ہے وہ صرف حریف کی غیر مشروط عداوت و مخالفت اور قوم، قومی اقتدار، قومی وقار اور قومی عروج کی انتہائی شیفتگی اور فداکاری ہے۔

اسی طرح اگر آپ ایک ملک میں کمیونزم کا اقتدار اور کمیونسٹ نظام قائم کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو پہلے وہاں کے باشندوں کے ذہنوں میں کمیونسٹ فلسفۂ زندگی، کمیونسٹ نظام معیشت و حکومت اور کمیونسٹ نظریۂ اخلاق کی خوبیاں اتارنی ہوں گی، سرمایہ دار

خلاف دلوں میں شدید نفرت پیدا کرنی ہوگی۔ مارکس اور لینن کے ساتھ وہ عقیدت پیدا کرنی ہوگی جو خدا اور پیغمبر کے لیے اہل مذہب کے دلوں میں ہوا کرتی ہے، اور خدا، رسول، مذہب، آخرت، اخلاق اور اعمال صالحہ کے الفاظ کو خود غرض سرمایہ پرستوں کے ہتھکنڈے قرار دے کر ان کے نقوش ارادت کو ذہنوں سے مٹا کر، خالص مادی تصور حیات اور حیوانی تصور کائنات ان پر ثبت کرنا ہوگا۔ پھر جب آپ یہ بنیاد جما لیں گے اور یہ خیالات اور نظریات ایک معقول تعداد میں لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیں گے تو ان سب کو ایک جتھے میں منسلک کر کے ایک طرف باقی عوام کو اپنے پروپگنڈے کے زور سے مسحور کرنے کی جد و جہد جاری رکھیں گے اور دوسری طرف خفیہ اور علانیہ، تمام ممکن ذرائع سے موجودہ نظام حکومت کے تخت کو الٹنے کی مہم شروع کر دیں گے تا آنکہ عوام کے ہاتھوں یہ تخت الٹ کر اشتراکی حکومت قائم ہو جائے۔

علیٰ ہذا القیاس اگر ایک شخص منظم طریقہ پر رہزنی کرنا چاہتا ہو تو وہ ایسے لوگوں کو تلاش کرے گا جو مضبوط جسم، بے خوف دل اور سفاک فطرت رکھتے ہوں۔ ایسے آدمی اس کے کسی کام کے نہ ہوں گے جو نرم دل اور غارت گری و خونریزی سے متنفر ہوں۔ پھر اپنے مقصد کے مطابق لوگوں کو جب وہ حاصل کر لے گا تو ان صفات مطلوبہ کا ان میں مزید استحکام پیدا کرنے کی تدبیریں کرے گا، لوٹ مار کے اُنھیں گُر سکھائے گا، اسلحے مہیا کرے گا تب کہیں جا کر اپنی مہم کا آغاز کر سکے گا۔

غرض دنیا کی ہر با مقصد جماعت کا یہی حال ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے جو اس کے پیش نظر مقصد سے قلبی لگاؤ رکھتے ہوں اور لازماً ایسے ہی طریق کار اور ایسی ہی پالیسیاں اختیار کرتی ہے جو اس مقصد کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ "امت مسلمہ" کہلانے والی جماعت اور قیام دین کا مقصد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بھی ایک خاص طریق کار ہونا چاہیے۔ آیئے دیکھیں وہ طریق کار کیا ہے؟

اس غرض سے جب ہماری نگاہ اٹھتی ہے تو فطرۃً وہ قرآن اور سنت ہی پر جا کر ٹھیرتی ہے، اور جب واپس لوٹتی ہے تو طمانیت کی ٹھنڈک لے کر لوٹتی ہے۔ جس طرح قرآن اور صاحب قرآن نے اقامت دین کے نصب العین کو پوری تشریح اور وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے، اسی طرح اس کے طریق کار کے بارے میں بھی کسی حجاب کو حائل نہیں ہونے دیا ہے، بلکہ ایک دیدۂ بینا کو یہ طریقہ قرآن و سنت کے صفحوں میں اسی طرح نمایاں نظر آتا ہے جس طرح اندھیری راتوں میں آسمان کے سینہ پر کہکشاں۔ قرآن، قرآن کے لانے والے اور قرآن کے بھیجنے والے تینوں نے اس طریق کار کی طرف رہنمائی کی ہے، جو کہنے میں تو تین الگ الگ وجود ہیں مگر زیر بحث مقصد کے اعتبار سے تینوں در اصل ایک ہی ہیں۔

قرآنی اصول و نکات قرآن کو غور سے پڑھیے اور اس کی تمام تعلیمات کو مجموعی طور پر سامنے رکھیے تو بڑی آسانی اور وضاحت کے ساتھ وہ اصول و نکات ہاتھ آجاتے ہیں جن پر اقامت دین کی جد و جہد کی جانی چاہیے۔ اور یہی اصول و نکات در اصل تعلیمات قرآن کا مغز ہیں، یعنی از روئے حقیقت سارے قرآن کی بحث کا مرکز یہی ایک مقصد — مقصد اقامت دین — ہے اور اس کی ساری تفصیلات اسی مقصد کے اصول کی شرح ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو اجاگر اور اس مغز کو حاصل کرنے کے لیے قرآن کے چشمۂ حیواں کو اچھی طرح متھنے کی ضرورت ہے، جس کے لیے کافی وقت درکار ہے، اس لیے ہم اس موقع پر قرآن کی صرف ان آیتوں کی طرف توجہ دلائیں گے جو مسلسل ایک ہی رکوع میں درج ہیں اور ہمارے بحث کے لحاظ سے گویا پورے قرآن کا خلاصہ ہیں یعنی اقامت دین کے جو اصول تکا

قرآن کے سیکڑوں صفحات میں پھیلا کر بیان کیے گئے ہیں وہ یہاں چند سطروں میں سمیٹ دیے گئے ہیں۔ یہ آیتیں اقامت دین کے طریق کار کے نہ صرف عملی اصولوں ہی کی وضاحت کرتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ان اصولوں کی ترتیب اور اس نصب العین کے فطری ارتقاء کے تدریجی ادوار و منازل کی نشاندھی بھی کرتی ہیں۔ اس لیے ان آیتوں کو ایک بار ترتیب کے ساتھ پڑھ لیجیے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا .... وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ...

(آل عمران ۱۱۴)

اے ایمان لانے والو: اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ کا حق ہے اور تم کو موت نہ آنے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور ٹولی ٹولی نہ ہو جاؤ۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو تم پر ہوا ہے، جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دل باہم جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے .... اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکتا رہے ایسے ہی لوگ فلاح یاب ہوں گے۔ اور (دیکھو) کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح ہدایتیں پانے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے اور اختلافات میں مبتلا ہو گئے۔

ان آیات کا زمانۂ نزول مدینہ کی ابتدائی زندگی یعنی ۲ھ یا ۳ھ ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب امت مسلمہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی تاسیس و تعمیر کے ابتدائی مرحلوں سے گذر رہی تھی۔ عین اس زمانہ میں یہ آیات کریمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقامت دین اور نظام مومنین کا ایک مختصر مگر جامع ربانی پروگرام لے کر آئیں۔ اس ربانی پروگرام پر غور کیجیے تو بالترتیب اس کے حسب ذیل تین اجزاء یا تین نکات نظر آتے ہیں:

(۱) التزام تقویٰ (۲) اعتصام بحبل اللہ (۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

ان نکات سہ گانہ کو تفصیل کی روشنی میں دیکھیے:-

(۱) التزام تقویٰ

پہلی چیز جو اقامت دین کے سلسلہ میں مطلوب ہے، اور جس کو اس قصر کا سنگ بنیاد کہنا چاہیے اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ہے۔ یعنی ہر وہ فرد جو ایمان کا مدعی ہو اور جو اس فرض کو ادا کر کے اپنے سر سے بندگی کا ذمہ اتارنا چاہتا ہو، اس کے لیے یہ لازم ہے کہ اللہ کا "تقویٰ" اختیار کرے اور تا دم واپسیں، ہر آن اور ہر لمحہ، ایک "مسلم" کی طرح زندگی بسر کرے۔ تقویٰ کا مفہوم، جو قرآن نے متعین کیا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا ٹھیک ٹھیک اتباع کیا جائے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس نے جو حدیں قائم کر دی ہیں ان کی پاسداری کی جائے۔ اس کے کسی امر کی عدم تعمیل سے بھی ڈرا جائے اور کسی نہی کے ارتکاب سے بھی خوف کھایا جائے۔ اور مسلم کے معنی ہیں فرمانبردار اور اطاعت کیش کے، یعنی وہ شخص جس نے اوامر الٰہی کے سامنے بے محابا اپنی گردن جھکا دی ہو۔ تو گویا اقامت دین کے پروگرام کا پہلا نکتہ یہ ہوا کہ انسان سب سے پہلے خود اپنے اوپر اللہ کے دین کو قائم کرے، خوف و رجا کی ساری نیازمندیاں بس اسی ایک ذات کے لیے مخصوص کر دے اور تسلیم و تعظیم اور تذلل و تواضع کے تمام جذبات اسی کی رضا جوئی میں نثار کر دے، تمام اطاعتوں سے منہ موڑ کر اسی ایک آقا کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لے۔

اپنے نفس کو ان تمام رذائل سے پاک کرے جو ناخوشنودی رب کے موجب بنتے ہیں اور ان تمام محاسن سے آراستہ کرے جو رضائے الٰہی کے باعث ہیں۔ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقتی غلام سمجھتا رہے اور اس کے کسی حکم کی بجا آوری میں نہ تو لیت و لعل کرے اور نہ دل تنگ ہو۔ اپنی نگاہ کو رضائے حق اور امتثال امر رب پر پوری طرح جمائے رہے خواہ کتنی ہی مخالفتیں، مصیبتیں، ناسازگاریاں اور دل شکنیاں اس کی راہ میں کیوں نہ حائل ہوں کہ دراصل یہ چیزیں مشکلات و مصائب نہیں ہیں بلکہ اتباع حق اور التزام تقوی کی وہ امتحان گاہیں ہیں جن سے گذرے بغیر کسی مدعی ایمان کا ایمان و تقا خدا کے ہاں سند اعتبار اور شرف قبول نہیں حاصل کرتا۔ جیسا کہ قرآن کا فیصلہ ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الخ

(بقرہ - ۱۹)

ہم ضرور تم کو (یعنی تمہارے ادعائے ایمان کو) خطروں اور فاقوں اور مال و جان اور پیداوار کے نقصانوں کے ذریعہ آزمائیں گے۔ اور اے نبی! ان لوگوں کو کامرانی کا مژدہ سنا دو جو ان خطرات و نقصانات کو صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کر لیں۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُتْرَكُوا اَنْ يَقُولُوا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ

(عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں پرکھا نہ جائے گا؟ حالانکہ (یہ آزمائش ہماری ہمیشہ کی سنت ہے اور) ہم نے ان سے پہلے بھی لوگوں کو پرکھا ہے۔ سو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ یہ ضرور دیکھے گا کہ تم میں سے کون سچے ہیں اور کون جھوٹے۔

پس ان چیزوں سے گھبرانے کے بجائے ان کا خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کرنا چاہیے ورنہ وہ دل ایمان کا لذت شناس نہیں ہو سکتا جو ان عوائق کے آگے سپر ڈال دے اور وہ سینہ تقوی کے نور سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا جو اس آزمائش کی ہمت نہ رکھتا ہو۔ بڑے دھوکے میں ہوگا وہ شخص جو حدود اللہ کی پاسداری اور احکام قرآنی کی پیروی میں اپنے جانی اور مالی، گروہی اور طبقاتی، قومی اور وطنی مفادات کا بچاؤ پہلے کر لینے کی فکر کرے اور اتباع حق کو جان و مال کی کامل حفاظت کے ساتھ مشروط رکھتا ہو۔ ایسے شخص کی زبان پر اسلام، اور اس کی شکل و صورت میں تقویٰ تو ہو سکتا ہے مگر اس کا باطن ان طائران قدس کا آشیانہ نہیں بن سکتا۔ غرض ابتلائے مومنین اللہ تعالیٰ کی ایک عام سنت ہے، اور اسی سنت کو پوری کرنے کے لیے اس نے اسلام اور تقا کا راستہ مشکلات اور مصائب کی چٹانوں سے بھر رکھا ہے اس لیے جو شخص اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ کے فرمان الٰہی کی تعمیل کرنا چاہتا ہو اس کو ان چٹانوں سے ٹکرانا اور ان کی ٹھوکریں برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

(۲) اتحاد و تنظیم اس پروگرام کی دوسری دفعہ یا دوسرا نکتہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا کے الفاظ میں بیان ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اہل ایمان جو اپنی انفرادی اصلاح و تزکیہ میں کوشاں اور احکام الٰہی و حدود خداوندی کی پابندی میں سرگرم عمل ہوں، مل کر ایک مضبوط اور منظم جماعت بن جائیں۔ اور ان کو باہم جوڑنے اور متحد کرنے والی چیز نہ تو کوئی نسلی رشتہ ہو، نہ کوئی وطنی مفاد، نہ کوئی معاشی و سیاسی غرض ہو، نہ کوئی دنیوی اور مادی مقصد، بلکہ صرف اللہ کی "رسی" یعنی وہ کتاب ہو جس کو قرآن کہا جاتا ہے، وہ شریعت ہو جس کی پیروی کا ہر مومن نے عہد کیا ہے، وہ دین ہو جس کی اطاعت و اقامت کے لیے بندگان خدا کی آفرینش ہوئی ہے۔ پس یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام کے نزدیک نفس اتحاد ہی کوئی مطلوب و محبوب شے ہے۔ اگر اتحاد کی بنیاد کسی فاسد مقصد پر رکھی گئی ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کو مطلوب نہیں بلکہ اس کی نظروں میں وہ صد درجہ مردود و مبغوض ہے اور

اس اتحاد سے بال برابر بھی مختلف نہیں جو چوروں اور ڈاکوؤں کے مابین ہوا کرتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ اس اتحاد و ائتلاف کا ہے جس کا شیرازہ اتباعِ حق اور اقامتِ حق ہو۔

اقامتِ دین کا یہ نکتہ یعنی اتحادِ امت، اگر ذرا غور کیجیے تو، پہلے نکتہ سے کوئی بالکل الگ اور متغائر شئے نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ ایک طالبِ علم کو اس کی اپنی طبیعت مجبور کرتی ہے کہ اپنے رفقائے درس سے بے تکلفی، دل بستگی اور الفت و محبت رکھے۔ ایک صاحبِ علم کی فطرت چاہتی ہے کہ اربابِ علم و دانش کی ہم نشینی اختیار کرے۔ ایک رنگین طبع اپنے جیسے رنگین مزاجوں کی طرف کھنچ اٹھنے سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتا اور اگر کسی طالبِ علم کو اپنے رفقا سے، کسی صاحبِ علم کو علما و افاضل سے، کسی رنگین مزاج کو اپنے ہم مشربوں سے کوئی گہری وابستگی نہ ہو تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ صحیح معنوں میں طالبِ علم، صاحبِ علم اور رنگین طبع نہیں ہے۔ یہی وہ کشش ہے جس کو عام اصطلاح میں جاذبۂ جنسیت کہا جاتا ہے اور یہی جاذبۂ جنسیت اہلِ تقویٰ کے درمیان بھی اپنا کام کرتا ہے۔ ایک وہ انسان جو خدا پرستی اور اتباعِ احکامِ قرآنی کے جذبات سے سرشار ہو، لازمی طور پر ان لوگوں کی طرف کھنچے گا جو اسی کی طرح اتباعِ حق اور تقویٰ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، یہ ممکن نہیں ہے کہ دو دلوں میں خدا کا حقیقی تقویٰ موجود ہو لیکن وہ آپس میں کٹے ہوئے ہوں، ان میں جذب و انجذاب لازمی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ تقویٰ کی صورت میں اندر کوئی دوسری ہی روح پرورش پا رہی ہے۔ ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کے دو مسافر ایک دوسرے کے غیر بن کر نہیں رہ سکتے۔ یہی راز ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعریف کہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کے الفاظ سے کی گئی ہے، اور کہیں رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ان کی علامتِ فارقہ بتلائی گئی ہے، کہیں اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ان کا نشانِ امتیاز ٹھیرایا گیا ہے۔ گویا اسلام کے مدعیوں اور پیرووں کا باہم جڑ کر رہنا ان کے ایمان اور اتقا کی کسوٹی ہے۔ پھر دوسری طرف اس رنگِ وحدت کو برقرار اور شوخ سے شوخ تر کرنے کے لیے منفی پہلو سے بھی اس پر روشنی ڈال دی گئی ہے اور تصریح کے ساتھ تمام اہلِ ایمان کو متنبہ کر دیا گیا ہے کہ:-

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَکُمْ وَاِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (توبہ-۳)	اے ایمان لانے والو! اگر تمہارے باپ اور بھائی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو ترجیح دیں تو ان کو اپنا ولی نہ بناؤ اور جو ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح ایک سچا مومن اور متقی، دیگر اتقیا اور صالحین سے بُعد اور کشیدگی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے بیگانے ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح وہ فساق و فجار سے رابطۂ قلبی بھی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے یگانے ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن اس امکان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں:-

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ (مجادلہ-۳)	تم کسی ایسے گروہ کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، ان لوگوں سے الفت و مودت کا رشتہ رکھتا ہوا نہ پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول کی عداوت اور مخالفت پر کمربستہ ہوں، خواہ وہ اس کے اپنے ہی باپ، بیٹے یا بھائی یا اہلِ خاندان کیوں نہ ہوں۔

غرض ایک اصول اور نصب العین کی علمبردار پارٹی جس طرح اپنے ارکان کو ڈسپلن کی سخت بندشوں میں باندھ کر رکھتی ہے

اسی طرح قرآن نے مداہنت کے تمام رشتوں کو کاٹ کر ایک مرکز سے جڑ جانے کا مطالبہ کیا ہے، چنانچہ یہی بات اس نے اتحاد و ائتلاف کی فہمائش کے ساتھ بھی واضح کر دی ہے اور کھلے لفظوں میں فرما دیا ہے کہ خبردار ان بدبخت لوگوں کی روش نہ اختیار کرنا جو بینات الٰہی کے انوار رکھتے ہوئے بھی افتراق و تشتت کی تاریکیوں میں کھو گئے (وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ)

(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اقامت دین کے پروگرام کی تیسری دفعہ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ کے ارشاد الٰہی میں واضح کی گئی ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ انفرادی طور پر اپنی اپنی ذات کے اوپر دین حق قائم کرنے اور پھر ایسے تمام افراد کا باہم جڑ کر ایک جماعت بننے کے ساتھ ساتھ اس "خیر و معروف" کی طرف دوسروں کو بھی بلایا جائے جس کو خود قبول کیا گیا ہے اور اس منکر کو حسب استطاعت اور حسب مواقع کہیں بزور شمشیر، کہیں بذریعہ زبان، اور کہیں بواسطہ استکراہ قلب، مٹا ڈالنے کی مسلسل سعی جاری رکھی جائے جس کو خود ترک کیا گیا ہے، یہاں تک کہ خدا کی زمین کے کسی گوشہ میں اس کے دین کے سوا کسی اور دین کا اثر و اقتدار باقی نہ رہ جائے۔ جس طرح اقامت دین کی دوسری دفعہ یعنی افراد امت کا اجتماع و اتحاد، پہلی دفعہ یعنی انفرادی صلاح و تقویٰ کا لازمی تقاضا ہے اسی طرح یہ تیسری دفعہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اس کا عین مقتضائے فطرت ہے۔ نہ کوئی خارجی اور غیر متعلق اور مختلف المزاج حکم۔ محبت کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ گرد و پیش انہی احوال و مناظر کی کارفرمائی ہو جو محبوب کو پسند خاطر ہوں، وہ دل سوز محبت سے آشنا نہیں کہا جا سکتا جو محبوب کی مرضی کو پامال ہوتا ہوا دیکھے اور دیکھ کر سیماب وار تڑپ نہ اٹھے، اس لیے خدا کی محبت اور حق کی جاذبیت، کہ روح تقویٰ و عبادت ہے انہی چیزوں سے۔ ایک خدا پرست اور "متقی و مسلم" کو چین سے بیٹھنے نہیں دے سکتی جب تک کہ صفحۂ ارض پر اس کی نگاہوں میں چبھنے کے لیے ایک باطل اور ایک منکر بھی موجود ہو۔ اس کے اسلام اور ایمان کے یہ شے منافی ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا ملک کو وہ دین الٰہی کے حلقۂ انقیاد سے آزاد اور طاغوت کا فرماں بردار دیکھے اور ٹھنڈے دل سے اسے برداشت کرے۔ پس اقامت دین کا فرض ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ پیروان دین حنیف کی جمعیت امر بالمعروف کے فرض کو سرانجام نہ دے رہی ہو، اور اِتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ کی منزل طے نہیں ہو سکتی اگر اہل ایمان خود اتباع احکام الٰہی کرنے ہی پر اکتفا کر لیں اور ان کو اس سے کوئی بحث نہ ہو کہ باقی دنیا کدھر جا رہی ہے۔

اس اقتضائے ایمانی کے علاوہ امر بالمعروف کی ایک خالص سیاسی ضرورت بھی ہے۔ فطرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ وہی زندہ رہتا ہے جو اقدام کی عملی جرأت رکھتا ہو، بقا اور ارتقا صرف جارحانہ پیش قدمی میں ہے۔ زبردست سے زبردست لشکر بھی اپنے آپ کو شکست کی ذلت سے نہیں بچا سکتا اگر وہ دشمن کے خلاف جارحانہ حملے کرنا نہ جانتا ہو۔ کوئی تحریک زوال و انحطاط کے انجام سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اگر وہ اپنی داخلی تعمیر و تنظیم کے ساتھ ساتھ اپنے بیرونی ماحول کی تسخیر کی مہم سے غافل ہو۔ اسی طرح وہ جماعت جو اللہ کے دین کی علمبردار ہو، اس وقت تک زندگی اور پائندگی کی مستحق نہیں ہو سکتی، نہ ہی اس کے اپنے اوپر دین کا قیام باقی اور مستحکم رہ سکتا ہے جب تک کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اسلحوں سے طاغوتی مورچوں پر مسلسل جارحانہ حملے نہ کرتی رہے۔

جس طرح ایک جاندار کا جسم محنت و مشقت کے بعد اپنے بعض اجزا کے تحلیل ہو جانے کی وجہ سے کمزور ہوتا رہتا ہے اور اس کمزوری

دور کرنے اور اصل طاقت عزیزی کو بحال رکھنے کے لیے غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ جسم کی رگوں میں تازہ خون پہنچا کر اس کی زائل شدہ قوت کو واپس لاتی رہیں اسی طرح اقامت دین کا نصب العین رکھنے والی جماعت کی قوت خیر و تقویٰ کو بقا و استحکام اور مزید نشو و نما دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی رگوں میں امر بالمعروف کے ذریعہ خدا پرستی کا خون تازہ بتازہ داخل کیا جاتا رہے، ورنہ رفتہ رفتہ اس میں روح تقویٰ مضمحل ہوتی جائے گی اور خود اس کے اوپر سے دین کا اقتدار ڈھیلا ہوتا جائے گا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کائنات طبعاً متحرک پیدا کی گئی ہے، سکون و جمود سے اس کی فطرت ناآشنا ہے، اگر اس کو آگے کی طرف بڑھنے کا موقع نہ ملے گا تو یقیناً پیچھے ہٹنے لگے گی، کوئی شے کسی ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتی، ضرور ہے کہ شے کسی سمت حرکت کرتی رہے اس لیے قیام دین کی تحریک اگر آگے نہ بڑھے گی تو پیچھے ہٹنا شروع کر دے گی۔ جب آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ رو پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کی وجہ پوچھی تو کہا "آج تک ہمارا دین ترقی کے زینے طے کرتا رہا لیکن اب جب کہ وہ اپنی حد کمال کو پہنچ گیا ہے، اس کے انحطاط کا آغاز ہوگا کیونکہ جو شے بھی کامل ہو جاتی ہے وہ ناقص ہو کر رہتی ہے" آنحضرت صلعم نے فرمایا "بیشک تم نے بہت صحیح بات کہی"۔ پس نہ صرف اس لیے کہ فریضۂ اقامت دین کا امر بالمعروف ایک لازمی عنصر ہے، بلکہ اس لیے بھی، کہ یہی امر بالمعروف اسلامی جماعت کے جوہر ایمان و اتقا کا محافظ ہے، اس کو اس فرض کی ادائگی سے کوئی چارہ کار نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ قرآن مجید نے اقامت دین کے یہ تین نکات پیش کیے ہیں اس لیے اس فرض کو ادا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ان تینوں نکات پر پورے عزم و استقلال کے ساتھ عمل نہ کیا جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ ان میں کوئی اس قسم کی زمانی ترتیب ہے کہ جب پہلے نکتہ پر کامل طور سے عمل ہو لے تب دوسرے کی بسم اللہ کی جائے اور جب دوسرے کا کمال اتباع معرض وجود میں آ لے تو تیسرے کو سامنے لایا جائے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں نکات پر بیک وقت عمل شروع ہو جانا چاہیے اور اس سے پہلے اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو صرف ایک چیز کی ہے، یعنی ذہن کی پوری یکسوئی اور قلب کی سچی شہادت کے ساتھ لا الٰہ الا اللّٰہ اور محمد رسول اللّٰہ پر ایمان لانا۔ اس اقرار و اعتراف کے بعد جب ایک شخص یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے زمرۂ مخاطبین میں آ گیا تو قرآن بیک وقت اس کے سامنے یہ تینوں مطالبے رکھ دیتا ہے اور اس کے لیے اپنے حالات اور اپنی استطاعت کے مطابق ان تینوں نکات پر ایک ساتھ عمل کرنا لازمی ہو جاتا ہے کیونکہ ان تینوں نکات میں عمل کے لحاظ سے تفریق کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں اور حقیقت تو یوں ہے کہ دوسرے اور تیسرے نکتے بھی پہلے ہی نکتہ کے اجزا یا یوں کہیے کہ اسی کے تکملات ہیں نہ کہ اس سے علٰحدہ مستقل بالذات نکتے۔ اس طرح دوسرے اور تیسرے نکتوں پر عمل پیرا ہونا در اصل پہلے ہی نکتہ کے اتباع کی تکمیل ہے اور جب تک ان دونوں پر عمل نہ ہو لے، پہلے پر عمل کا حق ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک کسی کل کے تمام اجزا موجود نہ ہو لیں وہ کل اپنی کامل شکل میں وجود پذیر ہو ہی نہیں سکتا۔

اس دعویٰ کی صحت معلوم کرنے کے لیے کسی بڑی بحث و تحیص کی ضرورت نہیں بجز اس کے کہ تقویٰ کے صحیح مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ تقویٰ ان تمام حدود کی ٹھیک ٹھیک پابندی کا نام ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے میدان زندگی کے ہر چہار اطراف میں قائم کر دی ہیں اور آدمی اس وقت تک متقی نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات میں ـــــ خواہ ان کا تعلق اس کے اپنے نفس اور اپنی انفرادی زندگی سے ہو، خواہ منزلی اور معاشرتی

زندگی سے، خواہ سیاسی اور اجتماعی زندگی سے ـــــ غرض ہر جگہ اور ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے احکام کی تبلیغ اور اس کی قائم کی ہوئی حدود کی حفاظت اور نگرانی نہ کرے۔ اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اس امر سے انکار کرنا کہ اقامتِ دین کے باقی دو نکات دراصل پہلے ہی نکتہ کے مقتضیات اور تکملات ہیں، ایسا ہی ہے جیسے کوئی دو دو مل کے چار ہونے سے انکار کر دے۔ کیونکہ اپنے نصب العین زندگی کی خاطر تمام اہلِ ایمان کا باہم متحد رہنا اور امر بالمعروف میں اشتغال دائمی رکھنا بھی تو منجملہ انہی احکام و حدود کے ہے جن کی پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ قرآن کی ان آیتوں کو غور سے پڑھیے:-

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (توبہ - ۱۵)

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور راستبازوں کے ساتھ رہو۔

(۲) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (حجرات - ۱)

مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان (اختلاف و عناد پیدا ہونے کی صورت میں) صلح کرا دو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ اس کی رحمت سے سرفراز ہو سکو۔

(۳) ...... وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (روم - ۴)

...... اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے اور اب ہر کوئی اپنے اپنے خیالات و افکار میں مست ہے۔

ان میں سے پہلی آیت میں سچے مومنوں سے جڑ کر رہنے کو اور دوسری میں دو باہم پھٹے ہوئے مومن دلوں کے دوبارہ جڑ دینے کو "اتقا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور تیسری آیت میں اس رشتۂ اخوت و یگانگت کے فقدان کو بالکل شرک کا مظہر قرار دے کر اس حقیقت کے چہرے سے آخری حجاب بھی دور کر دیا گیا ہے کہ ایمان و تقویٰ کے تحقق کے لیے جماعتی اتحاد و مرکزیت شرطِ لازم ہے۔ اس اصل دینی کی پوری وضاحت اور اہمیت دیکھنی ہو تو ان آیات کے ساتھ ان احادیث کو بھی سامنے رکھ لینا چاہیے جن میں جماعت کے لزوم پر کفر و ایمان تک کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اور صاف طور سے بتا دیا گیا ہے کہ اس جماعت مومنین سے، جو "الجماعت" ہے اور جو صحیح معنوں میں دینِ حق کی علمبردار اور رسول کے مشن کی حامل اور اصحابِ رسول کے نقوشِ قدم کی پیرو ہے، الگ ہونے والا دائرۂ اسلام سے خارج، اس کی زندگی کافرانہ، اس کی موت جاہلیت کی موت اور اس کا انجام آگ کا انجام ہے۔

اس کے بعد چند دوسرے نصوص ملاحظہ ہوں جن میں امر بالمعروف کو تقویٰ کا کام قرار دیا گیا ہے:-

...... يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ...... وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ (آل عمران - ۱۲)

یہ لوگ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں منکر سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں پوری سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں ...... اور اللہ متقیوں سے واقف ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (توبہ - ۱۶)

اے ایمان لانے والو! ان کافروں سے لڑو جو تمھارے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر درشتی محسوس کریں۔ یاد رکھو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

پہلی آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو صفات متقین اور اوامر تقویٰ میں شمار کیا گیا ہے اور دوسری میں نہی عن المنکر کی ایک خاص شکل یعنی قتال کفار کو تقویٰ سے موسوم کیا گیا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ - ۹)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں سب آپس میں ایک دوسرے کے "ولی" ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

اس آیت نے دونوں چیزوں کو اجزائے ایمان کے تحت ایک ہی ساتھ جمع کر دیا ہے اور باہم جڑ کر ایک منظم پارٹی کی طرح رہنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا مومنین کا نشان، امتیاز اور مقتضائے ایمان قرار دیا ہے۔

ان آیات کی روشنی میں اس وہم کی تاریکی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ جب تک اقامت دین کے پہلے نکتہ پر پورا پورا عمل نہ ہولے اور انسان کا باطن نور تقویٰ سے بخوبی منور نہ ہولے اس وقت تک اس کے لیے دوسرے اور تیسرے نکات کی طرف توجہ کرنے کی اجازت نہیں۔ دراصل یہ وہم ایک زبردست حجاب ہے جو ہمارے نیکوکار افراد کی بصیرتوں پر پڑا ہوا ہے جس کا ظاہری پہلو یقیناً بڑا ہی جاذب نظر اور روحانیت نواز دکھائی دیتا ہے مگر اس کا باطن اوہام باطلہ اور فریب جہل سے یکسر مملو ہے۔ جب ایک شخص متقی اسی وقت ہو ہی سکتا ہے جب وہ دیگر اہل ایمان سے اتحاد و ولایت کا رشتہ جوڑ لے اور بقدر امکان امر بالمعروف کے فرائض سرانجام دیتا رہے تو یہ بات کتنی لایعنی ہوگی کہ آدمی پہلے متقی کامل بن لے تو "اعتصام بحبل اللہ جمیعاً" اور "امر بالمعروف" کی مہم کا آغاز کرے۔ ان تینوں نکات کی مثال تو بالکل ایک درخت کے اجزاء کی سی ہے، جس طرح بیج سے ننھا سا پودا اگتے ہی اس میں جڑ، تنہ اور پتے کی تخلیق ہو جاتی ہے اور تینوں ایک ساتھ نشوو ارتقا حاصل کرتے ہیں، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ بیج سے جڑ نکل کر خوب موٹی تازی ہولے تب اس میں سے تنہ نکلے اور جب تنہ اپنی پوری بالیدگی کی حد کو پہنچ لے تو اس میں سے پتیاں نکلنی شروع ہوں، یہی تخم ایمان سے پھوٹنے ہوئے شجر اسلام کا حال بھی ہے۔ طہارت نفس یعنی انفرادی تقویٰ کو اس شجرۂ مبارکہ کی جڑ اور اتحاد و ائتلاف کو اس کا تنہ اور امر بالمعروف کو اس کی پتیاں سمجھنا چاہیے۔ زندہ جڑ کا فطری تقاضا یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اس میں سے شاخیں، اور شاخوں سے پتیاں نکلنی شروع ہوں۔ اسی طرح نفس انسانی میں طہارت اور روح تقویٰ کا وجود اس امر کو مستلزم ہے کہ اس میں سے اتحاد امت اور امر بالمعروف کی مساعی کا ظہور ہو۔

قرآن کے طریقۂ نزول سے رہنمائی

اقامت دین کا یہی ذو طریقہ کار ہے اور اس کے یہی ذو اصول نکات ہیں جو قرآن حکیم کی حکیمانہ ترتیب نزول سے بھی مستنبط ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے جو آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں ان میں صرف دو چیزوں کی تعلیم تھی، ایک تو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت وغیرہ کی تعلیم دوسری اقامت صلوٰۃ اور محاسن اخلاق کی تعلیم۔ جس طرح ایک کسان اپنی زمین میں مہینوں ہل چلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بیج کو روئیدگی بخشنے کے لیے بالکل تیار ہو جاتی ہے تو اس وقت وہ جو بیج بھی اس میں ڈالتا ہے، فوراً اگ آتا ہے، اسی طرح تیرہ برس کی طویل مدت تک اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صرف ایمان کی، اور ذکر و نماز اور اسی طرح کے چند بنیادی امور کی تعلیم و تلقین کرتا رہا۔ چنانچہ بالکل ابتدائی سورتوں مثلاً سورہ مزمل سورہ مدثر وغیرہ کو پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بار عظیم کے اٹھانے کے لیے، جو پیغمبر اور اس کے حواریوں پر ڈالا جانے والا تھا، کس طرح ایمان کو دلوں میں اتارنے کے ساتھ ساتھ نماز اور ذکر الٰہی، صبر اور توکل اور انابت و خشیت کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ اس لیے تاکہ دل اس بوجھ کو سہارنے کے لیے تیار ہو جائیں جو آگے چل کر ان پر پڑنے والا ہے اور طاعت و انقیاد کے لیے اس حد تک آمادہ ہو جائیں کہ جس وقت جو حکم بھی اوپر سے آئے بلا چون و چرا اس کی تعمیل کے لیے اپنی جان و مال حاضر کر دیں۔ اور شہادت و اقامت دین حق کا جو فرض ان پر عائد کیا جانے والا ہے اس کو ادا کرنے کے لیے مستعد

ہوجائیں جب انفرادی حیثیت سے یہ تزکیہ قابل اطمینان حد تک پہنچ چکا تو زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق حدود و احکام کا نزول شروع ہوا اور وہ تھوڑا تھوڑا نازل ہونے لگیں جن میں ایک منظم پارٹی کی حیثیت سے مسلمانوں کو سامنے رکھکر ہدایتیں دی گئی تھیں۔ اس ضمن میں وہ احکام بھی آئے جو تمام اہل ایمان کو ایک جماعت بن کر رہنے کی ہدایت پر مشتمل تھے اور وہ احکام بھی جو ایک جماعت کی تطہیر وتمحیص کی ہدایات سے متعلق تھے۔ مدنی سورتوں کو پڑھیے تو یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے گی۔ پھر امر بالمعروف کا حکم بھی حالات کے لحاظ سے ایک خاص ترتیب کے ساتھ نازل ہوتا رہا۔ مکی زندگی میں یہ حکم زبانی تبلیغ وارشاد تک محدود رہا۔ مدینہ میں زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے کام لینے کی بھی تاکید کی گئی لیکن ایک عرصہ تک حالات کے لحاظ سے یہ کام صرف مدافعت کی حد تک محدود رہا۔ پھر فتح مکہ کے بعد، جب عرب میں کفر نے سپر ڈالدی اور مسلمانوں کو اطمینان اور بے خوفی کی فضا میسر ہوئی اور وہ ایک بالادست قوت کی حیثیت میں ہوگئے، تو تمام کفار، مشرکین سے برأت کا اعلان کرکے دفاع، اقدام سے بدل دیا گیا اور قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فرماکر اس وقت تک کے لیے اہل ایمان کو امر بالمعروف یعنی حق کی اشاعت اور اقامت کا ذمہ دار بنادیا گیا جب تک کہ یہ دنیا باقی ہے اور اس میں حق سے باطل، معروف سے منکر، ایمان سے کفر اور دین الٰہی سے دین طاغوت حریفانہ زور آزمائی کے لیے موجود ہے۔

اسوۂ رسول| اقامت دین کا یہ طریق کار اور اس کے اصول ومناہج تو ہمیں قرآن سے حاصل ہوتے ہیں، اب اگر آپ معلم قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ وہی اصول ونکات جو قرآن کے اندر الفاظ کے جامہ میں تھے، یہاں واقعات اور تجربات کی شکل میں موجود ہیں اور نبی اکرم نے ٹھیک انہی لائنوں پر امت مسلمہ کی تاسیس اور تربیت وتنظیم کی۔ سب سے پہلے تو آپ نے عرب کے اس کفرزار میں جس کا چپہ چپہ دین طاغوت کی آہنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا، ایک آواز بلند کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ انسان اپنے تمام جذبات ومیلانات اور اپنی زندگی کے تمام مسائل ومعاملات کو اس ذات واحد کے تابع فرمان بنادے جس کے سوا اس زمین پر کسی کو اپنی مرضی منوانے اور اپنا حکم چلانے کا استحقاق نہیں۔ یہ نامانوس آواز جن بہرے کانوں سنی گئی اور اس کو دبانے کے لیے جن انسانیت سوز مظالم سے کام لیا گیا ان سے کوئی صاحب نظر ناواقف نہیں ہے، سیاسی حالات نے آنکھیں دکھائیں، وطنی مفاد نے آڑے آنے کی کوشش کی، وقت اور ماحول نے ساتھ دینے سے انکار کیا، مصلحتوں نے دامن پکڑا، مشکلات نے راستہ روکا، ہلاکتوں کا طوفان نمودار ہوا، مگر اللہ کے اس بندہ نے اپنی آواز میں کبھی کوئی پستی نہیں آنے دی اور حالات زمانہ، رفتار واقعات اور مستقبل کے امکانی خدشات، غرض ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے اس حقیقت کو دوسروں پر برابر کھولتا رہا جو خود اس پر کھل چکی تھی اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے عقیدۂ توحید اور نظریۂ زندگی میں تن تنہا تھا اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں کیا کہ اس عقیدہ اور نظریہ کو چھپائے رکھے اگرچہ پوری دنیا اس کی زبان بندی پر کمربستہ تھی۔ بالآخر اس دعوت حق نے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا اور ان لوگوں میں سے جن کے اندر قبول حق کی صلاحیتیں ابھی زندہ تھیں، ایک ایک دو دو کرکے آپ کے حلقۂ اطاعت میں آنے لگے۔ آپ نے ان کے قلوب واذہان میں ایک خدا کی غلامی اور پرستش کا گہرا نقش بٹھایا اور اصولی طور پر ان کو یہ بات سمجھادی کہ رضا صرف اس کی چاہو جس نے تمہیں زندگی اور سامان زندگی عطا کیا اور حکم صرف اس کا مانو جس کے سوا سب تمہاری ہی طرح عاجز ودرماندہ ہیں۔ یہ نقش بٹھانے کے بعد ان کو زندگی کے احوال ومسائل میں بتدریج وہ احکام سنانے شروع کیے جو احکم الحاکمین کی طرف سے آپ پر نازل ہوتے رہے اور ہر حکم پر خود عمل کرتے ہوئے ان کو اس پر عمل کرنے کی تعلیم دی، جاہلیت کی کثافتوں سے ان کے باطن پاک کرکے ان میں مکارم اخلاق کی تخم ریزی کی اور اپنی بے مثال قوت تربیت سے ان کے دلوں کو ایک خدا کی بندگی کا ایسا عقیدت کیش بنایا کہ اعدائے توحید نے اپنے ترکش ظلم وانتقام کے سارے تیر خالی کردیے مگر کسی بندۂ مومن کا دل توحید کے نشہ سے خالی نہ کرسکے۔ اس تربیت اور تزکیہ کے ساتھ ساتھ آپ ان سب لوگوں کو جو آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے جارہے تھے، ایک خاندان کے افراد کی طرح باہم جوڑتے گئے۔ یہ جڑنا اتنا پائیدار تھا کہ

بھائی بھائی کے رشتے اس کے سامنے دو نہ ٹھہر سکے۔ پھر اسی کے ساتھ توحید کی دعوت و تبلیغ نہ صرف یہ کہ باقی رہی بلکہ اس کا دائرہ گھر سے خاندان، خاندان سے قبیلہ، قبیلہ سے شہر اور شہر سے اطراف ملک تک وسیع ہوتا گیا۔ آنحضرت صلعم بھی اور آپ کے اتباع بھی، سب کے سب اس امر حق کی تبلیغ و اشاعت میں ہمہ دم مصروف رہتے اور جس کسی کو شرک و کفر کی نجاستوں میں آلودہ پاتے اسے پاک کر کے ایک خدا کا پرستار اور ایک آقا کا غلام اور ایک حاکم علی الاطلاق کا محکوم بنانے کی کوشش کرتے رہتے، جس بدی کو دیکھتے اس کو مٹانے کی تدبیر کرتے اور کفر و فساد کے جس طوفان سے رحمت حق نے انھیں نجات دی تھی اس میں دوسروں کو ڈوبتے دیکھنا انھوں نے کسی لمحہ بھی گوارا نہ کیا۔ یہ جد و جہد تیرہ برس تک مکہ میں جاری رہی، پھر وہ وقت آیا جب دشمنان حق کے لیے اس دعوت توحید کی مقبولیت اور روز افزوں ترقی ناقابل برداشت ہو گئی اور انھوں نے آنحضرت صلعم کے قتل کا انتظام کر کے اس دعوت کو فنا کر دینا چاہا تو داعی حق اور اس کے پیروان صفاکیش نے مکہ کو خیر باد کہہ کر مدینہ کو اپنے مشن کا مرکز بنایا اور وہاں سے اس نصب العین کی خاطر جد و جہد شروع کر دی جس کو وہ اپنا مقصد زندگی بنا چکے تھے، اور جب کفار نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور ادھر اہل ایمان کی ایک منظم جمعیت بھی فراہم ہو چکی تھی تو بدی کے استیصال اور حق و عدل کی بقا کے لیے تلوار اٹھائی گئی، ایک مدت تک تو طاغوتی طاقتیں خود بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور ہوتی رہیں اور مسلمان صرف مدافعت کرتے رہے۔ اس دوران میں وہ خوف، دہشت، بے اطمینانی اور طرح طرح کے خطرات برداشت کرتے رہے اور جان و مال کی ہر ممکن قربانی کر کے حق کی شہادت دیتے رہے، یہاں تک کہ حدود عرب میں کفر کی شوکت ٹوٹ گئی اور طاغوت کا علم سرنگوں کیا گیا۔ اس وقت مسلمانوں کا قلب اس تائید و نصرت الٰہی پر شکر و امتنان کے جذبات سے بھر تو گیا مگر ان کی سواریوں کے کجاوے اسی طرح بندھے کے بندھے رہے اور ان کی تلواریں اسی طرح کھنچی رہیں۔ ان کے ہاتھ، جو اب تک دفاع کے لیے اٹھ رہے تھے، اب جارحانہ اقدام کے لیے سرگرم کار ہو گئے کیونکہ گو عرب میں بدی نے ہتھیار ڈال دیے تھے، مگر اس کے باہر ہر چہار طرف اس کی حکمرانی پوری شان کے ساتھ قائم تھی اور مسلمان اپنے اس مشن کو بھول نہیں سکتا تھا کہ منکرات کو مٹا دینا چاہیے، جہاں کہیں بھی ہو، اور ہر غیر اللہ کی آقائی پامال ہو جانی چاہیے، خواہ وہ کسی گوشۂ ارض پر ہو، یہ زمین خدا کی پیدا کی ہوئی ہے، اس پر اسی کا حکم چلنا چاہیے، اسی کے قانون کا اتباع ہونا چاہیے، اسی کی مرضی پوری ہونی چاہیے، اور اس "چاہیے" کی کل ذمہ داری میرے سر پر ہے۔ چنانچہ یہ ذمہ داری انھوں نے پورے احساس فرض کے ساتھ ادا کی، اور جب تک وہ ایسا کرتے رہے، اللہ تعالیٰ کی موعودہ تائید و نصرت ان کے ہمرکاب رہی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے باندھا ہوا عہد اقامت دین فراموش ہونا شروع ہوا اور دین حق کا چڑھتا ہوا سورج مسلمانوں کی قسمت کا ماتم کرتا ہوا زوال پذیر ہونے لگا، اور اب دوبارہ بام عروج پر آنے کے لیے اس مبارک صبح کا منتظر ہے جس میں حاملین قرآن عہد فراموشی کے خواب گراں سے بیدار ہو کر اپنے فرض منصبی کو از سر نو سنبھال لیں گے۔

رسائل ومسائل

جذباتی اور غیر حکیمانہ طرزِ تبلیغ

سوال :- میں نے ایک طالب علم کو جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھنے کی ترغیب دی اور زبانی طور پر بھی میں اس کو جماعت کے نصب العین کی طرف دعوت دیتا رہا، جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اب وہ اس مقصد کے لیے اپنے آپ کو بالکل وقف کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔ نتیجہ کے طور پر اس کا ماحول بھی اس کا دشمن ہو رہا ہے اور وہ بھی اس سے سخت بیزار ہے۔ اب اس کی خواہش یہ ہے کہ اپنے مقصد کی خاطر ہجرت کر کے دار الاسلام چلا جائے۔ اس کی والدہ بعض شرائط پر راضی ہو گئی ہیں مگر والد سے اجازت ملنے کی کوئی توقع نہیں، اس لیے اس نے مجھ سے استفسار کیا تھا کہ "کیا والدین کی اجازت اور مرضی کے علی الرغم دار الاسلام ہجرت کر جاؤں؟" میں نے اس کو جواب دے دیا ہے کہ "مکہ سے مدینہ جانے کے قبل تمام مہاجرین نے اپنے والدین سے اجازت نہیں مانگی تھی"۔ اس کا دوسرا استفسار یہ تھا کہ "کیا جماعت میری پشت پناہی پر آمادہ ہوگی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اِن برے سلوک اور مصائب سے دوچار رہوں" اس کے جواب میں میں نے اس کو لکھ دیا ہے کہ "گو اس کے متعلق صاف صاف کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہے مگر اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ نظام باطل کے تحت ہزاروں روپیہ کی ملازمت اور ساری دنیوی لذتیں، نظام حق کی جد وجہد کی خاطر فقر و فاقہ کی زندگی کے مقابلہ میں ہیچ ہیں، رسول عربی کا اسوہ، جس کے اتباع کا ہم مسلمان دم بھرتے ہیں، ہم کو یہی بتاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود تم کو یقین رکھنا چاہیے کہ جماعت ہمیشہ اور ہر وقت ایسے لوگوں کی پشت پناہی پر آمادہ ہے جو نظام باطل سے بھاگ کر نظام حق کی طرف آ رہے ہوں، بلکہ وہ ایسے لوگوں کا خیر مقدم کرے گی بشرطیکہ وہ صرف حق پرست اور حق طلب ہو کر جا رہے ہوں"۔

اب ان امور کے متعلق براہ راست آپ سے ہدایتیں مطلوب ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک چیز اور بھی سامنے آگئی ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میں ایک مدرسہ میں معلم ہوں۔ جب میری ان تبلیغی سرگرمیوں کی اطلاع حکومت کے محکمۂ تعلیمات کو ملی تو اس نے مجھ سے چند سوالات کیے، جن میں مجھ سے جماعت کی حیثیت، اس کے مقاصد، امیرِ جماعت کی شخصیت وغیرہ امور کی بابت استفسار کرتے ہوئے یہ جواب طلب کیا گیا ہے کہ تم ایک فرقہ وار جماعت کے رکن کیوں ہو اور فلاں طالب علم کو کیوں اس بات پر ورغلاتے ہو کہ وہ موجودہ نظام تعلیم کو ترک کر کے خلاف مرضی والدین دیگر ممالک کو ہجرت کر جائے ..... وغیرہا

فرمایئے اس مراسلہ کا کیا جواب دوں؟ میرا اپنا ارادہ تو صاف اظہار حق کا ہے۔

جواب :- آپ نے یہ غلطی کی کہ لوگوں کو تبلیغ کی تیز تیز خوراکیں دے کر ہجرت اور ترک علائق پر آمادہ کرنا شروع کر دیا حالانکہ میں صحیح پوزیشن کئی مرتبہ واضح کر چکا ہوں۔ ہم ابھی تک اُس مرحلہ میں نہیں پہنچے ہیں جبکہ مختلف مقامات سے اپنے سب ہم خیالوں کو ایک جگہ سمٹ آنے کی دعوت دے سکیں۔ نہ ہمارے پاس جگہ ہے، نہ ذرائع ہیں، نہ صحیح معنوں میں ایسا کوئی دار الاسلام بن گیا ہے جس کی

وراثت دار الکفر سے ہجرت کرنا ضروری ہو، اور نہ اصولاً یہ بات صحیح ہے کہ تکی زندگی کی بھٹی سے اچھی طرح گذرے بغیر لوگ مجرد حقیقت و نصب العین قبول کر کے کسی ایک مقام پر جمع ہونے لگیں، کیونکہ اس طرح وہ مضبوط سیرت تو کبھی بن ہی نہیں سکتی جو ایک کافی مدت تک مخالف ماحول میں کشمکش کرنے اور استقامت دکھانے سے بنا کرتی ہے۔ لہذا اس وقت لوگوں کو ہجرت کی دعوت دینا ہمارے کام کے لیے اصولاً غلط بھی ہے اور بجد نقصان دہ بھی، اور اس پالیسی کے بھی خلاف ہے جس پر ہم اس وقت کام کر رہے ہیں۔ ہم اپنے مرکز کو ذرائع کی کمی اور مشکلات کے ساتھ بتدریج مضبوط بنا رہے ہیں اور اس مرحلہ پر صرف ان لوگوں کو بلا رہے ہیں جن کی فی الواقع ہم کو ضرورت ہے۔ اس تدریجی نقشے کے خلاف ایک زائد آدمی کا آجانا بھی ہماری مشکلات میں غیر معمولی اضافہ کر دیتا ہے۔ نیز ہماری کوشش یہ ہے کہ اس مرحلہ پر ہم صرف آزمودہ آدمیوں ہی کو بلائیں جن کے متعلق ہمیں پوری طرح اطمینان ہو کہ وہ ساری اسکیموں میں ٹھیک ٹھیک مددگار ہو سکتے ہیں۔ ناآزمودہ آدمیوں کے بلا انتخاب جمع ہو جانے سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور ایسے اشخاص کے اجتماع سے کام میں مدد ملنے کے بجائے الٹی خرابیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ جب تک میں اپنے نقشہ کے مطابق ایک صحیح و مستحکم ماحول پیدا نہ کر لوں جس پر مجھے یہ اطمینان ہو کہ اب جو اس ماحول میں آئے گا وہ اس کے مزاج کے مطابق ڈھلتا چلا جائے گا اس وقت تک میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ غیر معلوم الحال اصحاب بطور خود مرکز میں آکر رہنا شروع کر دیں۔ سردست جو لوگ مرکز میں آنے کے امیدوار ہوں ان کو ایک کافی مدت تک اپنے ماحول میں رہ کر مشکلات کا مقابلہ کر کے مخالفتوں کے مقابلہ میں صبر و استقامت دکھا کر اپنی اس قابلیت کا ثبوت دینا چاہیے کہ وہ مرکز میں بلائے جانے کے لائق ہیں۔ اب اخلاقی جرأت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ خود ان نوجوان دوست کو لکھیں کہ آپ نے جو ان کو ہجرت کرنے کی ترغیب دی تھی وہ آپ کی غلطی تھی اور آپ سے یہ غلطی جماعتی پالیسی کے خلاف سرزد ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ آپ انھیں تلقین کیجیے کہ وہ ایک طرف اپنی دینی معلومات کو ضروری حد تک مکمل کرنے کی کوشش کریں، اور دوسری طرف ہماری جماعت کے نام پر کوئی کام کرنے سے پہلے ہمارے لٹریچر کو اچھی طرح پڑھ کر ہمارے مسلک اور طریق کار کو سمجھ لیں پھر اس کے مطابق اپنے ماحول میں ٹھیک ٹھیک کام کرنے کی کوشش کریں۔

آپ کی یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ آپ نے عزیز موصوف کو ان کے والد کے علی الرغم ہجرت کرنے کی رائے دی۔ اول تو کم میں مشرک و کافر ماں باپ کے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا گیا تھا وہ بعینہٖ اُن مسلمان ماں باپ کے معاملہ میں اختیار کرنا درست نہیں ہے جو ہمارے نزدیک خواہ کتنی ہی غفلت و ضلالت میں مبتلا ہوں مگر بہرحال ہیں مسلمان۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی مرحلہ پر والدین کی اجازت کے بغیر، بلکہ ان کے حکم کے خلاف کوئی اقدام کرنا اولاد کے لیے جائز ہو بھی سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ امیر جماعت تمام شرعی پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ایسا کرنے کا حکم دے۔ ایسے باضابطہ حکم کے بغیر کسی شخص کا بطور خود یہ فیصلہ کر لینا کہ یہ وقت والدین کی نافرمانی کر گذرنے کا ہے کسی طرح صحیح نہیں۔

عزیز موصوف کا جو خط براہ راست میرے پاس آیا ہے اس کو دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جماعت کو، اس کے نظام کو، اور اس کے طریق کار کو بالکل نہیں سمجھے ہیں اور ان کے ذہن میں جماعت کی پوزیشن کا کچھ عجیب تصور قائم ہو گیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس جماعت نے اپنا کوئی اسٹیٹ قائم کر لیا ہے اور وہ اسٹیٹ بھی بڑا دولت مند ہے، اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ انھیں یہاں آنے کے مصارف ہم بھیجیں گے، یہاں ان کی ضروریات کی کفالت بھی ہم ہی کریں گے، اور ان کو سال میں دو مرتبہ [illegible] ہم اپنے ہی

خرچ پر بھیجتے رہا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس تصور کو لیے ہوئے اگر وہ دار الاسلام آنے پر آمادہ نہ ہوتے تو اور کیا کرتے؟ اور اگر ہماری دعوت ایسی ہی غیاعشانہ ہو تو ٹھیک نیت اہل ایمان میں سے کس کو اپنی نوکری چھوڑ دینے یا مدرسے سے نکل آنے میں تامل ہو سکتا ہے۔ ان کی اس بات سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپ کا طرز تبلیغ بہت خام ہے۔ جس میں فہم کا عنصر کم اور جذباتی جوش کا عنصر زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے ایسے لوگ جو ہمارے مسلک و طریق کار کو پانچ فی صدی بھی نہیں سمجھے ہیں۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمارے ساتھ آملنے کو سو فیصدی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ براہ کرم اس طرز تبلیغ کی اصلاح کیجیے ورنہ جو پیچیدگی ان عزیز کے معاملہ میں پیش آئی ہے اس سے زیادہ آئندہ پیش آنے کا خطرہ ہے۔

یہ بات بھی میں اس سے پہلے آپ کو بتا چکا ہوں کہ جب تک آپ سرکاری ملازمت میں ہیں قواعدِ ملازمت کے اندر رہتے ہوئے کام کیجیے۔ اول تو کسی سے تنخواہ لینے کے بعد ان شرائط کی پابندی نہ کرنا جن کے تحت وہ تنخواہ دے رہا ہے اخلاقی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ قواعد کے خلاف کام کریں گے اور اس کی پاداش میں برطرفی یا کسی اور قسم کی سزا پائیں گے تو اس سے آپ کی اخلاقی پوزیشن اتنی کمزور ہو جائے گی، حالانکہ اس وقت نظام جاہلیت کے خلاف ہمارا سب سے بڑا اسلاح جنگ اگر کوئی ہے تو وہ اخلاق ہی ہے۔ اس لیے آپ نے طالب علم مذکور کو جس طرز کی تبلیغ کی اور اس کی وجہ سے جو باز پرس آپ سے ہوئی وہ ان ہدایات کے خلاف ہیں جو آپ کو مرکز سے دی گئی تھیں۔ اب آپ کو ان سوالات کے جواب میں، جو آپ سے کیے گئے ہیں، بالکل سیدھے اور صاف طریقہ سے صحیح صحیح بیان دینا چاہیے۔ لیکن جواب آپ کا سخت نہ ہونا چاہیے۔ زبان اور لب و لہجہ میں پوری معقولیت ہو۔ جو غلطی ہے اس کو غلطی تسلیم کر لیجیے، اور آپ کی اور اس جماعت کی جو صحیح پوزیشن ہے اس کو بے تکلف بیان کر دیجیے۔

ہمارے طریق کار پر چند اعتراضات اور انکا جواب

سوال: ۔ آپ کے طریق کار میں ہم کو چند بنیادی غلطیاں نظر آتی ہیں جن کو نیچے درج کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ ان کے متعلق اپنے خیال کی وضاحت فرمائیں گے۔

(۱) آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کا طریق تبلیغ وہی ہے جو انبیاء کرام کا تھا۔ مگر ہر نبی پہلے خالص توحید کی دعوت دیتا تھا اور ایک ایک باطل کو نام لے لے کر اس کی پرستش سے لوگوں کو منع کرتا تھا۔ لیکن آپ ان باطل الہوں کا ذکر ضمناً کرتے ہیں، اصل مقصد تبلیغ اسے قرار نہیں دیتے۔ کیا کسی نبی نے مصلحتاً اس کام کو مؤخر کیا تھا اور پہلے صرف ربوبیت کے تصور کو پیش کرنے ہی پر اکتفا کیا تھا؟ آپ کے اس طریق سے آپ کے گرد بھیڑ تو اکٹھی ہو سکتی ہے مگر اس بھیڑ میں بہت کم لوگ شرک سے کلی طور پر پاک ہوں گے۔ مثلاً آپ کی جماعت کے ایک رکن کا نام "محمد غوث" ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک ایک ایک مشرکانہ فعل پر انگلی رکھ کر نہیں بتایا جائے گا، مسلمان شرک سے پاک نہیں ہو سکتے۔ اس لیے لازمی ہے کہ آپ بھی حضرت شاہ اسماعیل شہید کی طرح موجودہ دور کے ایک ایک مشرکانہ فعل کی تشریح کر کے اس کی حقیقت واضح کر دیں۔

(۲) آپ کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں حکومت سب سے بڑا بت اور طاغوت ہے جس کی پرستش ہو رہی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس حکومت کے کارندے اس بت کے پجاری ٹھیرے، یعنی شرک کے مرتکب۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ایسے اشخاص کو اپنی جماعت میں

شامل ہونے کی اجازت دیتے ہیں جو ریل، ڈاک اور تعلیم کے سرکاری محکموں میں لازم ہیں؟ اگر آپ اضطرار کی رخصت کی بنا پر یہ اجازت دیتے ہیں تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ایسے تمام لوگ واقعۃً حالتِ اضطرار ہی میں مبتلا ہیں اور رخصتِ اضطرار کے تمام شرائط اپنے اندر رکھتے ہیں؟

(۳) آپ کے خیال میں مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بنی اسرائیل اپنے نبی کے ذریعہ ایک بادشاہ کے تقرر کی درخواست کرتے ہیں اور انھیں یہ جواب نہیں دیا جاتا کہ جب نبی تمہارے اندر موجود ہے تو تم یہ کیسا مطالبہ کر رہے ہو۔ بلکہ بادشاہ مقرر کر دیا جاتا ہے؟ نیز جَعَلَکُمْ مُلُوْکًا کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہی نبوت سے الگ مستقل طور پر ایک نعمت ہے۔ اسی طرح سلیمان علیہ السلام بھی "ملک" حاصل ہونے کی دعا کرتے ہیں اور ملنے پر اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں اور بحیثیت ایک بادشاہی کے ملکۂ سبا سے اطاعت چاہتے ہیں۔ ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ بادشاہی کی خواہش کرنا بذاتِ خود محمود چیز ہے اور دین کے قیام کے نتیجے کے طور پر اس کا حصول تو اللہ کا مقرر کردہ انعام ہے۔

نیز حضرت موسیٰ کا بنی اسرائیل کی ساری قوم کو فرعونیوں کی غلامی سے نکال کر الگ لے جانا بھی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ بھی اپنی قوم کے افراد کی انفرادی اصلاح اور تزکیہ سے پہلے غلامی سے نجات دلانا ضروری خیال فرماتے ہیں۔ چونکہ نبی کا کوئی فعل اپنی رائے سے نہیں ہوتا اس لیے حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی اصلاح اور تزکیہ سے پہلے اگر مسلمان کہلانے والی قوم کو سیاسی غلبہ دلانے کی کوشش کی جائے اور بعد میں ان کے اعمال کی خرابیوں کی اصلاح کی جائے تو یہ طریقہ بھی صحیح ہے۔

جواب (۱) معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہمارے لٹریچر کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا۔ ہمارا طریقِ دعوت بعینہٖ وہی ہے جو حضرات انبیائے کرام کا تھا۔ البتہ زمانہ کے اقتضا سے ہم نے شرک کی اُن اقسام پر اصلی ضرب لگانے کی کوشش کی ہے جو اس عہد میں نہ صرف یہ کہ لوگوں سے مخفی تھیں بلکہ ان کا شمار اجزائے توحید میں ہونے لگا تھا اور وقت کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان کو خدا پرستی سمجھے بیٹھا تھا۔ "محمد غوث" جیسے ناموں پر مورچے قائم کرنے والوں اور مردہ خداؤں کی نذروں اور منتوں پر تکفیر کرنے والوں کی تو کمی نہیں تھی، البتہ زندہ خداؤں اور باقتدار طاغوتوں اور آلہہ کی بندگی کو شرک قرار دینے کی نہ صرف یہ کہ جرأت لوگوں میں مفقود تھی بلکہ اس کے شرک ہونے کا تصور بھی مسلمانوں میں مردہ ہو چکا تھا۔ ہم اس وقت یہی کام کر رہے ہیں اور اس کی تفہیم کے لیے ہم جو چیز مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں اس کا اثر ان شاء اللہ یہ ہوگا کہ شرک اپنی تمام جلی و خفی قسموں اور اپنے تمام اشباہ و قوالب کے ساتھ ختم ہو جائے گا، اور لوگ اپنے ناموں اور کاموں ہر چیز میں شرک سے نفرت کرنے لگیں گے۔

(۲) ہم موجودہ زمانے کے ان کمزور مسلمانوں کو جو طاغوت کی بندگی میں لگے ہوئے ہیں تھوڑا سا الاؤنس محض اس وجہ سے دے رہے ہیں کہ ان پر امرِ حق واضح کرنے کی کوشش پہلے نہیں کی گئی ہے۔ انھوں نے ایک باطل نظام کی خدمت اس کو باطل سمجھ کر نہیں کی ہے بلکہ اس کو یا تو اسلام اور مسلمانوں کی عزت و سرفرازی سمجھ کر اختیار کیا یا کم از کم اسے حصولِ رزق کا ایک پاک وسیلہ سمجھا۔ جو لوگ ان کی اس جہالت کو دور کر سکتے تھے، یعنی حضرات علماء، انھوں نے طرح طرح سے اس جہالت کو اور زیادہ بڑھانے کی کوشش کی۔ اب ہماری دعوت سے جو لوگ متنبہ ہوئے ہیں اور موجودہ حالت سے بیزاری محسوس کرنے لگے ہیں ہم ان سے یہ توقع نہیں کر سکتے

کر وہ دفعۃً جست لگا کر باطل سے حق کی طرف آجائیں گے۔ وہ ایک حد تک مہلت پانے کے بہرحال مستحق ہیں اور جن مسلمانوں تک ابھی ہماری دعوت پہنچی ہی نہیں ہے ان کو تو دعوت پہنچانے سے پہلے ہمیں سرے سے ملامت کرنے کا حق ہی نہیں ہے۔

(۳) بنی اسرائیل میں بادشاہی کا آغاز نبوت سے الگ ہو کر نہیں ہوا، بلکہ نبوت کے تحت ہوا۔ ہر بادشاہ کے زمانہ میں ایک نبی بھی ہوتا تھا اور وہ سارے نظام میں وہی حیثیت رکھتا تھا جو نظامِ جسم میں آنکھ کی پتلی کو حاصل ہے۔ بادشاہ بالکلیہ اس کے تحت ہوتا تھا اور جو کچھ کرتا تھا اس کی ہدایت کے مطابق کرتا تھا۔ توریت میں ہر زمانہ کے ملوک اور انبیاء کی تفصیل موجود ہے۔ قرآن میں مقامِ مدح میں ملک کا لفظ اصطلاحی (Monarch) کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ مجرد صاحبِ اقتدار کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ یہ اقتدار خدا کے قانون کا بخشا ہوا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کے متعلق بھی آپ کو غلط فہمی ہے۔ یہ فرعون سے بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کا مطالبہ نہیں تھا بلکہ توریت میں تصریح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو قربانی کرنے کے لیے کسی ایسے مقام پر لے جانا چاہتے تھے جو بیابان میں تین دن کی راہ کے فاصلہ پر تھا۔ قرآن کے الفاظ سے اس کی تائید ہوتی ہے اور بلادلیل توریت کے اس بیان کی تردید کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ کچھ لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ کو دلیل قرار دے کر انگریزوں کی غلامی اور چاکری کو ثواب بتا رہے ہیں اور کچھ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مطالبہ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کو دلیل قرار دے کر موجودہ تحریکِ آزادی کو فرضِ دینی بتا رہے ہیں۔ اور ان میں سے کسی بزرگ کو اس بات پر غور کرنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ آخر کیا ذاق ہے کہ ایک نبی یہ پیغام لے کر آئے کہ فرعون کی نوکری کرو اور دوسرا پیغمبر یہ دعوت لے کر اٹھے کہ فرعون کے اقتدار سے آزادی حاصل کرو۔ اگر ان حضرات کی قرآن فہمی کا یہی حال ہے تو عجب نہیں کہ صریح کفر و شرک کو بھی یہ لوگ انبیاء کا لایا ہوا دین ثابت کر دیں۔

گناہ کبیرہ پر تکفیر

سوال:۔ ہم نے اپنی ایک جماعت بنائی ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے۔ ہم فسق اور کفر میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ ہماری جماعت عام مسلمانوں کو وہی حیثیت دیتی ہے جو قرآن نے اہل کتاب کو دی ہے، مثلاً ہم شادی بیاہ جماعت کے اندر ہی کرتے ہیں، غیر جماعتی مسلمانوں سے لڑکیاں تو لے لیتے ہیں مگر اپنی لڑکیاں ان کے عقد میں نہیں دیتے۔

ہمارے اس عقیدہ اور طرزِ عمل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ صحیح ہیں یا غلط؟ اگر غلط ہوں تو تشفی بخش طریقہ پر ہماری غلطی ہم پر واضح فرمایئے۔

جواب:۔ تحقیق کرنے سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کی جماعت میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو دین کا صحیح علم اور تفقہ رکھتا ہو اور اس کا ثبوت خود ان مسائل کی نوعیت سے بھی ملا۔ کیونکہ یہ مسائل آپ ہی ظاہر کر رہے ہیں کہ ان کو پیدا کرنے والا ذہن کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں نظر نہیں رکھتا۔ اب اگر میں یہ کہوں تو اس پر برا نہ مانا جائے بلکہ اسے اس حق نصیحت کی ادائگی سمجھا جائے جو ایک مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان پر واجب ہے کہ علم دین کے بغیر دین کے مسائل میں رائیں قائم کرنا اور ان کو دین قرار دے کر انفرادی یا اجتماعی زندگی کے لیے اصول بنا لینا خود سب سے بڑا فسق اور تمام کبائر سے بڑھ کر کبیرہ ہے۔ اس لیے کہ ہم مسلمان اگر ہو سکتے ہیں تو اس دین پر ایمان لا کر اور اس کی پیروی کر کے ہو سکتے ہیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں پیش کیا گیا ہے۔

اور اس ایمان اور اتباع کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی اصول اخذ کریں اور اپنے عقائد و اعمال کے لیے جن چیزوں کو بنیاد قرار دیں وہ سب کتاب اللہ اور سنت رسول سے ماخوذ ہوں۔ لیکن جو شخص یا گروہ قرآن اور سنت میں بصیرت اور تفقہ نہ رکھتا ہو اور اپنے رجحانات کی بنا پر کچھ رائیں قائم کر کے ان کو دین قرار دے لے وہ حقیقت میں دین کا پیرو تو نہیں ہے، اپنی آرا اور رجحانات کا پیرو ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے کبائر کی کیا حقیقت ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ دین پر ایمان لانے کے لیے جو مجمل علم کافی ہے اور دین کے موٹے موٹے اصول جاننے کے لیے قرآن کی عام فہم تعلیمات کا جو علم اور حدیث پر جو سرسری نظر کافی ہے، اسے مسائل دینی میں رائے قائم کرنے اور دینی طریق پر لوگوں کی رہنمائی کرنے کے لیے کافی سمجھ لینا غلطی ہے اور اسی غلطی کا نتیجہ وہ خطرناک بڑی غلطی ہے جس کی طرف اوپر میں نے اشارہ کیا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں ان مسائل کا مختصر جواب دیتا ہوں جو آپ نے میرے سامنے پیش کیے ہیں:

کفر دراصل اس چیز کا نام ہے کہ کسی آدمی کے سامنے دین کو پیش کیا جائے یا دین اس کے سامنے پیش ہو اور وہ جان لیا جاتا ہے اور پھر وہ اس کو ماننے یا اس کے مطالبات اور احکام میں سے کسی کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دے۔ نادانی کی حالت جس میں آدمی دین کو جانتا ہی نہ ہو اور اس وجہ سے اس کے خلاف زندگی بسر کر رہا ہو، کفر کی تعریف میں نہیں آتی بلکہ اس کو جاہلیت کہتے ہیں۔

پھر کفر کے متعلق یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو سے کفر اس منکرانہ اور باغیانہ حالت کو کہتے ہیں جو اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے خروج از ایمان ہو۔ دوسرے پہلو سے کفر اس غیر مسلمانہ حالت کو کہتے ہیں جس کے رونما ہونے پر ایک آدمی دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا اور مسلمانوں کی سوسائٹی سے اس کا تعلق کاٹ ڈالا جائے گا۔

پہلی قسم کے کفر کو معصیت کے ساتھ خلط ملط کرنا زیادتی اور خلاف قرآن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معصیت ایمان کی ضد ہے، لیکن مجرد معصیت، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، لازماً ایمان کے مستقل طور پر سلب ہو جانے کی موجب نہیں ہوتی۔ کافر کی طرح مومن سے بھی بڑے سے بڑا گناہ سرزد ہو سکتا ہے، البتہ جو چیز مومن کے گناہ اور کافر کے گناہ میں فرق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مومن جب گناہ کرتا ہے تو عین حالت گناہ میں تو ایمان اس سے نکلا ہوا ہوتا ہے، لیکن جب وہ شہوات نفس کے اس غلبے اور نادانی کے اس پردے سے، جو عارضی طور پر اس کے قلب پر پڑ گیا تھا، باہر نکل آتا ہے تو اس کو شرمساری لاحق ہوتی ہے، خدا سے نادم ہوتا ہے، آخرت کی سزا کا خوف کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ پھر اس سے ایسی حرکت کا ارتکاب نہ ہو۔ اس قسم کی معصیت خواہ کتنی ہی بڑی ہو آدمی کو کافر نہیں بناتی، صرف گناہ گار بناتی ہے، اور توبہ اس کو پھر ایمان کی طرف واپس لے آتی ہے۔ برعکس اس کے کافر کے گناہ کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ اسی گناہ گارانہ طرز عمل اور طرز زندگی کو اپنے لیے مناسب اور لذیذ اور درست سمجھتا ہے، اس کو خدا کی اور اس کے حکم کی کچھ پروا نہیں ہوتی کہ اس نے اس فعل کو گناہ اور حرام قرار دیا ہے، وہ پورے اصرار اور استکبار کے ساتھ اسی فعل کا ارتکاب کیے جاتا ہے، ندامت اس کے پاس نہیں پھٹکتی۔ یہ دوسری قسم کی گناہ گاری سلب ایمان کی موجب ہے اور یہ بجائے خود کبیرہ ہے خواہ اس جذبہ کے ساتھ کوئی ایسا کام کیا جائے جس کو عرف عام میں صغیرہ

سمجھا جاتا ہو۔ ان دونوں قسم کے گناہوں کو ایک ہی حیثیت دینا اور ان پر یکساں کفر کا حکم لگا دینا بالکل غلط ہے اور اس قسم کی افراط و تفریط خود کبیرہ کی تعریف میں آتی ہے۔ پہلی صدی سے آج تک بجز خارجیوں کے یا معتزلہ کے ایک گروہ کے اور کسی نے یہ رائے قائم نہیں کی ہے۔

اب دوسری قسم کے کفر کو لیجیے جو کسی انسان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دینے اور مسلمانوں کی برادری سے اس کا رشتہ کاٹ دینے کے لیے کافی ہو۔ اس چیز کے متعلق جان لینا چاہیے کہ شریعت نے ایسی تکفیر کو ہر کس و ناکس کی رائے کا کھلونا نہیں بنایا ہے۔ جس طرح کسی انسان کے جسمانی قتل کے لیے یہ شرط ہے کہ نظام اسلامی موجود ہو، با اختیار قاضی تمام شہادتوں اور پوری صورت حال پر اچھی طرح غور کر کے پوری تحقیق کے بعد یہ رائے قائم کرے کہ یہ شخص واجب القتل ہے، تب اس کو قتل کیا جا سکتا ہے، اسی طرح ایک شخص کے روحانی قتل یعنی تکفیر کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ اس کے اوپر جو الزام کفر لگایا گیا ہو اس کی ایک قاضی شرع پوری تحقیق کرے، اس کا اپنا بیان لے، اس کے اقوال و افعال کو جانچ کر دیکھے، شہادتوں پر غور کرے، اور اس کے بعد فیصلہ کرے کہ یہ شخص جماعت مسلمین سے کاٹ کر پھینک دینے کے قابل ہے۔ جہاں ایسا نظام موجود نہ ہو، نہ قضائے شرعی ہو اور نہ وہ شرائط جو تکفیر کے لیے ناگزیر ہیں پوری ہو سکتی ہوں، وہاں تکفیر کا فیصلہ کر دینا اور کسی شخص یا گروہ کو مسلم سوسائٹی سے خارج قرار دینا اگر صحت کا احتمال رکھتا ہے تو غلطی کا احتمال بھی رکھتا ہے، اور یہ افراد کے اور بے اختیار جماعتوں کے شرعی اختیارات سے باہر ہے، اور اس کا فساد اُس فساد سے کچھ کم نہیں ہے جو غیر مومن لوگوں کے مسلم سوسائٹی کے ساتھ جڑے رہنے سے رونما ہوتا ہے۔

جو گروہ یا شخص واقعی دینی اصلاح چاہتا ہو اس کو چاہیے کہ پہلے جاہلوں، گناہگاروں، اصلی کافروں اور مسلمانوں کی سوسائٹی سے کاٹ پھینکنے کے قابل کافروں کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لے اور جوش و خروش کے ساتھ نہیں بلکہ انصاف کے ساتھ ان کے معاملہ میں رائے قائم کرے کہ کس کی فی الواقع کیا پوزیشن ہے۔ پھر جاہلوں تک دین کا علم پہنچانے کی کوشش کرے اور جب وہ اپنے آپ کو خود مسلمان سمجھتے ہوں تو خواہ مخواہ انھیں یہ یقین دلانے کی کوشش نہ کرے کہ تم مسلمان نہیں ہو۔ اس کے بجائے اس کو ان سے یوں کہنا چاہیے کہ جب تم مسلمان ہو، اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو، مسلمان رہنا چاہتے ہو تو جانو کہ اسلام کیا ہے اور جان کر اس کی پیروی کرو۔ جن لوگوں کو گناہگاری کی حالت میں پائے ان کو خدا کا خوف دلائے اور ان کے اندر ایمان کی جو چنگاری دبی ہوئی ہے اس کو بھڑکانے کی کوشش کرے۔ جن لوگوں کے اندر وہ کفر محسوس کرے ان کو کافر کہنے اور ان کی تکفیر کا اعلان کرنے پر اصرار نہ کرے بلکہ اپنی جگہ یہ سمجھ کر کہ یہ لوگ حالت کفر میں مبتلا ہیں ان کو ایمان کی دعوت دے اور حکمت و موعظت حسنہ سے ان کے دلوں میں ایمان اتارنے کی سعی کرے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی طبیب کسی شخص کے اندر دق کی بیماری محسوس کرے تو اس کا اپنی جگہ یہ سمجھ لینا اور جان لینا ضروری ہے کہ یہ دق میں مبتلا ہے کیونکہ اس کے بغیر تو اس کا علاج ہی نہیں کیا جا سکتا، لیکن ایک طبیب کے لیے اس سے بڑی اور کوئی حماقت نہیں ہو سکتی کہ وہ جس کسی میں دق محسوس کرے اس کے منہ پر بھی پھٹ سے کہہ دے کہ تو دق میں مبتلا ہے۔ یہ اس کے علاج کا نسخہ تو نہیں ہے بلکہ مار دینے کا نسخہ ہے۔

رہے وہ لوگ جو صریح طور پر اس قابل نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں کی سوسائٹی سے ان کو کاٹ پھینکا جائے، ان کے معاملہ میں صحیح طرز عمل یہ ہے کہ جب قضائے شرعی موجود نہیں ہے اور ایسا نظام نافذ نہیں ہے کہ جو شخص اسلامی نظام جماعت سے نکال دینے کے قابل ہے اس کو واقعی نکال دیا جائے تو تکفیر اور خروج از ایمان کے اعلانات کرنے سے پرہیز کیا جائے اور صرف اس بات پر اکتفا

کی جماعت کو اہلِ ایمان خود ہی اپنے لوگوں سے ولایت اور محبت کے تعلقات اور دوستی و ہم نشینی ترک کر دیں۔ مگر تبلیغ کے لیے ملنے کا دروازہ کسی حال میں بند نہ کرنا چاہیے۔

شادی بیاہ کے متعلق آپکے طرزِ عمل کی بنیاد بھی غلط فہمی ہے جو تکفیر کے باب میں آپ لوگوں کو لاحق ہوئی ہے اور اس کے دور ہو جانے سے یہ سوال خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں مزید توضیح کے لیے اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ مسلم سوسائٹی اس وقت پائی جاتی ہے اس کو مجموعہ واحدہ قرار دے کر اس پوری سوسائٹی کو ایک ہی لکڑی ہانک دینا بڑی زیادتی ہے اور ایک غیر شرعی طرزِ عمل ہے۔ اس سوسائٹی میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو سچے مومن، دیندار اور صالح ہیں، وہ بھی جو جاہلیت میں مبتلا ہیں، وہ بھی جن کے اندر کفر پایا جاتا ہے، اور وہ بھی جو اس قابل ہیں کہ انھیں مسلم سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے مگر اس وقت محض نظامِ اسلامی نہ ہونے کی وجہ سے ان کو کاٹا نہیں جا سکتا۔ ان سب کو ایک گروہ قرار دے کر ان سے اہلِ کتاب کا سا معاملہ کرنا آخر کس شریعت کی رو سے صحیح ہے؟ ان میں جو لوگ مومن اور دیندار ہیں ان سے شادی بیاہ کے تعلقات محض اس وجہ سے منقطع کرنا کہ وہ آپ کی جماعت میں نہیں آئے ہیں، بیجا تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟ اس قسم کی تفریق کرنے کا شریعت نے آپ کو حق نہیں دیا ہے۔ رہے جاہلیت میں پڑے ہوئے لوگ اور وہ لوگ جو فسق و فجور اور کافرانہ خصائل میں مبتلا ہیں، تو ان سے فی الواقع شادی بیاہ کے تعلقات قائم نہیں کرنے چاہئیں، نہ اس بنا پر کہ وہ سب کے سب کافر ہیں بلکہ اس بنا پر کہ شریعت میں ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم شادی بیاہ کے معاملات میں سب سے پہلے آدمی کے دین اور تقویٰ کو دیکھیں۔

غالباً جس چیز نے آپ لوگوں کو اپنی جماعت سے باہر کے تمام مسلمانوں سے اہلِ کتاب کا سا معاملہ کرنے پر آمادہ کیا ہے وہ التزامِ جماعت کے متعلق احادیث کے وہ احکام ہیں جن کی رو سے جماعتی زندگی ہی اسلامی زندگی ہے اور جماعت کے بغیر جو زندگی ہے وہ جاہلیت کی زندگی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ حضرات اچھے خاصے صالح مسلمانوں کو بھی جو آپ کی جماعت سے باہر ہیں من شذ شذ فی النار کا مصداق ٹھیرا کر انھیں بیٹیاں دینا جائز نہیں سمجھتے۔ لیکن اگر یہ آپ کا خیال ہے تو قطعاً ایک غلط خیال ہے۔ حدیث میں جس جماعت کو یہ حیثیت دی گئی ہے کہ اس سے علیحدگی اسلام سے علیحدگی کی ہم معنی ہے، وہ "الجماعۃ" ہے نہ کہ کوئی جماعت جسے چند مسلمان مل کر بنا لیں۔ اور "الجماعۃ" کا اطلاق صرف اس جماعت پر ہو سکتا ہے جو

(۱) خالص اقامتِ دین کے لیے بنی ہو یعنی جس کے وجود کا مقصد ہی یہ ہو کہ خدا کے دین کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے عملاً قائم کرے۔

(۲) جس میں اہلِ ایمان کا سوادِ اعظم شامل ہو۔

(۳) جس کے ہاتھوں دین کے وہ تمام کام انجام پا رہے ہوں جن کی خاطر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ دنیا میں ایک امتِ مسلمہ قائم ہو۔

ایسی جماعت اگر موجود ہو تو اس سے انقطاع یقیناً دین سے انقطاع ہے اور اس شخص کا ایمان و اسلام ہرگز معتبر نہیں ہے جو اس سے علیحدہ ہو یا علیحدہ رہے۔ لیکن اس نظامِ جماعت کے درہم برہم ہو جانے اور امت کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد جو جماعتیں اس غرض سے بنائی جائیں کہ "الجماعت" کے فقدان کی تلافی ہو، ان میں سے کسی کو بھی الجماعت کے شرعی حقوق و اختیارات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ عملاً الجماعت کے مرتبے پر نہ پہنچ جائے۔ آپ خواہ کتنے ہی صالح اور نیک نیت ہوں، اور آپ کا مقصد خواہ ٹھیک ٹھیک وہی ہو جو انبیا علیہم السلام کی بعثت کا مقصد تھا، اور آپکے اصولِ اجتماع بھی وہی ہوں

جو اسلامی نظامِ جماعت کے اصول ہیں، بہرحال شریعت آپ کو یہ حق ہرگز نہیں دیتی کہ آج آپ چند آدمی مل کر ایک جماعت بنا لیں اور کل یہ اعلان کر دیں کہ دنیا بھر کے وہ سارے مسلمان غیر مسلم ہیں جو آپ کی اس جماعت میں شامل نہیں ہیں اور ہر اس مسلمان کی موت جاہلیت کی موت ہے جس کی گردن میں آپ کے امیر کی بیعت کا حلقہ نہیں ہے۔ اس طرح کا رویہ آپ اختیار کریں گے تو اپنے شرعی حقوق سے تجاوز کریں گے اور اصلاح کے بجائے امت کے اندر مزید خرابیوں کے موجب بنیں گے۔ آپ خود ہی ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ آخر اس بیچارے صادق الایمان، وصالح العمل مسلمان کے کافر ہونے کی کیا وجہ ہے جو استکبار و نفسانیت کی بنا پر نہیں بلکہ ناواقفیت یا عدم اطمینان کی وجہ سے آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہوتا؟ اور اس بات کی کونسی معقول وجہ ہے کہ جماعت بنانے کا حق صرف آپ کو حاصل ہو اور دوسرے مسلمانوں کو نہ ہو؟ دورِ انتشار میں تو اصلاح کی کوشش کرنے والا گروہ لازماً ایک ہی نہیں ہوتا، بلکہ بیک وقت ایسے بہت سے گروہ موجود ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں جو صحیح مقصد کے لیے صحیح طریقہ پر کام کر رہے ہوں۔ اور بکثرت افراد ایسے بھی ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں جو ایک مدت تک یہی فیصلہ نہ کر سکیں کہ ان میں سے کسی کے ساتھ شامل ہوں یا نہ ہوں اور شامل ہوں تو کس کے ساتھ ہوں۔ اس حالت میں کسی گروہ کا اپنے لیے وہ حقوق ثابت کرنا جو شریعت میں صرف الجماعت کو دیے گئے ہیں، جھوٹ بھی ہے اور فساد انگیز بھی۔ ایسے دعوے کرنے کے بجائے ہر گروہ کو اپنی اپنی جگہ کام کرنا چاہیے اور اپنے دل میں یہ مخلصانہ خواہش رکھنی چاہیے کہ کسی طرح پھر وہی الجماعت وجود میں آجائے جو عہدِ خلافتِ راشدہ میں موجود تھی، اور ہمیشہ اس بات سے چوکنا رہنا چاہیے کہ کہیں اس کی اپنی گروہ بندی اس الجماعت کی پیدائش میں مددگار ہونے کے بجائے الٹی مانع و مزاحم نہ ہو جائے۔

خدا کے ناقص الاعضا بندوں کی حیثیت

سوال:۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی نفس پر ظلم بے جا نہیں کرتا۔ اس عقیدہ کی بنیاد پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو حق تعالیٰ پیدائشی طور پر کیوں اندھا، لنگڑا، لولا یا احمق بنا دیتا ہے؟ اگر اسے نطفہ کی خرابی پر منسوب قرار دیا جائے تو بھی یہ اعتراض باقی رہتا ہے کہ ماں باپ کے اندر اگر کوئی نقص تھا تو اس کی سزا بچہ کو کیوں ملے؟ آخر کیا ناکارہ اور عیب دار ہستی پیدا کرنا خدا کے احسن الخالقین ہونے پر ایک دھبہ نہیں ہے؟

جواب:۔ جو سوال آپ نے ہم سے پوچھا ہے، بعینہٖ یہی سوال حضرت مسیح علیہ السلام سے پوچھا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اندھوں کو کس لیے پیدا کیا؟ حضرت نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: "اس لیے تاکہ آنکھ والوں کو سجھائی دے"۔ حضرت کے اس ارشاد سے چند باتیں معلوم ہوئیں:۔

پہلی یہ کہ مادرزاد اندھے، لنگڑے اور بہرے عبرت اور تعلیمِ خلق کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تاکہ جن کو اللہ تعالیٰ نے آنکھ کان اور صحیح سالم اعضاء و جوارح کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ مغرور نہ ہوں اور ان قوتوں کو پا کر زمین میں فساد نہ پیدا کریں، بلکہ ہر دم ان قوتوں کے بخشنے والے کے شکر گزار رہیں اور یاد رکھیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو بھی ان اعضاء سے محروم کر سکتا تھا اور پھر وہ کسی طرح بھی ان نعمتوں کو حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تعلیمِ شکر تمام تعلیموں میں سب سے اعلیٰ اور تمام نیکیوں کی بنیاد ہے۔ اس وجہ سے

...نے ہماری اصلاح کے لیے اس کا انتظام خود اس دنیا کے نظام کے اندر کر دیا ہے (یعنی یہ صورتیں اگرچہ دنیا کے طبعی نظام قانونِ علل کے تحت واقع ہوتی ہیں مگر ان سے ایک بڑا اخلاقی فائدہ از خود حاصل ہوتا ہے) اور اس اہم کام کو بالکلیہ ہمارے دوسروں اور غیر ہستیوں پر نہیں چھوڑا ہے۔

دوسری یہ کہ یہ لوگ کسی جرم کی پاداش میں اندھے، بہرے نہیں بنائے گئے۔ بلکہ جس طرح امیر و غریب، کمزور و قوی ہر طرح کے لوگ پیدا کیے گئے ہیں، اسی طرح یہ لوگ خلق کی رہنمائی کے لیے خدا کی طرف سے سرکاری ڈیوٹی پر مامور ہیں اور قیامت کے دن ان کے اس نقص اور محرومی کی تلافی کی جائے گی اور ان میں سے جو شخص جس درجہ میں اللہ کی نعمتوں سے محروم ہے، اسی قدر وہ رعایت حاصل کرے گا، اور اس سے جو پرسش ہوگی، اس الاؤنس کے بعد ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان لوگوں کا جو درجہ ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک حدیث قدسی میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے بھیس میں خلق کی آزمائش کے لیے اترتا ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ قیامت کے روز لوگوں سے فرمائے گا کہ میں تمہارے دروازہ پر بھوکا آیا تو تم نے مجھے نہیں کھلایا، وغیرہ وغیرہ الی آخر الحدیث۔ اور جب لوگ جواب دیں گے کہ اے پروردگار تو کیسے بھوکا اور بیمار ہو سکتا ہے تو پروردگار فرمائے گا کہ تمہارے دروازے پر جو فلاں سائل آیا تھا وہ میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر صالح سوسائٹی میں ان لوگوں کے لیے سب سے زیادہ احترام ہے، بلکہ سوسائٹی کا نظم ہوتا ہی دراصل ایسے لوگوں کی خدمت کے لیے ہے۔ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی حکومت اس کی بہترین مثال ہے جس میں سب سے زیادہ حقدار وہ سمجھا جاتا تھا جو سب سے زیادہ محتاج ہو۔ اس عہد میں جو لوگ اس رمز الٰہی کو سمجھتے تھے ان کا حال یہ تھا کہ جب کسی اندھے بہرے کو دیکھتے، اپنی اچھی حالت پر خدا کے شکر میں سجدہ میں گر جاتے اور جب اس طرح کے لوگوں کی مدد کرتے تو جھک جھک کے مدد کرتے اور اپنے دینے پر فخر کرنے کے بجائے ان کے قبول کرنے پر ان کے ممنون ہوتے، کیونکہ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ معذورین خدا کی طرف سے خلق کی تعلیم کی ڈیوٹی پر مامور ہیں اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جن کی آستینوں میں خدا کا ہاتھ چھپا ہوا ہے۔

قدرت الٰہی کے ان مظاہر کی وجہ سے جو لوگ خدا کے احسن الخالقین ہونے پر معترض ہوتے ہیں، ان کی نگاہ میں دو طرح کے نقص ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دنیا پر بحیثیت مجموعی نگاہ نہیں ڈالتے۔ ان کی نظر صرف اجزا پر رہتی ہے اور انھیں ان کے فریم کے اندر رکھ کر انھوں نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ کسی حسین رخسار کے تل کو اگر اس کی جگہ سے الگ کر کے دیکھیے تو وہ ایک سیاہ داغ نظر آئے گا، حالانکہ وہی چیز اپنی جگہ پر ایک صاحبِ ذوق کے لیے غارت گر ہوش و ایمان ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ان اندھوں اور لنگڑوں کو اس دنیا کے نظام مجموعی سے الگ کر کے دیکھیے تو یہ دنیا پر داغ نظر آتے ہیں، لیکن اگر اس کے مجموعہ میں ان کی جگہ پر رکھ کے دیکھیے اور اس مقصد پر بھی نگاہ ڈالیے جو اس مجموعہ سے پورا ہو رہا ہے تو یہ آپ کو انگشتری پر نگینہ سے بھی زیادہ خوبصورت دکھائی دیں گے۔ اس دنیا میں کوے اور چیلوں کی چیخ بھی ہے اور بلبل کا نغمہ بھی اور ان دونوں کے اتار چڑھاؤ اور زیر و بم کے اندر اس ارغنونِ ہستی کے نغمہ کی اصل دلکشی چھپی ہوئی ہے۔

دوسرا نقص یہ ہے کہ ان لوگوں کی نظر کسی چیز کے صرف مادی پہلو تک محدود رہتی ہے۔ اس کی گہرائیوں کے اندر اتر کر اس کی اخلاقی اور روحانی قدروں کا اندازہ نہیں کرتی۔ ایک پتھر ذرا کھردرا نظر آیا اور ان کی نظروں سے گر گیا، حالانکہ صاحب نظر اس کھردرے پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتا ہے۔ امید ہے کہ ان اشارات سے آپ کی تشفی ہو جائے گی۔

آپ نے یہ جو اعتراض کیا ہے کہ نطفہ کے ذریعہ سے والدین کے جسمانی و ذہنی عیوب و نقائص کا انتقال اولاد میں ہوتا ناانصافی ہے، دراصل اس کی اساس بھی کائنات کے مجموعی نظم و مفاد کو نظرانداز کرکے غور کرنے پر ہے۔ اچھا اب فرض کیجیے کہ آپ کا مجوزہ انصاف دنیا میں نافذ کردیا جائے اور بیج کے اثرات سے پودے کو اور نطفہ کے اثرات سے حیوانی بچوں کو آزاد کردیا جائے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ گندم سے جو اور جو سے گندم پیدا ہونے لگے، گدھے سے خرگوش اور اونٹ سے مینڈک اور مچھلی سے آدمی برآمد ہونے شروع ہوجائیں۔ باپ کی ٹانگیں دو تھیں، بچے کی چھ ہوگئیں، ماں کی ناک چہرے پر تھی، بچے کی پیٹھ پر جالگی۔ دادا کے تمام جسم پر بال تھے اور پوتے صاحب ایک روئیں سے بھی محروم ہیں، کسی کا قد بارہ فٹ ہوا اور کسی کا چھ انچ۔ کوئی گوشت خور درندوں کی فطرت پر پیدا ہوا اور کوئی گھاس کھانے والا چوپایہ بن کر نکلے! ــــ قانونِ توارث کو اگر اس نظام کائنات میں معطل کردیا جائے تو پھر تو کوئی سے دو جانداروں میں اتنی مشابہت نہ رہ سکے گی کہ انھیں ایک نوع یا جنس میں شمار کیا جاسکے۔ پس اللہ تعالیٰ نے جو قانون نافذ فرمایا ہے بحیثیت مجموعی وہی کائنات اور انسانی دنیا کے لیے مفید ہے اور محض چند جزئی ناخوشگواریوں کی وجہ سے اسے غیرحکیمانہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔

ختم قلوب کا مفہوم

سوال: ایک ہندو دوست اسلام کے دروازے پر کھڑا یہ اعتراض کرتا ہے کہ آیت خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کے ماتحت کوئی شخص راہ ضلالت پر چلتا ہے تو اس کا اپنا کوئی قصور نہیں، بلکہ (نعوذ باللہ) قصور اللہ کا ہے۔ اس صورت میں جزا و سزا بے معنی ہے۔

جواب:- قرآن حکیم کے بیان کردہ اصول و سنن پر رائے زنی کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ گہری بصیرت کے ساتھ ان پر تدبر کیا جائے اور قرآن کی ساری تعلیمات کو مجموعی طور پر سامنے رکھ کر آیات کا مفہوم متعین کیا جائے۔ آیت زیربحث پر جو اشکال وارد کیا گیا ہے وہ انہی شرائط اولیہ کا لحاظ نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ ورنہ ایک صاحب فہم و بصیرت کے لیے اس میں کوئی اشکال نہیں۔

کسی فعل کی نسبت کسی کی طرف مختلف اعتبارات سے ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اس سے مقصود نفس اس فعل کی نسبت نہیں بلکہ اس قانون کی نسبت ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے لیے بنادیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ خدا نے بلحاظ فطرت تمام انسانوں کو یکساں نیکی اور بدی الہام فرمائی ہیں۔ بعد میں جو لوگ اپنے اختیار سے نیکی کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کو نیکی کی توفیق عطا فرماتا ہے اور جو لوگ بدی اور سرکشی کی راہیں اختیار کرتے ہیں ان پر بدی کی راہیں فراخ کی جاتی ہیں۔ پھر اگر وہ بدی میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ نیکی کی طرف لوٹنے کا امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا تو ان سے نیکی کی وہ صلاحیت بھی سلب ہوجاتی ہے جو ان کو ابتداءً فطرت میں عطا ہوئی تھی۔ اسی چیز کو قرآن نے "ختم قلوب" سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ مذکورہ قانون الٰہی کے مطابق واقع ہوتا ہے اور یہ قانون عین حکمت و عدل کے مطابق ہے۔ اور اسی وجہ سے خدا کو حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی گمراہیوں پر سزا دے اور نیکیوں پر جزا۔ قرآن میں جہاں خدا کی مطلق مشیت کا بیان ہوتا ہے یا مطلق اضلال کا ذکر ہوتا ہے وہاں اس کی قدرت کاملہ اور اس کے بلاشرکت غیرے تصرف کا بیان مقصود ہوتا ہے، اس کی حکمت اور اس کے مذکورہ قانون عدل کی نفی مقصود نہیں ہوتی۔

ایک آیت قرآنی سے غلط استدلال

سوال: - سورۂ ہود کی حسب ذیل آیات مہدویوں کے نزدیک بڑی اہم ہیں جن سے حضرت سید محمد جونپوری کی مہدویت کا ثبوت نکالا جاتا ہے۔

اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ وَيَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ وَمِنۡ قَبۡلِهٖ كِتٰبُ مُوۡسٰٓى اِمَامًا وَّرَحۡمَةً ؕ اُولٰٓـئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُهٗ‌ ۚ فَلَا تَكُ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡهُ‌ ۚ اِنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ۔

اس آیت میں "بَيِّنَةٍ" "يَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ" اور "كِتٰبُ مُوۡسٰى" کو ایسی خصوصیات کا حامل سمجھا جاتا ہے جن کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ "اَفَمَنۡ" کے "مَنۡ" سے کوئی خاص ہستی ہی مراد لی جاسکتی ہے۔ نہ کہ کوئی غیر معین شخص۔ آگے چل کر "فَلَا تَكُ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡهُ" میں چونکہ خطاب خود رسول اللہ سے ہے کہ آپ اس بارے میں شک میں نہ پڑیں تو اس سے یہ حجت قائم کی جاتی ہے کہ "فَمَنۡ" کے "مَنۡ" سے ذات رسول مراد نہیں لی جاسکتی بلکہ یہاں اشارہ ذات مہدی کی طرف ہے۔

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیت کی تشریح فرمایئے۔

جواب: - آپ نے یہ نہیں ظاہر فرمایا کہ مہدوی اس آیت سے کس طرح استدلال کرتے ہیں، اس وجہ سے جواب میں ان کے دلائل کو پیش نظر رکھنا مشکل ہے۔ البتہ ہم آیت کی صحیح تاویل بالاختصار بیان کر دیتے ہیں، اس سے غلط توہمات کی بنیاد خود بخود ڈھے جائے گی۔

اس آیت سے اوپر کی آیات میں، کفار قرآن کی جو مخالفت کر رہے تھے اس کا بیان اور ساتھ ہی اس کا جواب ہے، اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ کون لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور کون لوگ نہیں ایمان لائیں گے۔ اس کی تفصیل یوں بیان فرمائی۔

اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ الآية (کیا وہ لوگ جو اپنے رب کی جانب سے ایک بصیرت رکھتے ہوں اور اس کے بعد ان کے سامنے ایک شاہد آئے خدا کی جانب سے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب امام اور رحمت بن کر آچکی ہے۔ وہی لوگ اس پر ایمان لائیں گے اور جو اس کا انکار کریں گے جماعتوں میں سے تو جہنم ان کی وعدہ گاہ ہے۔ پس تم اس کی طرف سے شک میں نہ پڑو وہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے لیکن اکثر لوگ ایمان نہ لائیں گے (۱۷- ہود)

اس میں ایمان لانے والی جماعت اور اس کے وجوہ ایمان کی وضاحت کر دی گئی ہے لیکن ایمان نہ لانے والوں کے صرف انجام کو بیان کیا گیا ہے، ان کے ذکر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مقابل کا ذکر دوسرے مقابل پر خود دلیل تھا اور استفہامیہ جملوں میں یہی اسلوب عام ہے اور اس کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ اگر اس محذوف کو ظاہر کر دیا جائے تو پوری عبارت یوں ہوگی "کیا وہ لوگ جو اپنے رب کی جانب سے بصیرت رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو بصیرت سے محروم ہیں یکساں ہوں گے؟ — دونوں اس قرآن کے باب میں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس پر ایمان صرف پہلا گروہ لائے گا۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر اولاً تو خدا کی بخشی ہوئی بصیرت موجود ہے جس سے وہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے، اس کی

شکر گذاری واجب ہے، وہ انسانوں کو شتر بے مہار نہیں چھوڑے گا بلکہ اس نے جزا کا ایک دن ضرور مقرر کیا ہے اور اسی دن نیکوکار اپنی نیکیوں کا اور بدکار اپنی بدیوں کا بدلہ پائیں گے۔ ثانیاً ان کے پاس خدا کی طرف سے ایک شاہد آکر انہی حقیقتوں کی شہادت دیتا ہے اور وہ اپنی فطری بصیرت سے جن باتوں کو حق خیال کرتے تھے انہی کو وہ مزید مبرہن، مدلل اور آشکارا کرتا ہے۔ اس ہم آہنگی کی وجہ سے وہ اس سے کوئی بیگانگی نہیں محسوس کرتے بلکہ اس کو اپنا دردآشنا اور اپنے ہی دل کی بات کہنے والا سمجھتے ہیں۔ ثالثاً وہ دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے تورات آچکی ہے جو اسی طرح آسمانی وحی کا صحیفہ ہے، اس میں اس کی پیشینگوئیاں درج ہیں اور اس کی تعلیمات میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ بصیرت اور وحی الٰہی کی اس کے ساتھ مطابقت اور پھر تورات کی ان ساری باتوں کی طرف امام (Guide) کی طرح رہنمائی ان کے لیے کسی بحث وجدال کا موقع نہیں چھوڑتی اور وہ تمہاری باتوں پر سنتے ہی ایمان لاتے ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو اپنی فطرت کو مسخ کر چکے ہیں اور تمہاری باتیں سرے سے سنتے ہی نہیں ہیں اور تورات کو بھی پس پشت ڈالے ہوئے ہیں ان سے ایمان کی توقع نہ رکھو۔ یہ سب لوگ خواہ کفار قریش میں سے ہوں یا یہود میں سے یا نصاریٰ میں سے، سب کا ٹھکانا جہنم ہے اور ان سب کی متحدہ مخالفت کی وجہ سے تمہارے دل میں یہ گمان نہ گذرے کہ تمہاری دعوت ہی میں کوئی غلطی ہے۔ تمہارے رب کی طرف سے اترا ہوا حق تو یہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو لیکن ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے۔

یہ آیت کا سیدھا سادہ مطلب عرض ہوا ہے۔ اب اس کے بعد اسی سورہ سے ہم اس آیت کے شواہد نقل کرتے ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ آیت کا جو مطلب ہم نے بیان کیا ہے قرآن کے دوسرے مواقع سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ

کہا اے میری قوم کے لوگو! بتاؤ تو سہی اگر میں بینہ پر ہوں اپنے رب کی جانب سے اور اس نے مجھے بخشی اپنے پاس سے رحمت اور وہ تم سے پوشیدہ ہو جائے تو کیا ہم اس کو تم پر زبردستی چپکا دیں درانحالیکہ تم اس سے نفرت کر رہے ہو۔

اس آیت میں "بینہ" سے مراد وہ فطری بصیرت ہے جو نبی میں بعثت سے پہلے موجود ہوتی ہے اور رحمت سے مراد وحی ہے جو اس کی فطرت کے بالکل مطابق ہوتی ہے اور جس سے انکار کرنا اپنی فطرت سے لڑنے کے ہم معنی ہے۔ نبی کی قوم میں سے جن لوگوں کی فطرت مسخ نہیں ہوتی ہے وہ بھی اس وحی کو اپنے دل کی صدا ہی سمجھ کر قبول کرتے ہیں، البتہ جو لوگ اپنی فطرت کو مسخ کر لیتے ہیں ان کے اندر اس روشنی کے نفوذ کے لیے کوئی راہ باقی نہیں رہتی، اور کسی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ وحی کی تعلیمات کو ان کے اوپر چپکا سکے۔

حضرت صالح فرماتے ہیں:۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ

کہا اے قوم بتاؤ تو سہی اگر میں ایک بینہ پر ہوں اپنے رب کی جانب سے اور وہ اپنے پاس سے مجھے رحمت بخشے تو اس کے بعد اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو کون اس کے مقابلہ میں میری مدد کرے گا۔

یعنی فطرت اور وحی دونوں کی رہنمائی کے بعد بھی اگر میں خدا کی نافرمانی کروں تو خدا کے غضب سے مجھے کون بچا سکے گا۔

حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا	کہا اے قوم بتاؤ تو سہی اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک بینہ پر ہوں اور وہ مجھے بخشے اپنی طرف سے اچھی روزی۔

اس آیت میں بھی بینہ سے مراد فطری بصیرت ہے البتہ وحی کے لیے رزق حسن کا لفظ یہاں آیا ہے اور وحی کی یہ تعبیر قرآن میں بھی موجود ہے اور اگلے صحیفوں میں بھی کلام الٰہی کو رزق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔

تلا یتلو کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ تلاوت کرنا اور کسی شے کا کسی چیز کے پیچھے آنا۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ اگر تلاوت کے معنی لیے جائیں تو ضمیر مفعول کا مرجع مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ ہوگا جس کا ذکر آیت ۱۲ میں بھی ہوا ہے۔ اور بعد میں آیات ۱۳، ۱۴، میں بھی ہے۔ اور پیچھے آنے کے معنی لیے جائیں تو ضمیر کا مرجع بینہ کا لفظ ہوگا۔ اور باعتبار مفہوم ضمیر مذکر کی لائی گئی ہے جو عربی زبان اور قرآن میں معروف ہے یعنی بینہ سے برہان اور دلیل وغیرہ مراد لے لیں گے۔

شَاهِدٌ سے مراد حضرت جبریل بھی ہو سکتے ہیں اور آنحضرت صلعم بھی اور وحی الٰہی بھی، اور یہ تینوں باعتبار حقیقت ایک ہیں۔ آنحضرت صلعم کے لیے شاہد حضرت جبریل امین ہیں اور دوسروں کے لیے آنحضرت صلعم اور قرآن حکیم۔

مَنْ سے مراد یہاں کوئی خاص شخص نہیں ہے۔ اولاً تو مَنْ سے کسی خاص شخص کو مراد لینا عربیت کے خلاف ہے۔ اصلاً یہ نکرہ کے لیے آتا ہے۔ ثانیاً یہاں اس بات کی تصریح ہو گئی ہے کہ مَنْ سے مراد یہاں جماعت ہے کیونکہ أُولَٰئِكَ کا اشارہ مَنْ کی طرف ہے، اور أُولَٰئِكَ جمع کے لیے ہے نہ کہ واحد کے لیے۔ چنانچہ فعل بھی يُؤْمِنُونَ جمع استعمال ہوا ہے۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ میں ضمیر مجرور کا مرجع مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے (آیت ۱۲) آنحضرت صلعم کو اس وحی الٰہی کے منجانب اللہ ہونے میں شک نہیں تھا، لیکن اس کی مخالفت اس شدت و قوت کے ساتھ اور پوری قوم کی طرف سے ایسی ہم آہنگی کے ساتھ ہو رہی تھی کہ آنحضرت صلعم کا عزم تبلیغ اس متحدہ مخالفت کے مقابل میں ضعیف ہو رہا تھا، اور جیسا کہ فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ سورج کی طرح واضح بات بھی اگر اس کی متحدہ مخالفت کی جائے تو کہنے والے کی نظر میں دھندلی ہونے لگتی ہے، اس وجہ سے اس موقع پر سخت ضرورت تھی کہ آنحضرت صلعم کے عزم و یقین کو پابرجا رکھنے کے لیے آپ کو تسلی دی جائے۔ چنانچہ اس آیت کے اوپر کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کس قدر سخت حالات سے آنحضرت صلعم دوچار تھے اور آپ کے قلب کی پریشانیوں کا کیا حال تھا (فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ كَنزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۚ إِنَّمَا أَنتَ نَذِيرٌ)

اس آیت کی نظیر اس سے پہلے والی سورہ، سورہ یونس میں موجود ہے جس سے اس مفہوم کی مزید تشریح ہو جاتی ہے۔ فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ، لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ

(اگر تم شک میں ہو اس چیز کے متعلق جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تو ان لوگوں سے پوچھو جو تم سے پہلے سے کتاب کی تلاوت کر رہے ہیں (یعنی اہل کتاب) تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آیا ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور نہ ہو ان لوگوں میں سے جنھوں نے اس کی آیات کی تکذیب کی ہے کہ نامرادوں میں سے ہو جاؤ۔ بے شک جن لوگوں پر تیرے رب کا کلمہ حق ہو چکا ہے وہ اس کتاب پر ایمان نہیں لائیں گے)

اس طرح کے مواقع پر شک اور تذبذب وغیرہ کی جو نسبت نبی کی طرف کی جاتی ہے اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مواقع میں نبی بحیثیت اپنی امت کے وکیل کے مخاطب ہوتا ہے اور امت میں بہتیرے ایسے ہو سکتے ہیں کہ دوسروں کی سخت مخالفت کے سبب سے ان کی نظروں میں وہ حق مشتبہ ہو جائے جس پر وہ ایمان لائے ہیں۔ یہ حالت نیک نیت سے نیک نیت انسان پر بھی طاری ہو سکتی ہے۔ ایک نیک نیت آدمی جب دیکھتا ہے کہ جس بات کو وہ مان رہا ہے اس کے سوا سب اس کے خلاف ہیں اور پوری قوت کے ساتھ اس کی تکذیب کر رہے ہیں تو کبھی کبھی اس کا یقین بھی متزلزل ہونے لگتا ہے کہ ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں۔ اس طرح کے مواقع میں نبی پر جو اظہار عتاب ہوتا ہے اگرچہ ظاہر میں اس کا خطاب نبی کی طرف ہوتا ہے لیکن در اصل اس کی خفگی کا رخ ان لوگوں کی طرف ہوتا ہے جو حق کی تکذیب کرتے ہیں۔

ان مختصر اشارات سے امید ہے کہ آیت کا صحیح مفہوم آپ کے سامنے آ جائے گا۔ اگر کوئی بات مزید توضیح کی محتاج ہو تو اس کو کمرر دریافت فرما سکتے ہیں۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصّہ اوّل

اِسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصّہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصولِ اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:۔

حصّۂ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے، اسلامی حکومت کن اُصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے، ایسا اِقدام کرنے والے گروہ کو کن اُصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور اِن اُصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، اُن کا جواب کیا ہے؛ یہ تمام باتیں اِس حصّہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں:۔

قیمت حصہ اول ۰-۴-۱ حصہ دوم ۰-۸-۲ حصہ سوم ۰-۱۲-۱

علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ:- مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام جمالپور۔ پٹھانکوٹ (پنجاب)